پریم

فنکار

دیا کرشن گردش
ایم اے عزیز
عبدالعزیز علائی
حمید نظامی
اذر عسکری
ا ۰ ر ۰ محجوبہ
نرسنگداس نرگس

آٹھ آنے

مکتبہ چاند جموں

ایڈیٹر:۔
گلزار احمد فدا
اقبال تمنائی

زر سالانہ
چھ روپے
فی پرچہ ۸ر

رسالہ پریم جموں

جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۱

پریم رس

دیوان گیان چند پرنٹر پبلشر نے دیوان پریس جموں سے چھپوا کر دفتر پریم سے شائع کیا

اقبال تمنائی

پریم کہانی

قحطِ قرطاس اور دوسری کئی دشواریاں پریم کے اس شمارہ کی بروقت اشاعت میں مزاحم ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے کا پرچہ بیساکھ ۲۰۲۰ میں شائع ہوا تھا۔ جسے اربابِ ادب نے بے حد پسند کیا۔ لیکن میری ہر کوشش گیارہ ماہ کی طویل اور غیر معمولی تعویق کو کم کرنے میں ناکامیاب رہی۔ بہرکیف اب ادارہ اہتمام نے یہ دوسرا قدم اٹھانے سے قبل مجھے یقین دلا دیا ہے۔ کہ مستقبل میں کوئی بھی دشواری پریم کی باقاعدگی میں مخل نہ ہو سکے گی۔ اور اس کی ہر نئی اشاعت۔ ایک نئی شوکت، نئی جاذبیت اور نئی دلاویزی کی آئینہ دار ہوا کریگی۔

شمالی ہندوستان نے پچھلی ایک چوتھائی صدی میں اُردو ادب کو بامِ اوج پر لے جانے میں معجزے کر دکھلائے ہیں۔ اس مدت میں کتنے ہی نئے چاند اور ستارے طلوع ہوئے اور ان کی ضوفشانی سے اب زمین ادب کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا۔ اُردو ادب کو اس مدت میں جن انقلاب افروز کیفیتوں سے گذرنا پڑا ہے۔ اس سے شعر و افسانہ یکساں طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اور ادبی رسائل کے بدلے ہوئے اطوار اور تحریک تغیر جشیدہ قرینہ اس انقلاب کا بہترین شاہد ہے۔ لیکن ہماری ریاست اس ادبی بیداری اور انقلابی خروش سے بیگانہ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں ہفت روزہ جرائد کی بلاشبہ کمی نہیں۔ لیکن انہیں سیاسی مسائل کی ہنگامی خدمت ادب کی طرف مائل ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور سارے ملک میں ایک بھی ایسا ماہنامہ شائع نہیں ہوتا۔ جو صرف ادبی ماحول کا ترجمان ہو اور جس کی وساطت سے ریاستی فنکار بھی اپنے قلم کی سحر طرازیاں اور دماغی کاوشوں کے نتائج کی مہک اربابِ ذوق تک پہنچا سکتے ہوں۔ پریم اس خلا کو پر کرنے کے لئے ہی منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اور آپ بآسانی جائزہ لے سکیں گے کہ اس کی اٹھان۔ ترتیب اور مضامین کی معنوی خوبیاں کس حد تک پریم کے پاکیزہ ترین مقصدِ حیات کی آئینہ دار کہی جا سکتی ہیں۔

پریم نئے اور پرانے ادب کا یکساں طور پر احترام کرے گا۔ اس میں جدید اور قدیم طرز کے فلمپارے یکساں طور پر اشاعت پا سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ فنی اعتبار سے کمزور نہ ہوں۔ اگر ریاستی فنکاروں نے کچھ دلچسپی لی اور اپنے اس واحد ماہنامہ کے معیار کو بلند کرنے میں ہمیں اپنے مخلصانہ تعاون کا مستحق سمجھا تو پریم بہت جلد ہندوستان کے بہترین رسائل کی صفِ اول میں اپنا موزوں مقام حاصل کر سکے گا۔ اور اس کی وساطت سے ریاستی ادیب بھی ادب و تمدن کی تعمیرِ جدید میں وہی حیثیت اور ناموری

حاصل کر سکیں گے۔ جو آج تک استحقاق کے باوجود انہیں نصیب نہیں ہو سکی۔

پریم میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی چند اوراق وقف کئے گئے ہیں جنہیں وہ پڑھ کر بے حد دلچسپ پائیں گے۔ عورتوں کی دنیا کے لئے ہمیں ادب نواز خواتین اور بچوں کے صفحات کے لئے مدرسین یا ایسے ادباء کے نئے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ جو ان کے مذاق۔ نفسیات اور مسائل کو سمجھتے ہوں۔ میری یہ دلی تمنا ہے۔ کہ پریم میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی دلچسپیاں پیدا کی جا سکیں۔ اور اسے ہر حلقہ میں اپنے لئے مناسب جگہ میسر آ سکے۔

پریم نہایت وسیع تعمیری اور تخلیقی مقاصد کو لیا تھ لئے اشاعت پذیر ہوا ہے۔ برطانوی ہند میں اسے سرزمین جموں و کشمیر کے ادبی میلانات کا مظہر سمجھا جائیگا۔ اور اس کے مضامین سے ریاستی قلمکاروں کی صلاحیت پرواز۔ اور علمی مذاق کی سلامتی کا جائزہ لیا جائیگا۔ اس لئے مضامین کے انتخاب میں ہر ممکن حد تک احتیاط روا رکھی جائے گی۔ لیکن ارباب قلم سے بھی یہ التجا بے سبب نہ ہوگی۔ کہ انہیں صرف معیاری مضامین ارسال فرمانے چاہئیں۔ پریم اُن کا اپنا ماہنامہ ہے۔ اور اس کے معیار کی بلندی میری طرح اُن کے لئے بھی باعث فخر ہوگی۔

علامہ اقبال نے سرزمین کشمیر کو ایران صغیر قرار دیتے ہوئے بہ بانگ بلند فرمایا تھا کہ ؎

چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب وُلر کے تمام یک دانہ

"پریم" ان ہی گہر ہائے یکدانہ کو بیرونی دنیا سے متعارف کرانا چاہتا ہے۔ اور آپ بہت جلد یہ محسوس کریں گے کہ پریم پہلا اور واحد ماہنامہ ہے۔ جس نے اقبال مرحوم کے ان الہامی الفاظ کی معنوی صداقت کو عمل کے جامہ سے آراستہ کر کے چشم زمانہ کے سامنے لا بٹھایا ہے۔

زیر نظر شمارہ کی ترتیب میں جن ارباب قلم نے پریم کی قلمی معاونت فرمائی ہے۔ میں تہ دل سے ان کا شکر گذار ہوں صاحبزادہ محمد عمر۔ پروفیسر بی۔ ڈی ایل شرما۔ طالب گورگانی اور پریم ناتھ پردیسی کے مضامین کے بغیر مجھے پریم کی اس اشاعت میں کچھ تشنگی سی محسوس ہو رہی ہے۔ اور میں ان تمام ارباب قلم سے "پریم" کی معاونت کے لئے درخواست کرتا ہوں۔

حضرت حنیف ہاشمی سرزمین جموں کے ایک ہونہار ادیب تھے۔ لیکن اس خوش الحان طائر نے شاخ ادب پر نشیمن کی تعمیر ہی شروع کی تھی۔ کہ اسے برق فنا نے منتخب کر لیا۔ اگر عمر وفا کرتی تو شاید آج حنیف کا شمار ملک کے بہترین ادباء میں ہوتا۔ اپنے پیچھے آپ کتنے ہی غیر مطبوعہ شاہکار چھوڑ گئے ہیں۔ جو گاہے گاہے پریم میں شائع ہوتے رہا کریں گے۔ اور اس کے لئے میں مرحوم کے برادر اکبر حضرت لطیف ہاشمی کے ذوق ادب اور خلوص کا ممنون ہوں۔

منتر فاروقی

"دعا"

درخشاں صورتِ خورشید نام ہو تیرا
جہانِ علم میں اونچا مقام ہو تیرا

دل و دماغ کی ہوں خوبیاں تجھے حاصل
خیال ارفع و موزوں کلام ہو تیرا

تیرے قلم کی سیاہی فروغِ فضل ہو
بلند پایہ ادیبوں میں نام ہو تیرا

تیرے ارادوں کو حق کامیاب فرمائے
مئے نشاط سے لبریز جام ہو تیرا

نگاہ پاک اور صاف ہو تیرا باطن
ہمیشہ نفس خرد کا غلام ہو تیرا

جوان و پیر کی نظروں میں ہو تیری عزت
جہاں بھی جائے وہاں احترام ہو تیرا

قیامِ امن کا حامی ہو تو زمانے میں
جہاں میں صلح و صفا کا پیام ہو تیرا

ہزار راہِ عمل ہو کٹھن تیری لیکن!
تلاشِ منزلِ مقصود کام ہو تیرا

جنابِ حق میں ہے اقبال یہ دعا میری
"پریم" دنیا میں "مقبولِ عام" ہو تیرا!

پریم جموں

دیاکرشن گردش

نیا ادب

بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں گاؤں میں اپنے چند ہم جماعتوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اتنے میں باجے گاجے کے ساتھ ایک برات آئی اور ہمارے پاس سے گذر گئی۔ برات میں چند برہنہ سر عورتیں بھی تھیں۔ میں اس ہیئت کی عورتوں کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ایک بڑی عمر کے لڑکے نے بتایا۔ "یہ ناچنے والیاں ہیں۔ دیکھتے نہیں؟ ننگے سر۔ ٹیڑھی مانگیں نکالے۔ بالوں میں سنہری چٹیاں لگائے۔ چہروں پر شائستہ ملے۔ کس شان سے ہنستی مسکراتی چلی جا رہی ہیں" ان دنوں ٹیڑھی مانگ۔ کلپ۔ پوڈر۔ اور بے حجابی ہی بازاری عورت کے تشخصات تھے۔ مگر اب تو شرافت کا قافلہ بھی اس حد سے کوسوں آگے نکل چکا ہے۔ کل کی فحاشی آج کا فیشن ہے۔ وہی حیا جو کل تک نسوانیت کا زیور۔ اور اس کی پلکوں کا بوجھ تھی نئے زمانہ میں عیب اور جہالت ہے جسے علم نے شریف زادیوں سے جدا کر دیا ہے۔ عورت بدل رہی ہے، مرد بدل رہا ہے۔ سماج بدل رہا ہے۔ اخلاق کے زاویئے اور نگاہ کی سمت میں انقلاب آ چکا ہے۔ دل کا رجحان ضمیر کا ماحول اور ذہنیت کا انداز ایک نئے پس منظر پر نئے رنگوں میں چمک رہے ہیں۔ حقائق سے آنکھیں کیوں موندتے ہو۔ مغرب سے اٹھی ہوئی آندھی نے مشرقی کھپریل اور چھپر اڑا کر نہ جانے کہاں پھینک دیئے ہیں؟ اب تو انقلاب کے معماروں نے ہر طرف نئے ڈھنگ کے شیش محل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ہندوستان ایک خوبصورت پارک میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں ہر قسم کے گل، ہر نئی قسم کے پھیر و چھپار رہے ہیں کلیاں انگریزی۔ چو پھیں ایرانی۔ پنکھے فرانسیسی رنگ جاپانی اور نغمے ہندوستانی۔

یہ کہاں ممکن تھا کہ سماجی زندگی تو شکیلا کی قبا کو پھینک کر شریلے چپل۔ یا پیری پیکفورڈ کا لباس اختیار کر لے اور ادب اس بدلے ہوئے زمانہ میں بھی غالب اور خسرو کے قائم کردہ نکتوں کے طواف میں مصروف رہے۔ ادب سماج کے رجحانات کا عکس اور اس کا سایہ ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ سماج بے حجابی و عریانی پر مائل ہو اور ادب حجاب و نقاب پر۔ میں نے کئی اد بار کو ادب جدید پر ناک منہ چڑھاتے دیکھا ہے۔ انہیں اس چہرے پر دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اثر لکھنوی سے ممتاز مفتی تک ہر ادیب ان داغوں پر تنقید کا صابن آزما رہا ہے۔ صابن جتنا گھستا ہے دھبے اتنے ہی شوخ اور نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ یہ حضرات تو آئینہ دھونے کی مشق فرما رہے ہیں۔ اگر اتنی ہی محنت سماج کے چہرے پر کی جاتی۔ تو شاید ہمیں محنت کے رائگاں جانے کا گلہ نہ ہوتا۔ معین احسن جذبی۔ سید مطلبی۔ جمیل مظہری۔ اختر رائے پوری کنیز فاطمہ کاش ایم۔ اے۔ اور اسی خیال و قماش کے تمام ادیب سماج کی اخلاقی مطلق العنانی کی تصویریں ہیں۔ نیا ادب "حقیقت" کا علمبردار ہے۔ اس لئے جب محترمہ کاش ایم اے نے

ع کسی کی گود میں خود کو بٹھا کے بیٹھی ہوں
ہر اک زہد کو عصیاں کا راز داں کر کے
ہر اک ادا کو حریف شراب کرتی ہوں
گنہ بنا کے میں اکثر ثواب کرتی ہوں

کبھی کو لوٹ کے خود کو لٹا کے پیتی ہوں!

لکھنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ اہتمام مے کشی رات کو کلب میں پیش آمدہ حسین و جمیل حادثہ کی لذتوں کے ایک صبحگاہی چٹخارے سے زیادہ کچھ نہیں
نیا ادب ساڑھیوں۔ جمپروں اور شلواروں کے ابھار تلے جوان ہو رہا ہے۔ سعادت حسن منٹو کو کہکشاں سے لیکر مصر کے مخروطی میناروں تک ہر شے پر شلوار محیط و مسلط دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کیلئے اسی شلوار کی سلوٹوں میں پلاٹ تلاش کرتا ہے۔ اس سے باہر کی دنیا اس کے لئے بے حقیقت ہے۔ یہ منٹو نہیں ہندوستان کی نوجوانی کا رجحان ہے۔ بے چارہ ادیب تو ایک مجبور ہے۔ وہ نئے رجحان کی تصویروں سے بدلے ہوئے سماج کے ایوان تمدن کو سجا رہا ہے۔ آپ منٹو کی شلوار۔ نیاز فتحپوری کی کفن پوش حور اور کشمیر کی میکشی سے سہم جاتے ہیں۔ آپ کو مشرقی اخلاق کا محل گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کیا آپ کو وہ کاش گر لڑکے اور منٹو ساز لڑکیاں دیکھ کر خوف محسوس نہیں ہوتا جن کی کوئی بھی اوارہ ح ادب کیلئے بقا سے کم نہیں اور جن کی علمی اور روحانی زندگی پر حیوانی محسوسات کا غلبہ زہد نواز ادباء کے تخیل کو بھی نئے ادب کی تلاش میں بازار حسن میں چلمن اٹھا کر اندر جھانکنے پر مائل کر دیتا ہے۔

نیا ادب صرف زندگی کی برہنہ حقیقتوں کو اپنا موضوع ٹھہراتا ہے۔ اس کے نزدیک ڈھول کی میٹھی آواز اور اس کے ظاہر سے کہیں زیادہ پول میں کشش ہے۔ وہ چوہیا کی طرح چمڑے کو پھاڑ کر اندر داخل ہونا چاہتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں یہ پول ہی ڈھول کی حقیقت ہے۔ اس کے نزدیک موسیقار کے نغموں سے گدھے کا ڈھینچوں ڈھینچوں اور کوے کی کائیں کائیں ہزار بہتر ہیں۔ وہ ایک کو صنعت اور دوسری کو حقیقت تصور کرتا ہے۔ وہ عورت کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لئے اس کے کپڑے اتار پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے نفسیات

اور کردار کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں۔ اس حقیقت نگاری کی دھن میں اسے باسی روٹی کا ایک ٹکڑا زہرہ و پروین سے حسین و جمیل دکھائی دیتا ہے اور اس کی ہر وہ بلندی اور ہر جھک کو بے اختیار
ہل۔ مزدور۔ پھاوڑا۔ جامن والی۔ بھنگن۔ ہوٹل کی لڑکی نئے ادب کے رنگین ترین موضوع ہیں۔ اشتراکی ادبا کی نگاہ میں یہ "پینٹنگ" کلاسی ہی حقیقی ادب ہے۔ قدما میں رنگ آمیزی بلا شبہ مقبول رہی ہے۔ تصویر جس قدر گہری اور شوخ ہو نگاہ و قلب کیلئے اتنی ہی مسحور کن ثابت ہوتی ہے۔ خوبصورتی کے لئے ہر سینہ میں خلا موجود ہے۔ اور غیر اشتراکی ادب اس خلا کو پر کرتا ہے اشتراکی ادیب بھی تصویر بناتے ہیں۔ لیکن رنگ بھرنے کی بجائے اس پر غلاظت تھوپ دیتے ہیں جس سے فضا متعفن ہو اٹھتی ہے جی متلانے لگتا ہے۔ اور انسان اپنے کو ایک ناسازگار سے ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ چند ہفتے ہوئے کشادہ سڑکیں کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خون میں لتھڑے ہوئے چند نفوس
منتشر چاروں طرف جن کے ہے آہوں کا غبار
پیپ زخموں سے رواں۔ بھنبھناتا ہوا تن پر ملبوس!

"ملبوس" تک پہنچ کر میں نے یہی سمجھا کہ شاعر کوڑھی خانہ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ زخم۔ خون۔ پیپ اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کوڑھی خانے سے باہر اور ہو بھی کہاں سکتی ہے۔ لیکن آگے نظر دوڑانے پر معلوم ہوا کہ حضرت مزدوروں کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔

لڑکھڑاتے ہوئے خاموش چلے جاتے ہیں
یہ بھی انسان ہیں لیکن مزدور

مجھے تو اس میں فن ہی دکھائی دیتا ہے نہ نقاشی۔ نئے ادب میں الحاد ہے۔ معصیت ہے۔ عشق کی بے باکی اور حسن کی بے تکلفی ہے۔ اخلاقی مطلق العنانی۔ غوغہ۔ خلفشار اور بے راہ روی ہے اور یہ تمام تخریب کے ہتھیار ہیں۔ یہ اندھے انقلاب کی کدالیں ہیں۔ جو نیک و بد میں تمیز کئے بغیر ہر ٹیلا اور ہر عمارت کو ہموار کئے جا رہی ہیں۔ اور اس پر بھی کی پشت پر کوئی نصب العین

نہ مقصد۔ یہ بہرحال انسان میں حیوانیت کی بیداری پر دال ہے۔ نظم و ضبط کی زنجیریں رفتہ رفتہ ٹوٹ رہی ہیں۔ روایتیں مر رہی ہیں۔ شعر اور افسانہ یکساں طور پر حسن و شباب کی دنیا میں بے حجابی کی اشاعت کے آلے ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ سبھی کچھ حیوانی دنیا کے تشخصات ہیں۔ ان کا زندگی کے ان اطوار سے ناطہ نہیں جو ہمیں اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ ادب کی بلندی کا مدار زندگی کے تخیل پر ہے اور اس تخیل کی زیست روحانیت میں ہے۔ لیکن نیا ادب روحانیت کا دشمن ہے۔ اس نے مادیت سے وابستگی پیدا کی ہے۔ پیپ۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ شلواروں کی پراگندہ تہوں۔ عورت کی برہنگی یا روٹی کے باسی ٹکڑوں سے آخر ہاتھ بھی کیا آ سکتا ہے۔ اس غلیظ جوہڑ سے کوئی مشاق غوطہ زن بھی گوہر نہیں لا سکتا۔ یہاں متعفن کیچڑ کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اور اس کیچڑ کے دھبے آپ ہر دامن اور ہر چہرے پر دیکھ سکتے ہیں۔ اشتراکی انقلاب شائد غلاظت کے اسی ذخیرے سے ابھر رہا ہے۔ جو ادب کو زندگی اور زندگی کو درندگی کیلئے وقف کرنا چاہتا ہے۔

فنون لطیفہ اس انقلاب کا پہلا شکار ہیں۔ شاعری میں مہملیت اور بے تکے پن کی قیمت بڑھ چکی ہے۔ افسانہ میں کردار نگاری کی جگہ فحاشی اور عریانی نے لے لی ہے۔ آج متمدن سوسائٹی میں ترتیب۔ فن۔ قاعدہ۔ اسلوب اور روایت کی نہیں اس کی فحاشی اور مہملیت کی مانگ ہے۔ ترقی پسند ادیب تو محض پیٹ کے لئے تباہی اور موت کے اس دھارے پر بہہ رہا ہے وہ اخلاقی قیود کے خلاف ہر بغاوت اور ہر غدر کی اس لئے حمایت کرتا ہے کہ نیا ماحول حیوانی جذبات کی بے روک تسکین میں اس کا معاون ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی سماج ہی ذمہ دار ہے۔ اگر ہم عملی اور شخصی زندگی کے موجودہ انتشار کو ختم کرنے پر کمر ہمت باندھ لیں تو جدید ادبیت پالنے پر ہی دم توڑ دے۔ نیا ادب پاکیزہ ماحول میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا! یہ وبائی جرثومہ کی پیداوار ہے۔ پلیگ جسموں کے لئے مہلک ہے۔ اور نیا ادب روح کے لئے۔ روح کی قیمت میرے خیال میں جسم سے زیادہ ہے۔ اور اس کے تحفظ کی جہد بھی مقابلتاً زیادہ پرجوش اور اثر انگیز ہونی چاہیئے۔

پیامِ پریم!

نعیم محمد مرزا

ہمارے لئے اس سے بڑھ کر مسرت کا پیغام اور کیا ہو سکتا ہے کہ سرزمین ڈوگرہ کے سرمائی پایہ تخت جموں سے ایک ادبی ماہنامہ "پریم" جاری ہے۔ کشمیر میں علمی ادبی تاریخی اور اصلاحی رسالوں کی کمی ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مقام شکر ہے کہ ہماری یہ ایک دیرینہ آرزو بار آور ہو رہی ہے۔ اس کی ادارت ملک کے ہونہار ادیب حضرت اقبال شیدائی اور گلزار احمد فدا کے ہاتھوں میں ہے۔ توقع ہے کہ جس طرح "ہمدرد" اپنے مختصر دور میں بلند و پست پر چھا گیا ہے۔ اسی طرح یہ ماہنامہ بھی دوسرے رسالوں اور [illegible] سے بلند ہو کر ملک کی صحیح ادبی خدمات سرانجام دینے میں کوتاہی نہیں کریگا۔ دعا ہے کہ اللہ کریم "پریم" کو ملک و قوم کی سچی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ریاست بھر میں اپنی امتیازی شان سے پریم و محبت کا حقیقی فرض ادا کرے۔ ماحول میں ایسے کہ گبر و مسلماں دونو ایک ہی دست صنم ایک ہی قرآں ہوگا

— ادیب

اثر صہبائی

خود یابی

خود ہی مے ہوں، خود ہی خُم ہوں خود ہی خمخانہ ہوں میں
بے نیازِ ساقی و مینا و پیمانہ ہوں میں!

مظہرِ نورِ حقیقت ہے مری دیوانگی
عقلِ کل بھی جس پہ قرباں ہے وہ دیوانہ ہوں میں

بے نیازِ شمعِ محفل ہے مرا سوز و گداز
خود ہی شمعِ حسن ہوں اور خود ہی پروانہ ہوں میں

جلوہ گاہِ نورِ حق ہوں اور خود آگاہ ہوں
جلوہ ہائے محفلِ ہستی سے بیگانہ ہوں میں

خاک ہوں لیکن نہاں ہیں مجھ میں انوارِ ازل
جس میں پوشیدہ ہیں گنجینے وہ ویرانہ ہوں میں

سجدہ گاہِ دو جہاں ہے آستانِ دل مرا!
بے نیازِ کعبہ و دیر و صنم خانہ ہوں میں!

آ مرے سینے میں ہو گرمِ تماشا اے کلیم!
جلوہ ہائے دو جہاں کا آئینہ خانہ ہوں میں

کیفِ صہبائے محبت کو نہیں بیمِ خمار
جاوداں ہیں مستیاں جس کی وہ مستانہ ہوں میں

بادۂ حق و صداقت سے اثر سرشار ہوں
خوابگاہِ دہر میں غوغائے مستانہ ہوں میں

پریم جموں

آثر لکھنوی

دلِ حرماں نصیب

فلک پر ظلمتیں چھائی ہیں بادل گھر کے آئے ہیں
شگوفے خشک لب ہیں اور غنچے مسکرائے ہیں

اُمس ہے وہ غضب کی موج دریا ہو رہاں بھولی
خموشی نے لبِ ساحل اُدھر پہرے بٹھائے ہیں

زمین پانی کی تو سی بھُن رہی ہے آگ میں گویا!
یہاں پہنچی، وہاں درکی، ہزاروں زخم کھائے ہیں

نہیں بادل یہ سب ہیں مرہم کافور کے پھاہے
جراحت مندمل کرنے کو فطرت نے بنائے ہیں

ہوائے سرد مژدہ دے گی ختم دورِ کلفت کا
اسی کے واسطے کر کے کیت بجلی کے بلائے ہیں

حیاتِ نو عطا ہوگی دوبارہ شکلِ باراں میں
لہک اٹھیں گے وہ پودے جنہیں غش پر غش آئے ہیں

مگر تاراجِ حرماں ہاں دلِ حسرت نصیب اپنا
کہ جس نے اشکِ ناکامی بھی آنکھوں میں سکھائے ہیں

کوئی صورت نہیں ایسی کہ وا ہو یہ گھڑی بھر کو
نہ پوچھو، یہ نہ پوچھو کس ستمگر کے ستائے ہیں

کشن سمیلپوری

دُنیائے دِل

او بتِ مغرور - او نا محرمِ پہنائے دل
گوشۂ پہلو میں کب محدود ہے دنیائے دل

اس کے طول و عرض سے ہرگز نہیں تو آشنا
اس کی حدوں کا نہیں تیرے فرشتوں کو پتا

وسعتوں سے اس کی ہو جاتا اگر تو باخبر
اور دم بھر کیلئے ہوتا تیرا اس میں گزر

تجھ پہ ہو جاتی حقیقت اس کی ساری آشکار
اس کے گوناگوں مناظر کا نہیں کوئی شمار

کوہسار اس میں ہیں - جنگل و صحرا اس میں ہیں
مرغزار اس میں ہیں - چشمے اور دریا اس میں ہیں

جم رہا ہے جس طرف تیرے تبسم کا خیال
اس طرف کا ذرہ ذرہ ہے مسرت سے نہال

کیف و مستی سے بھری ہیں محفلیں اصنام کی
گرمیاں ہیں ہر طرف رقص و سرود و جام کی

اس کے گلزاروں سے نادم خوبئ باغِ جہاں
دلکشائی اس کے ایوانوں کی رضواں میں کہاں

خاص کر وہ سامنے کا ایک قصرِ زرنگار
جس کی سج دھج سے ہے شرمندہ عروسِ نو بہار

گوہرِ بیحد کر رہے ہیں جس کے جلوہ باریاں
موتیوں کی جس کی دیواروں پہ ہیں گلکاریاں

جس میں ہر لحظہ ہیں فردوسی ہوائیں آ رہی
جس کی ہر شے اپنی زینت سے ہے دل کو بھا رہی

جل رہی ہیں جس میں شمعیں اک قلعہ کافور کی
بچھ گئی ہے فرش پر جن سے ردا اک نور کی

تخت پر جس میں ہے رشکِ مَلک جلوہ فگن
جس کے آگے سر جھکائے ہیں ہزاروں گلبدن

بزم میں ہے یوں درخشاں جس کا اندازِ شباب
محفلِ انجم میں جلوہ گر ہو جیسے ماہتاب

جس کا ہر ارشاد ہے مانند فرمانِ خدا — سم کو چھو دینے سے کر دیتا ہے جو آبِ بقا
جس پہ ہے صورت گری آکر ازل کی رُک گئی — جو کسی گردن ہے جس کی فلک پا پہ جھک گئی
کاش تو اس غیرتِ خورشید و مہ کو جانتا — حکمراں ہے کون اس دُنیا کا تو پہچانتا

اپنے حسنِ عارضی پر غور سے کرتا نظر
ترک کر کے یہ خودی، یہ خود نمائی چھوڑ کر

کاش تُو بھی ہو کے اس میں جلوہ فرما دیکھتا — چند روزہ حسن و خوبی کا تماشا دیکھتا!
تجھ پہ کھل جاتا کہ تیرے عشق کی دیوانگی — ہے جہانِ قلب میں اک دشمنِ لطف و خوشی
سرد مہری سے تری یہ بیاباں ہو گیا — سرسبز آماجگاہِ یاس و حرماں ہو گیا
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے اس کے رنج و بیکسی — موت سے بھی سخت بدتر ہے یہاں کی زندگی
جا بجا اس میں ہیں لاکھوں آرزوؤں کے مزار — حسرتیں رہتی ہیں صبح و شام جن پر اشکبار

دودِ غم کی ظلمتیں ہیں چارسو چھائی ہوئی،
جن سے رہتی ہے ہمیشہ رُوح گھبرائی ہوئی

دیکھ لیتا کیسی دہشتناک ہے یہ سرزمیں؟ — ایک لمحہ بھی جہاں صبر و سکوں حاصل نہیں
اس قدر ویران بستی میں مگر تیرا گذر؟ — جتنا ہونے لگا تیرے تصوّر میں اثر!
پھر یہ ویرانہ ہوا آباد - پھر بدلا سماں — فصلِ گُل آئی ہے پھر رخصت ہوا دورِ خزاں
پھر جہانِ قلب میں آیا یکایک انقلاب — پھر یہاں کا ذرّہ ذرّہ ہو رہا ہے آفتاب
یہ ابھی کیا تھا جہانِ قلب؟ اور کیا ہو گیا — بس یہی سمجھا اب، اک یہ عقدہ تھا جو وا ہو گیا
اس میں رنج و غم بھی ہے، تسکین اور راحت بھی ہے — یہ وہ دُنیا ہے جہاں دوزخ بھی ہے جنت بھی ہے

رنج و غم ہے عارضی، راحت بھی ہے ناپائدار
اک تصوّر پر ترے دونوں کا ہے لیکن مدار

آذر عسکری

چار سو بیس

کردار:-

سلیم:- کاشمیر کے ایک دولتمند کا نوجوان فرزند جو بہت سا روپیہ لیکر بلا اجازت گھر سے چلا۔

احمد:- سلیم کا ایک ہندو دوست جس کی تحریک سے یہ [illegible] تیار کیا گیا۔

نوشابہ:- بمبئی کی [illegible] عالم گول پیشے کی شکاری [illegible] [illegible] [illegible] نوشابہ کا دست راست۔

چندو:- نوشابہ کا ظاہری نوکر

منظر:-

بمبئی کی پررونق سیرگاہ کا اپالو بندر۔ سیر کرنے والوں کا بے پناہ ہجوم "باب الہند" کے بائیں طرف ایک طرف بنچ پر ایک خوش پوشاک نوجوان بیٹھا ہوا بے فکری کے عالم میں سگرٹ "چوس" رہا ہے۔ اتنے میں ایک عطر بیز تیلی ساڑھی سنبھالتے ہوئے ساتھ ہی رومال سے چہرے کو ڈھانپتی ہوئی آتی ہے۔

عورت:- کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟

نوجوان:- (ذرا ادھر کو سرکتے ہوئے) شوق سے

عورت:- (پاس ہی بنچ پر بیٹھ جاتی ہے آنکھوں سے چشمہ اتار کر پونچھنے لگتی ہے۔ نوجوان سے مخاطب ہو کر)

نوجوان:- واقعی عجیب

(فضا خاموش ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں گفتگو کا کام آنکھیں کرنے لگتی ہیں۔ عورت خاموشی کو توڑتی ہے)

آپ شاید نووارد ہیں؟

نوجوان:- بالکل

عورت:- آپ کا وطن

نوجوان:- کاشمیر

(عورت [illegible] سے اچھل پڑتی ہے) کاشمیر! کاشمیر!! کتنا پیارا نام ہے کاشمیر! (زیر لب بڑبڑاتی ہے) [illegible] دفعہ [illegible] سے کاشمیر کی تعریف سنی ہے [illegible] کاشمیر دیکھنے کے لئے کس قدر بیتاب [illegible] آپ کی تعریف۔

نوجوان:- ایم۔ اے سلیم۔ اور آپ

عورت:- نوشابہ! (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) میں آپ سے مل کر بہت مسرور ہوئی۔

نوجوان:- اور میں بھی

دونوں مسکراتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف عشق پاش

نظروں سے دیکھتے ہیں (اتنے میں ایک مرد قد سے
چلا ہوا آتا ہے) ارے سلیم تم یہاں آ بیٹھے۔ میں تو
ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا (نوشابہ کی طرف دیکھتا ہے)
اور پھر سلیم کی طرف کنکھیوں سے) آپ ــــ
میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ــــ (سلیم اٹھ کر تعارف
کراتا ہے) آپ ہیں نوشابہ ارول۔ اور آپ احمد
عبرانی میرے عزیز دوست (دونوں ہاتھ ملاتے
ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پس پردہ شاعری ہوتی ہیں موضوع
سمندر کی لہریں کھیل رہی ہیں۔ سلیم اور نوشابہ
میں آنکھوں کا بے تار برقی کام کر رہا ہے۔ نوشابہ کے
تیر کام کر جاتے ہیں۔ احمد معاملہ بھانپ لیتا ہے اور
کہتا ہے)

ناگوار نہ گذرے تو ہوٹل پاس ہی ہے۔ مجھے ذرا بھوک
بلا رہی ہے۔ تھوڑا چائے کا شغل ہی ہو جائے (نوشابہ
سے) اگر آپ بھی اگر عزیز مناسب نہ ہو تو ــــ

نوشابہ۔ کچھ پس و پیش کا انداز پیش کرتی ہے۔ پھر سلیم
کی طرف استفسارانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

سلیم۔ ہاں ہاں چلئے ہوٹل پاس ہی تو ہے۔ تینوں اٹھتے
ہیں۔ نوشابہ ایک گاڑی بان کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر
سلیم سے مخاطب ہونا چاہتی ہے۔ مگر پھر گاڑی
کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے)

گاڑی والا۔ نوشابہ بائی گاڑی لاؤں۔

نوشابہ۔ نہیں ابھی نہیں (ذرا فخر سے) ہاں دیکھو تم کا
یہ میرے دوست کاشمیر سے آئے ہیں۔ میں ذرا
ان کے ساتھ چائے پر جا رہی ہوں۔ مگر دیکھو گھر
میں ذکر نہ کرنا۔ ہاں اور جیند دکھائی نہ دے۔

گاڑی والا۔ وہ کشتی کی سیر کرنے گیا ہے

نوشابہ۔ اور دیکھو جیند کو بھی پتہ نہ ہو۔ میں
ابھی آئی۔

گاڑی والا۔ اچھا بائی جی۔

(سلیم زیر لب بڑبڑاتا ہے) نوشابہ کتنا پیارا نام ہے۔
جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالتا ہے۔ پھر جیب میں رکھ
لیتا ہے۔ نوشابہ کتنی حسین ہے اور بے تکلف
بھی۔ ٹھیک ہے (نوشابہ آتی ہے)

نوشابہ۔ معاف کیجئے۔ مجبور تھی۔ اس کمبخت گاڑیاں
کو اپنے سائے کی طرح پیچھے لگا رکھا ہے۔ اسے منع
نہ کرتی تو شاید گھر جا کر ذکر کر دیتا۔

احمد (آگے بڑھ کر) واہ گھبرانے کی کیا ضرورت ہے میں
اس کا علاج جانتا ہوں (سلیم سے مخاطب ہو کر) دینا
تو ایک کاغذ۔

(سلیم پانچ کا نوٹ نکالتا ہے۔ احمد جا کر کوچوان
کو دے دیتا ہے)

احمد۔ دیکھو بھئی یہ تمہارا انعام ہے۔ بائی جی نے
تمہاری سفارش کی ہے (کوچوان خوش ہو کر دعائیں
دیتا ہے) اللہ خوش رکھے۔ اللہ مرادیں پوری کرے۔
اللہ ــــ

احمد (ہنستا ہوا آتا ہے) ان کو ہاتھ میں لینا بھی کوئی بات
ہے۔ چلو چائے پئیں۔

تینوں ہوٹل میں جاتے ہیں۔ دروازے کے پاس
کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں (چھوکرا آتا ہے)
کیا لاؤں حضور!

احمد۔ تین کپ چائے۔ ٹوسٹ۔ مکھن (کان میں کچھ کہتا ہے)

چھوکرا۔ ہاں حضور

احمد۔ بس ٹھیک ہے۔ جلدی آؤ۔

(چھوکرا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میز پر سب
چیزیں سج جاتی ہیں۔ احمد بوتل کھولتا ہے۔ ایک گلاس
میں انڈیل کر نوشابہ کو پیش کرتا ہے) آپ کا جام
صحت ــــ

نوشابہ - معاف کیجئے مجھے آپ شوق فرمائیں - میں چلنے میں شریک ہوں (رو رو کر ہوتی ہے - آخر احمد گلاس سلیم کو دیتا ہے اور ایک خود بھرتا ہے - دور شروع ہو جاتا ہے - سلیم اُٹھ کر گانے لگتا ہے - ہوا کے زور سے خمار بڑھتا ہے - نوشابہ کو اُٹھا کر گلے لگا لیتا ہے - نوشابہ ہنستی ہوئی ساتھ ہی ہاں - ہاں کرتی ہوئی سینہ سے لپٹا کر الگ ہو جاتی ہے - باہر سے ایک آدمی کرخت لہجے میں نوشابہ بائی کہتا ہوا داخل ہوتا ہے -

نوشابہ - آئی چندو (سلیم سے) معافی چاہتی ہوں ایک منٹ - حاضر ہوئی -

نوشابہ چلی جاتی ہے - احمد و سلیم دونوں جام چڑھاتے ہیں -

سلیم - اے احمد دیکھنا تو یہ نوشابہ دربائی ابھی تک کیوں نہ آئی -

(احمد اٹھ کر باہر جاتا ہے سلیم گنگنانے لگتا ہے -

پریم کی رتیاں - پریم کی بتیاں
پریم کی رتیاں - پریم کی بتیاں
ساجن آؤ دھڑکے چھتیاں !
پریم کی ر —— (ہوٹل کا لڑکا بل لے کر آتا ہے) حضور بل ——

سلیم - ہاں بل - اچھا لاؤ - کتنا ہے - ۱۲ روپیہ بارہ آنہ جوں ؟

(جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے - ہاتھ خالی واپس - دوسری جیب ٹٹولتا ہے - پھر تیسری —— چوتھی —— نشہ اُتر جاتا ہے - بدحواسی میں چلا اٹھتا ہے - احمد! پھر اُٹھ کر باہر جانے لگتا ہے - چھوکرا راستہ روک لیتا ہے -

بل ادا کرو بابو ! پھر باہر جانا -

بمبئی - نوشابہ - چندو - احمد چودہ ہزار - ۴۴۰ - غش کھا جاتا ہے - (پردہ گرتا ہے)

——(۰:۰)——

حاجی لگ لگ

میرا سفر

میں پردیس چلا ہوں محبوب
تم فرقت میں ٹینس کھیلنا چھوڑ دوگی اور میں سگرٹ کم کر دونگا -
کیوں نہ ہو جبکہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی -
کل دوپہر کو
میری لاری تمہارے گیسوؤں کی مانند خم دار سڑک پر دوڑ رہی ہوگی -
برفیلے ہوا کے جھونکے ہو محبوب —— ورنہ اب آ باؤ گیاہ پہاڑیاں دوشالہ اوڑھے
دیکھ کر تمہاری آئینہ جبین اور "سدابہار" ناک کا تصور
مجھے پریشان رکھیگا -
میں پردیس چلا ہوں —— اور آج ایک بڑی سی قینچی خریدونگا
تاکہ میں پاؤں چھوٹے کر لوں اور تم بال نہ کٹواؤ -

مجھے بازار میں گیارہ نمبر کے بوٹ نہیں ملتے اور تمہاری
جیب میں حمام سوپ کیلئے پیسے نہیں -
قینچی قاضی الحاجات ہے محبوب
جب میں پیدل چلوں گا
پاؤں میں آبلے پڑ جائیں گے
تم میری مصیبت کا تصور کرکے
جمنا کے نلکوں کی طرح رویا کرو گی —— اور میں پاؤں
کے آبلے دیکھ دیکھ کر تمہارے چیچک کے داغوں
کو یاد کیا کروں گا
میں پردیس جا رہا ہوں اے محبوب

عبدالعزیز علائی

بابل

نمرود جبروت کی موت مرچکا تھا۔ لیکن اس کی خدائی کا اثر اس کے بعد برسوں تک شط العرب کی وادی میں باقی رہا۔ اور بابل کی تباہی پر اس کا خاتمہ ہوا۔

امراء اور سرمایہ داروں کی ضمیر فروش اور خودغرض جماعتوں نے طویل فرسِش سجدوں سے جو طویل اقتدار حاصل کیا تھا وہ اب تک قائم تھا۔ اُن کے مظالم سے غرباء پر عرصۂ حیات تنگ تھا اور نمرود کے بُت کے سامنے گڑگڑا کر نجات کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

ابدی غلامی کے آئین کی اب تک تنسیخ نہ ہوئی تھی۔ غلاموں کی آزادی غیر مشروط تھی، اور آقا کے مظالم سے گھبرا کر بھاگے ہوئے غلاموں کو درندوں کے آگے ڈالا جاتا تھا۔ بلندی سے گرایا جاتا تھا یا آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔

رومن تیامرہ "شیفش" اور "کلاڈیس" کی طرز کی خونی تماشہ گاہیں بابل میں بکثرت تھیں، جہاں بابل کے جوانمرد بھوکے درندوں سے دست بدست لڑائی لڑتے اور تماشائیوں کی واہ واہ اور اُن کی تالیوں کی آواز سے آسمان کا نیگلوں گنبد گونج اٹھتا تھا۔

امراء کے طبقہ میں تموّل اور عیاشی حد سے تجاوز کر چکے تھے۔ ان چیزوں سے جو معصیتیں فروغ پاتی ہیں۔ وہ اُن کے عقائد میں مباح تھیں، فسق و فجور کائنات کے حقیقی مالک کی غیرت کو جوش دلا رہے تھے،

آخرت اور اُخروی بازپرس یا دار وگیر اُن کے مذہب میں بے معنی شے تھی، وہ اپنے عقیدہ کے رُو سے صرف نمرود کی رُوح کے سامنے اس کے مرتب طریقہ کے مطابق جواب دِہ تھے جو اُن کے کردار کی نگرانی کے لئے ہر وقت خلا میں منڈلا رہی تھی۔

خلا میں کالی گھٹا چھا گئی تھی۔ آئینۂ آفتاب مکدر ہو رہا تھا اور زمین تک صرف اتنی روشنی پہنچتی تھی جس سے راہ دکھائی دے۔

رواقِ نیلی کی کبودی رنگت کھو گئی تھی، چاند کا پانی کو زمین تک گذر حاصل نہ تھا اور رات اتنی تیرہ و تار تھی کہ تیز سے تیز شمع کی روشنی سے بھی امراء کے عشرت کدے منوّر نہ ہوتے تھے۔

شہاب ثاقب ٹوٹتے تھے۔ کتوں کے جھنڈ کے جھنڈ خوفزدہ ہو کر رات کی تاریکی میں کائیں کائیں کرتے اٹھتے پھرتے تھے اور گیدڑ سرِ شام سے گلی کوچوں میں چلاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے۔

کبھی کبھی شہابِ ثاقب کے ٹوٹنے سے آسمان میں لمبے شعلے بلند ہوتے تھے۔ کہ تیرہ و تار زمین کے رہنے والے تھرا اٹھتے تھے تاریک گھٹا سے افق پر چمکنے والے دم دار ستاروں کی درخشانی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

شہر کے کناروں پر لومڑی کی کرخت چیخیں ان کے

اُجالے اور رات کی تاریکی میں ہر وقت سنائی دیتی تھیں، گیدھ اور کرگس سوادِ شہر کو گھیرے ہوئے تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور کتے آسمان کی طرف گردنیں بلند کئے توجہ کرتے تھے۔

پالتو چوپائے نتھنے پھیلائے دُم دبائے بھاگے پھرتے تھے۔ گھاس دانہ کی رغبت جا چکی تھی اور صحرائی جانوروں سے اپنے بچوں کی محبت زائل ہو چکی تھی۔ بابل کے لوگ راتوں کو سوتے سوتے چونک پڑتے تھے، شب خوابیاں رات بھر رویا کرتے اور بدخوابی کا عارضہ منعدی صورت میں صورۂ جیدار کی وادی میں شدت سے پھیل گیا تھا۔

امراء کے کاخ و ایوان سے غربا کے نشیمن کے در و دیوار سے مرنے والوں کی دلخراش چیخیں سنائی دیتی تھیں لیکن چلانے والا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ زمین سے الحذر الاماں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں لیکن پکارنے والا نظر نہ آتا تھا۔

گھاٹ کا پانی اترتا چلا جا رہا تھا، چشمے سوکھ رہے تھے، کنوؤں کا میٹھا پانی پہلے بعد دیگرے کھارا ہو رہا تھا۔

بابل والوں نے یہ عذاب کب دیکھا تھا۔ لیکن یہ عذاب ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک اور آنے والے ہولناک عذاب کا پیش خیمہ تھا۔ جس کی آمد آمد قدرتی آثار سے یقینی صورت اختیار کر چکی تھی۔

آخر نحوست کی وہ گھڑی آ پہونچی جب کہ قدرت نے ایک ظالم کی مادی عظمت دوسرے سفاک کے ہاتھوں ملیا میٹ کر دینے کا آخری فیصلہ صادر کر دیا۔ بخت نصرؔ نے اپنے خونخوار وحشی عساکر سے بابل کا محاصرہ کر لیا اور دریائے فرات کا رُخ دوسری طرف بدل دیا۔

"حدودِ بابل کے اندر مزروعہ رقبہ اور باغات پر شب و روز آگ برسنے لگی۔ سبزہ جل کر خاکستر ہو گیا اور کئی لاکھ کی آبادی پر لوازم زندگی یکسر ختم ہو گئے۔

جس غار میں آقم ابراہیم" کے دروزہ اٹھا تھا۔ اُس کا دہانہ یک بیک آگ اگلنے لگا۔ جس نے بابل کو بُری طرح گھیر لیا۔ سارا شہر جلنے لگا۔ شعلے آسمان کی خبر لاتے تھے۔ اور آسمان کے نیچے چنگاریوں کا عجیب آسمان نظر آتا تھا۔

امراء کے کاخ و ایوان، خونی تماشہ گاہیں، مینار، رصد گاہیں اور سر بفلک محل جل رہے تھے، مرنے والوں کی جگر دوز چیخوں سے آسمان پھٹا پڑتا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود تھیں بخت نصر کے ظالم عسکری شہر پناہ کے تمام دروازے روکے کھڑے تھے اور اس قیامت خیز منظر کو دیکھ کر خوشی سے جھومتے تھے۔

"بخت نصر" ایک بلند مقام پر شاہانہ تخت پر بیٹھا "ارم مزدہ" کی مادی عظمت طویلہ میں خاکستر ہوتے دیکھ رہا تھا اور فتح کی مسرت میں مئے احمر کے ساغر پہ ساغر پئے جاتا تھا۔

جب وہ کیوان شکوہ فردوس گاہ جلنے لگی جس میں کبھی ملکہ "سبا" دادِ عیش دے چکی تھی تو ایک واقعہ پیش آیا۔

"بخت نصر" کی سپاہ کا ایک کار پورل فصیل پر کھڑا ملکہ کے کوہستانی باغ اور محلات کے جلنے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت آگے بڑھنے کے ارادے سے پاس سے گذر گئی۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑ لیا اور پوچھا "تم کس ارادے سے جا رہی ہو"

سامنے ایک بالاخانہ چار اطراف سے جل رہا تھا۔ اور برآمدہ میں ایک نوجوان صورت تصویر کھڑا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عورت نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا

"اُسے بچانے کے لئے"

"ناممکن! یہ بے سود خواہش ہے"

"کیوں"

"اس لئے کہ تمہارے اور اُس کے درمیان آگ کا دوزخ حائل ہے"

"کوئی مضائقہ نہیں میں اُسے عبور کر لوں گی"

"لیکن تمہارے جانے سے پہلے وہ موت کی آغوش میں سو چکا ہوگا"

"آہ ایسا نہ کہو" عورت نے جواب میں کہا "ہمیں جینے کی خواہش ہے۔ ہماری زندگی یاس و حسرت کا عبرتناک مرقع ہے۔ کیا ہم اسی طرح نامرادی کی موت مر جائیں گے۔ اور ازلی قانون کے مطابق ہم سے انصاف نہ ہوگا۔

نہیں! اس سے بہتر انصاف نہیں" کارپورل نے جواب دیا" اس سے بہتر انصاف کی توقع اپنی قسمت سے نہ رکھو۔

"عورت نے تڑپ کر کہا" قسمت کا یہی فیصلہ ہے تو مجھے چھوڑ دو اور زندگی کی خواہش ہیں موت سے ہم آغوش ہونے کی سعادت حاصل کرنے دو۔

عورت نے جواب تک سپاہی کی گرفت سے چھوٹنے کی ناکام کوشش کر چکی تھی۔ پیٹ کر دیکھا حسن کی لازوال دولت سے مالامال، صورت گر عالم کی صنعت کا بے مثال نمونہ، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئیں۔ سپاہی سکتے میں آگیا اور حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"آخر تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے"

اس سوال کا جواب دینے کا وقت جا رہا" عورت نے جواب دیا" ہماری روئداد عشق اب تک تنقید سے محفوظ رہی ہے اور اسے محفوظ ہی رہنا چاہیئے۔ ہماری داستانِ عشق کی ابتدا یاس اور انجام حسرت ہے۔ اگر تم کسی معبود کے پرستار ہو تو اس کے لئے مجھے چھوڑ دو اور مجھے آخری فرض ادا کرنے دو۔

"وہ کیا"

"ایک حقیر سی امانت اسے سپرد کرنا ہے"

"کونسی"

جانِ حزیں۔ دل میں پہلے ہی اس کی نذر کر چکی ہوں۔ کارپورل نے اس کے عزم مصمم پہ گھبرا کر کہا۔ "خاتون تمہیں

اپنی صحیح قیمت کا علم نہیں۔ تم اس طرح ضائع ہونے کیلئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ بلکہ ....

"بلکہ"

بلکہ داد عیش دینے کے لئے، دنیاوی لذتوں سے مسرت اندوز ہونے کیلئے سجنت نصر کی وسیع دنیا کی مسرتیں اور شادمانیاں تم پر نثار ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ تم اپنا ارادہ بدل لو۔

یہ میرے بس کی بات نہیں" عورت نے روتے ہوئے کہا" میری مسرت کی ضیا، میری متاعِ حیات، میرے جوشِ آفریں شباب کا واحد وارث میری آنکھوں کے سامنے پڑا اجل رہا ہے۔ میری آخری استدعا ہے کہ اگر بیرحم قسمت زندگی بھر ہمارے درمیاں حائل رہی۔ تو آخری وقت میں تم ہمارے راستے کی روک نہ بنو۔

"کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے" سپاہی نے پوچھا

"ہاں بالکل قطعی"

سپاہی نے اپنی آہنی گرفت ڈھیلی کر لی۔ عورت دیوانہ وار دوڑتی زینے پر چڑھنے لگی۔ اس کے سنہری بال جو کمر سے نیچے تک رہتے تھے کھل گئے۔ برآمدہ میں داخل ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

دو سوختہ سامان عشاق کا وصال ہوا بھی تو ایسی حسرتناک حالت میں کہ موت نے گھات سے اچک کر دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

آئندہ شمارہ کی جھلک

دہریہ (افسانہ)	عشرت کاشمیری
شہلا (افسانہ)	حمید نظامی

کوثر سیمابی

مزدور

چھا گیا روئے ضیا پر سُرخ یاقوتی سحاب
کر دیا ہو جیسے تاریکی نے خونِ آفتاب

لے رہی تھیں نور کو آغوش میں تاریکیاں
چھا رہا تھا بزمِ عالم سب پر ہُو کا سماں

گھا گھی پر مسلط ہو گئی تھی خامشی
چھا گئی تھی کونے کونے پر فضائے تیرگی

تھک کے بیخود ہو گئی تھی رونقِ بزمِ جہاں !!
رہ گئے تھے سڑک کے سینوں پہ قدموں کے نشاں

جا رہا تھا سڑک پر مزدور اِک محوِ خیال
خستہ تھا مایوس اور خود پیکرِ رنج و ملال

تھا کوئی آشفتہ ساماں اور شکارِ زیر و بم
کاوشِ صد گونا گوں سے اٹھ نہ سکتے تھے قدم

آج دن بھر گھوم کر سب روند ڈالی تھی زمیں
وائے ناکامی ملی اُس کو نہ مزدوری کہیں

بھوک کی شدت سے تو دن سب گیا یونہی گزر
سوچتا ہے آج کی شب کس طرح ہوگی بسر

آج گھر میں کچھ پکا ہوگا نہ کھانے کیلئے
غم ہی ہمدم ہوگا فروزاں جی جلانے کیلئے

گو سراپا مضمحل ہے خستہ دل خستہ جگر
گھر کی حالت کا تصور ہے مگر پیشِ نظر

لے رہا ہے اُس کی کٹیا میں چراغ اک سسکیاں
اور در و دیوار سے ظاہر ہے عسرت کا سماں

بھوک کی شدت سے ننھا ہو رہا ہے نیم جاں
دے رہی ہے اُس کو اماں ہولے ہولے لوریاں

توتلے انداز سے کہتا ہے ابا آئے گا !!!
اماں، کیا کھانے کو وہ روٹی بھی لیتا آئے گا

کہہ رہی ہے لائیگا ابا تمہاری روٹیاں
اور اس کی نرگسی آنکھوں سے آنسو ہیں رواں

اُس کے دل پر اس تصور سے ہوا اتنا اثر
دم بخود سا رہ گیا وہ جوں کا توں تھامے جگر

ہوش میں آیا تو پھر چلنے لگا وہ نیم جاں
نوحہ گر تھیں اُس کے پیچھے رات کی تاریکیاں

وائے غربا کا جہاں میں کوئی آسرا نہیں
محفلِ عالم میں کیا ان کا خدا کوئی نہیں

وقف ہے سرمایہ داروں کیلئے سارا جہاں
اور غریبوں کے لئے نانِ جویں بھی ہے گراں

نرسنگداس نرگس

معاہدہ امن

مدتوں کی باتیں ہیں۔ کوئی دو سو سال پہلے کی۔ جب عیوا اور ... راجپوت گھرانوں میں لڑکی کی پیدائش ایک برداشت خیال کی جاتی تھی۔ جب کسی قبیلہ کی سرداری گاؤں کی مصاحبت، ریاست کی راج گدی، حسن لیاقت قوت بازو اور عقلمندی ہی سے میسر آتی تھی۔ سوکھو۔ رانو ٹھاکر تیجو کی بیٹی تھی۔ جو رشتہ میں منکوٹ کے راجہ کا بھائی تھا۔ وہ شباب دلفری کی پندرہویں منزل کو خراماں خراماں طے کر رہی تھی۔ وہ اپنے زمانہ میں حسن کی دیوی تھی۔ ایشور نے اس کو ایسے دلفریب سانچے میں ڈھالا تھا کہ خود قدرت کارساز اپنی کاریگری پر اس حسین مجسمہ کو دیکھ دیکھ کر رشک کرتی تھی۔ اس کا ابھرا ہوا سینہ۔ کہکشاں سی مانگ۔ چاند سا مکھڑا۔ بادام سی آنکھیں اور سرو قد جو کوئی دیکھتا کسی اور طرف دیکھنے کا نام نہ لیتا۔ اس کا دلربایانہ انداز اس قدر دلکش تھا کہ فرشتے پرندے بھی درشنوں کے لئے نیچے آ گرتے۔ اس کا معصوم تبسم دل و دماغ پر بجلیاں گرا دیتا اور اس کی نگاہ ناز دل کے صبر و سکون کو اضطراب و بے چینی سے لبریز کر دیتی۔ غرضیکہ وہ شاہکار فطرت تھی جس نے کہ ایک عالم کو تڑپا کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ ہاں تو یہ سرزمین رشک جنت جہاں تحصیلات بسوہلی و رام نگر کی حدیں آپس میں آ ملتی ہیں۔ جہاں منکوٹ قبیلہ کی راجدھانی تھی۔ ... کے نام سے موسوم تھی۔ اسی سامنے پہاڑی کے دامن میں یہ زرخیز خطہ آباد ہے اور آج کل بھی اپنے اندر وہی خوبیاں۔ دلآویزیاں اور حسن و رعنائیاں رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج کل لوگ گھروں میں چقمق کی بجائے دیا سلائی استعمال کرتے ہیں۔ اور دیودار کی مشعلوں کی بجائے امریکن و جاپانی لالٹینیں اندھیرے میں روشن کر کے آنا جانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اور کوئی خاص تبدیلی نہیں۔ وہ نہیں جانتے پوڈر۔ لپ سٹک مصنوعی آرائش اور نمائشی حسن کس کو کہتے ہیں۔ وہ اپنے اس قدرتی حسن پر شاکر ہیں اور اپنے سینوں میں وہی محبت کی روایت پنہاں رکھتے ہیں۔

ایک روز جب کہ بارش تھم گئی تھی۔ ہوا کی خنکی گرمی کے موسم کو خوشگواری کا رنگ دے رہی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ شام کا سہانا وقت مست اور پرکیف ہوائیں ہر ذی روح کے سرور کا باعث تھیں۔ پہاڑی نالوں اور کھڈوں کے طوفانی ریلے عجیب منظر کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کا پانی زور شور سے نامعلوم کس سمندر کے آغوش میں مکتی حاصل کرنے جا رہا تھا۔ ادھر مغرب میں دن بھر کا تھکا ماندہ سورج دیوتا آرام کے لئے بیتاب تھا۔ کہ منکوٹ قبیلہ کی دوسری حسین کماریاں اپنی ہم عمر سوکھو کے پاس آ گئیں۔ تجویز یہ ٹھہری کہ چلو پانی کے بہاؤ یعنی بسنتر کی طغیانی کا نظارہ کریں۔ اور باغ کی سیر بھی ہو۔ سوکھو رانو کے نظر باغ کے نیچے یہ ندی بہتی تھی۔ سب

کی سب باغ کے ایک کنارے پہنچ گئیں۔ وہ بحرِ شباب کی مست لہروں میں اٹھنے والی قیامتیں، ہاتھوں میں ہاتھ لئے خراماں خراماں نظارۂ باغ کی گلگشت اور زیرِ پل نالہ کے پانی کی روانی کی دیا میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں لیکن سوکھمو جلدی اپنے اُس گلپوش جھولے کی طرف آ گئی۔ ابھی جھولنے ہی لگی تھی کہ بادِ صبا کے ایک مست جھونکے نے سر سے دوپٹہ سرکا دیا اور وہ سنبھلنے ہی لگی تھی کہ عین اسی وقت بسندرال قبیلہ کا نوجوان وزیر زادہ کیسر سنگھ شباب و رعنائی تیر کمان جھٹسے گم گشتہ راہ اور بھٹکا ہوا گھوڑے پر سوار اُدھر آ نکلا۔ جونہی اُس کی نگاہ سوکھمو کے رُخِ انور پر پڑی اور سوکھمو کی نگاہیں بھی اُس کی طرف اُٹھیں۔ نگاہوں کا ملنا قیامت برپا کر گیا۔ ایسے تیر سینوں میں پیوست ہوئے کہ احساس کا ردو نو شکیل و جمیل مجسّے مقابل کی چوٹ کی تاب نہ لا کر اپنے اپنے آسن سے اکھڑ گئے۔ کیسر گر پڑا۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ سوکھمو گرتے گرتے سنبھلی۔ شرمائی۔ جھجکی اور اپنا دوپٹہ درست کر کے جھولے سے اُٹھ کر اس قتیلِ عشق کے پاس پہنچی ہر چند اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام، آخرش اپنے دامن کی ہوا دینے لگی۔ جب محبوب کے دوپٹہ کی خوشبو عاشقِ حزیں کے دماغ تک پہنچی تو تھوڑی دیر کے بعد تیرِ نگاہ کے گھائل نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنی پیاری سوکھمو کو مشفقانہ انداز میں نازک ہاتھوں سے مصروفِ علاج دیکھ کر بولا "ایں شکاری ہی شکار کی مرہم پٹی کر رہا ہے" سوکھمو اپنے انداز میں مسکرائی اور جواب دیا۔

"پھر آپ کو شکایت کس بات کی"

اب کیسر کے ہوش و حواس بالکل درست تھے۔ وہ اپنی کافر ادا محبوبہ کی پیاری پیاری باتوں میں اس قدر محو ہوا اور وہ اس بات کو بالکل بھول گیا کہ وہ دوسرے قبیلہ میں آ کر ایک پردہ نشین دوشیزہ سے محوِ تکلم ہے۔ اس کا انجام بوجہ دیرینہ عداوت ہر دو قبیلہ کے لئے ٹھیک نہیں ہے وہ اس قدر گم ہوا کہ اُسے پتہ نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ سوکھمو اس خیال سے کہ سہیلیاں نہ آ جائیں اُٹھی اور حسن و عشق کے دو نوجوان یہ طے نہ کرتے ہوئے کہ پھر کب اور کہاں ملیں گے جلدی سے جلدی جدا ہو گئے۔

وقت کا پرندہ اپنی رو اپنی اڑان میں اُڑتا گیا۔ اُدھر بسندرال قبیلہ میں چرچا ہونے لگا کہ وزیر زادہ کیسر دیوانہ ہو گیا۔ کسی دیوتا کا کوپ ہے یا شراپ۔ علاج معالجہ ہونے لگا۔ چیلے نچائے گئے۔ جڑی بوٹیوں کا دھواں دیا گیا۔ جادو ٹونہ اتارنے کی ہزارہا کوششیں کی گئیں۔ بڑی بڑی دُور سے سیانے بلائے گئے لیکن ولئے قسمت کہ حال وہ ویسے کا ویسا۔

لڑکے مویشی چراتے لڑکیاں چشمہ پر پانی بھرنے جاتیں۔ عورتیں گھروں کے کام کاج سے فارغ ہو کر اکٹھی ہوتیں۔ لوگ اپنی اپنی منڈلیوں میں بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑاتے تو یہی باتیں ہوتیں۔ اُسی کی بے کسی پر آہیں بھرتے۔ لیکن کسی کو کیا خبر کہ کیسا مرض ہے۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

اُدھر منکوٹ قبیلہ کی حسین چھوکری سوکھمو جس کے قہقہوں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا جس کی مسکراہٹ سے بجلی گرنے کا دھوکا ہوتا تھا جس کی متانہ روی اور قیامت کی چال پر صنوبر و سرو جھوم جھوم کر رہ جاتے تھے۔ جو سکھیوں کی سردار مانی جاتی تھی۔ آج بے بس و مجبور سی پڑی ہے۔ اُس کو دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں وہ خاموش سی رہتی ہے سارا سارا دن اُسی گلپوش جھولے پر

ٹ۔ رام نگر کا پہلا نام

پڑی رہتی ہے ۔ گلاب کی وہ شوخ و نوخیز کلی آج سرسوں کے پھول سے بھی زیادہ پیلی دکھائی دیتی ہے ۔ پھول سا مکھڑا نہ معلوم کس ہونے مخالف سے کملا گیا ہے نرگسی اور لوچیدار آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں ۔ حضرت عشق دونو طرف برابر کی آگ لگائے تھے ۔ حسن و عشق کے دونو مجسمے محبت کے دقیق فلسفے کا درس ایک دوسرے سے سیکھ اور سکھا رہے تھے ۔ اُن کے سینوں میں آتش عشق اندر ہی اندر بھڑک کر روحوں کو بھسم کر رہی تھی ۔ ضبط کی راکھ نے اُس زور سے ڈھانپ تھا کہ دھواں تک نہ ظاہر ہوا ۔ انجام کار ایکدوسرے کو یاد کرتے عالم بے کسی میں اپنے اپنے مکان میں پڑے تڑپتے تھے کوئی محرم حال نہ تھا کہ غمگسار ہوتا ۔

حسن اتفاق کہیے یا خوش قسمتی کہ رُکمنی جہاں سوکھمو کی سہیلی تھی وہاں کیسر کی بھی منہ بولی بہن تھی ۔ ایک دفعہ وہ شکرال دیوی کی یاترا سے واپس آرہی تھی راستہ میں لٹیروں نے اُس کے ڈیرے کو لوٹنے کی کوشش کی ۔ جب اُس کی پالکیاں اور ہمراہی رہزنوں کے نرغے میں پھنس گئے تو عین وقت پر کیسر لوپہنچ گیا وہ شغل شکار میں اُدھر آنکلا اور رُکمنی کو بال بال بچا لیا ۔ اُس دن سے رُکمنی نے اپنا رشتہ کیسر کے ساتھ بہن بھائی سا قائم کیا تھا ۔ اب جبکہ اُس نے سنا کہ اُس کے دھرم بھائی کیسر کی حالت روز افزوں دگرگوں ہے ۔ تو وہ برداشت نہ کرسکی کہ وہ اپنے ہاں ہی ٹکی رہے اور اپنے محسن بھائی کی خبر نہ لے ۔ چنانچہ وہ کیسر کے ہاں پہنچی اُس کا باپ منکوٹ کا راج وید تھا ۔ وہ بھی بلائے گئے لیکن وائے ناکامی ۔ راج وید نے مرض جنوں کا فتویٰ دیدیا ۔ کیسر یہ باتیں سُن کر قہقہہ مار کر ہنسا ۔ جو اُن کے اِس خیال کو اور بھی تقویت دے گیا ۔ رُکمنی کو بھی نبض کی پہچان ورثہ میں ملی تھی ۔ اُس نے اپنے باپ سے اتفاق

نہیں کیا ۔ غرضیکہ ایک دن اُس نے جب کہ کیسر نہایت افسردگی اور اضطراب کی حالت میں اکیلا پڑا تڑپ رہا تھا جا کر اپنی سوگند دیدی ۔ بیماری کا پتہ لگ گیا ۔ رُکمنی جانتی تھی کہ ہر دو قبیلوں میں دیرینہ عداوت ہے ۔ اُن کا رشتہ ہوجانا ایک معجزہ سے کم نہیں لیکن پھر بھی اُس نے وعدہ دیدیا کہ اب کے جو دسہرہ کا تیوہار آئیگا آپ کی ملاقات کرا دونگی ۔ خاطر جمع رکھیں ۔ مگر ایشور کے واسطے پریشان حال اور دیوانہ وار رہ کر اپنے متعلقین کی تشویش کا باعث نہ بنیں ۔

دوسہرہ کے دن تھے ۔ منکوٹ راج کی سالگرہ کا جشن دھوم دھام سے منایا جاتا تھا ۔ پروگرام بڑا ہی شاندار تھا ۔ پھر منکوٹ راج کی دلی خواہش اس جشن کی تجاویز کر گئی تھی کہ دیرینہ عداوتوں کو بالائے طاق رکھ کر رشتہ انسانیت میں پریم اور اتفاق کو منسلک کریں اور ایک دوسرے کو حلقہ بگوش بنالیں ۔ نہ کہ اپنی فانی کدورتوں اور ملک رانی کی ہوس و حماریں ایکدوسرے کے جانی دشمن بن جائیں ۔ بندگان خدا کے خون کی ہولی کھیل کر اپنی اپنی راجدھانیوں کی سرزمین لال کرنے کیلئے آئے دن آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہیں ۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت آس پاس کے تمام راجے مثلاً بھدرواہ و بلاور بسوہلی ۔ بھدرواہ ۔ چنینی ۔ سندری کوٹ ۔ مست گڑھ ۔ سمرتہ بندرالتہ جسروٹہ اور سامبہ کو دعوت دی گئی ۔ اور سب رفتہ رفتہ تاریخ مقررہ سے پہلے ہی مسلح و آشتی کے مژدہ جانفزا پر لبیک کہنے کو بیتابانہ پہنچ رہے تھے ۔ زمانہ کے راجگان میں اُس وقت منکوٹ راج کی شہرت نیکنامی انصاف و عدل کی دھوم زبان زد خلائق تھی اور جسے یہ برکت اور توفیق میسر ہو وہ ہی ایسی ذمہ واری اپنے کندھوں پر لے سکتا ہے ۔ جب منکوٹ راج نے دیکھا کہ سب آرہے ہیں اور بندرال راج نہیں آئے ۔ بلکہ بیماری کا بہانہ

کر دکھایا ہے۔ تو اُسے اور بھی زیادہ شک گذرا
سابقہ عداوتوں اور پرانی کدورتوں کے تجسس میں یہ بہانہ
چنگاری کا کام کر گیا۔ مگر خاموش اپنے جشن کے انتظام
اور مہمانانِ عالی وقار کی تواضع میں پوری طرح منہمک رہی ہے
سوکھمو بھی اس جلسہ میں شامل تھی۔ لیکن خلافِ معمول
خوش مزاج تھی۔ کیونکہ رکمنی نے تلسی کا بیاہ رچایا تھا۔
اور اس تقریب پر سوکھمو کا شامل ہونا ضروری تھا۔ وہاں
بھی ہر طرح کا انتظام منکوٹ راج کا ہی تھا اور یہ سازش
رکمنی کی طرف سے سوکھمو اور کیسر کی ملاقات کے لئے تھی
جسے رکمنی نے اپنے وعدے کی تکمیل کیلئے بروئے کار لانا
تھا۔ اُدھر سالگرہ کا جشن پر رونق پر تھا۔ راجگان مسند آرا
محو تماشہ تھے۔ لوگ آس پاس کی بستیوں سے ہتھیار
بند اور ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس ہو کر جوق در جوق
پہنچے ہوئے تھے۔ راج محلات کے نیچے چوگان میں انسانوں
کا یہ شاندار اجتماع بہادروں کے کرتب و کمال پر داد دیتے
ہوئے عش عش کر رہا تھا۔ محلات میں رانیاں و دیگر
کی پردہ نشین مستورات جھروکوں میں بیٹھی اُن ریشمی
جھلملیوں سے تماشہ گاہ کے منظر سے لطف
اندوز ہو رہی تھیں اور اُس ماہ وش کی دزدیدہ
نگاہیں تماشہ گاہ کی سجائے پنڈال کی سٹیج پر متمکن
ہستیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن یہ سورج
مکھی کا پھول اپنے سورج دیوتا کو نہ پا سکا جس کے
درشنوں کی آرزو نے عرصہ سے اُسے دیوانی بنا رکھا تھا
وہ سیماب کے مانند تڑپ اٹھی ....
... آہ کھینچ کر رہ گئی۔ رکمنی بھی پاس نہ تھی کہ اُس
سے دریافت کرتی۔ وہ اپنے لال بیاہ کے کاموں میں
مصروف تھی اور آج جلسہ کے بعد اُس کے ہاں
اُن کا جوڑ میل ہونا قرار پایا تھا۔ سامنے محفل گرم تھی۔
سرود و نشاط کی ہنگامہ آرائیوں میں سب مگن تھے۔

باری باری کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ گھوڑ دوڑ۔ مصنوعی
جنگ۔ نیزہ بازی۔ کشتیاں۔ بھینسوں کی لڑائی۔ پہاڑی
عورتوں اور مردوں کا مشترکہ ناچ وغیرہ بخوبی انجام پا چکے
تھے اب تیر اندازی کا امتحان تھا۔ اور جو اس پر پورا اترتا
اُس کے سر جلسہ کی کامیابی کا سہرا چڑھنا تھا۔ چاند دس
فٹ اونچی دیوار میں لگایا گیا تھا۔ ایک سو قدم کے فاصلہ
سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر نشانہ لگانا تھا۔ ہزارہا تیر انداز
جمع تھے۔ لیکن نشست کیا باندھتے۔ آنکھوں پر پٹی اور
سب ناکام۔ منکوٹ راج مایوس ہو گئے۔ جلسہ
ادھورا ہی رہ گیا۔ محفل برخاست کرنے ہی لگے تھے کہ
ہجوم میں سے ایک برہمن تیر کمان جوڑے میدان میں آنکلا
جس نے دیکھتے ہی آنکھوں پر پٹی بندھوائی اور ایک دو
تین پر نشانہ لگا کر چاند نیچے گرا لیا۔ آفرین آفرین کے فلک
شگاف نعرے ہر چہار اطراف سنائی دینے لگے۔ اور سب
راجگان بول اُٹھے۔

"ناممکن" اس زمانہ میں جب برہمن کٹاری کے سوا
کوئی اور ہتھیار زیب تن کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ ایسا
نشانہ ناممکن۔ یہ برہمن معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس
بھیس میں کوئی راجپوت نوجوان ہے۔ اُدھر محلات میں
مستورات اپنے شوہروں اور بھائیوں کی ناکامی پر پانی پانی
ہو رہی تھیں کہ صدائے مرحبا فضا میں گونج گئی اور سوکھمو
کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیسر! خوب"!

لیکن کسی نے اس شور میں نہیں سنا۔

انتظار کی گھڑیاں بھی کسی نے کیا بنائی ہیں۔ ہوتی
تو مزیدار ہیں۔ لیکن ختم ہونے کو نہیں آتیں۔ دراصل
ان گھڑیوں کا ملاپ کے بعد بے حد لطف آتا ہے۔ اور ہمارے
پلاٹ کے دونوں شہزادے ان ہی تلخ گھڑیوں سے گذر رہے
تھے۔ تلسی کے بیاہ کی بھی یہی تاریخ تھی۔

دوسہرہ کی ساعتیں نیک سمجھی جاتی ہیں۔ جشن شاہی کے خاتمہ پر پروگرام کے حسب حال سوکھمو بھی معہ اپنی دو سری سہیلیوں کے جہاں اُس کے لطیف خوابوں کے بادشاہ شری بیت کیسر جی پہلے سے ہی مدعو کئے گئے تھے۔ شادی میں شمولیت اختیار کرنے کے لئے پہونچ گئی۔ تلسی کی شادی علاقہ کے پرسدھ دیوتا جگدیسھان سے قرار پائی گئی تھی۔ برات پہونچ گئی۔ سب کوئی اُن کی خاطر مدارات میں لگ گئے ہر ایک اپنے کام میں مصروف اور اُن دونوں کو بھی وقت مبارک تھا۔ کہ آپس میں ملکر عشق کی تلخیوں اور غم کی تشنہ کامیوں کو ایک گھڑی کے اکٹھے بیٹھنے سے دور کر سکیں لیکن یہاں تو آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ یہ ملاپ بھی دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کر گیا اُنہوں نے طے پایا۔ کہ کل رات کو قلعہ کے شمال مغربی برج کے نیچے کیسر پہونچ کر۔۔۔۔ سوکھمو کو وہاں کمند کے سہارے اتار لے اور راتوں رات اپنے علاقہ میں وارد ہو کر ہمیشہ کیلئے اس جدائی کی زحمت سے نجات پائے۔

رات آدھی ادھر آدھی اُدھر۔ چاند ابھی طلوع ہونے کے لئے سورج میں اُٹھا آکر۔ عاشق جانباز ایفائے عہد کو اٹھا۔ تاروں کی چھاؤں تلے زرہ بکتر پہنا۔ تلوار کو چوما۔ تیر کمان سنبھالا۔ جب دُنیا نیند کے خراٹوں میں مزے لے رہی تھی کہ وہ پہونچ گیا جائے مقصود پر۔ محلات میں آج محفل سرود و رقص گرم تھی۔ اُن دریچوں۔ کھڑکیوں اور جھروکوں میں رنگ برنگی ریشمی پردوں سے روشنی چھن رہی تھی۔ تمام راجے مہمان تھے اور دوسری صبح معاہدہ امن پر سب کی مہر رضامندی ثبت ہو کر انہیں اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانا تھا۔

کیسر کو ناز تھا کہ اگر یہاں سے بچ کر نکل گئے اور نیچے نالہ تک جو کہ پاؤ میل کی دوری پر بہتا ہے۔ پہونچ جائیں جہاں اپنا صبار فتار گھوڑا تیار ہے۔ تو دُنیا کی کوئی بھی طاقت ہم سب کو پکڑ نہیں سکتی۔ صرف ان چند اور نازک مرحلوں سے ہی نکلنا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ از حد خوش تھا۔ اور یونہی برج پر کمند سوکھمو کیلئے پھینکی۔ چوچوں کی آوازیں جنوب مغرب کی طرف سے آئیں اور منکوٹ راج کے جلو میں ملبوس پہرہ دار جنگی سپاہی ہاتھوں میں مشعلیں لئے شمشیر بکف پہونچ گئے۔ ایک اجنبی کو قلعہ پر کمند ڈالے دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے اور حکم دیا کہ "گرفتار کر لو" جب کیسر کی مشکیں باندھ لی گئیں تو منکوٹ راج نے اُس سے چوری کا سبب دریافت کیا۔ اُس نے نہایت بے جگری سے کہا کہ "مجھے یہاں کوئی کام نہ تھا۔ صرف آپ کے محلات کو آگ لگانے اور آپ کے منصوبوں کو جو کہ آپ بندرالتہ راج کے بغیر معاہدہ امن کی تشکیل پر کار بند ہو رہے ہیں خاک میں ملانے کے لئے میری آمد ہی تھی۔ لیکن افسوس اور آپ کی خوش قسمتی کہ آپ ہمارے ہاتھوں سے بچ گئے اور میں اپنا فرض ادا نہ کر سکا"

اسی وقت دربار خاص منعقد کیا گیا۔ مہمان راجے سب کے سب شامل ہوئے اور ایسے مجرم کیلئے خواہ وہ جلسہ کی کامیابی کے لئے تحفہ لئے ہوئے ہی کیوں نہ تھا سولی چڑھانے کی سزا تجویز ہوئی تاکہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔

سوکھمو کے سامنے یہ تمام واقعہ ہوا۔ لیکن کیا کہتی منہ میں زبان نہیں اور اپنے جانباز پریتم کے بلیدان پر تڑپ اُٹھی کہ جیسے ایسا سنگین جرم اپنے ذمہ لیکر اصلی راز کو بالکل ہی چھپا لیا تاکہ ایک راجپوت دوشیزہ کی لاج پر حرف نہ آئے کیونکہ بوجہ عداوت دیرینہ یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ اگر یہی بات بھی کہہ دیتا تو بچ جاتا اُس نے دونوں کی رسوائی کی بجائے سارا قصور اپنے سر لے لیا۔

جانباز ڈوگرے ہتھیلی پر جان رکھ کر ایفائے عہد کے لئے جس طور اپنی آن پر کٹ مرتے ہیں بے مثال ہیں اسی طرح حسن و عشق کی شعلہ زاہدیاں اور فتنہ انگیزیاں

ہیں۔ اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اُن کے ایسے کارنامے جو وقتاً
فوقتاً منصۂ شہود پر آتے رہے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے ناقابلِ فراموش
حقائق سے کہیں زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ اُن کے پریم
بھرے افسانے پُرسوز دردِ محبت کی داستانیں اپنے
اندر ایسے جذبات رکھتی ہیں کہ پڑھنے سننے والے حضرات
پر ایک کیف سا طاری ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہانی ان ہی
افسانوں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ اُس عاشق جانباز کو
ایک سو برانیے مگر گہرے کنوئیں میں رات بھر پھینک دیا گیا۔
اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بیاتک وہاں آس پاس
کی بکھری ہوئی بستیوں میں پتہ لگ گیا کہ آج کسی انتہائی
درجہ کے مجرم کو منکوٹ میں پھانسی دیا جاتا ہے۔ بار بار
نرسنگھا کی اردگرد کی پہاڑیوں سے ٹکرائی ہوئی صدائے
بازگشت کسی کی موت کا اعلان سناتے ہوئے خوف پیدا کر
رہی تھی۔ اور محلات کے نیچے .... پہلے دن کے جلسہ
گاہ میں ایک پہر دن چڑھے تک ہجوم ہو گیا۔ دربار لگ
گیا۔ راجگان مسند نشین ہو گئے۔ اور کیسر کو مشکیں باندھ کر
کر لایا گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ وہی کامیاب بہادر
ہے جس کے سر جلسہ کا سہرا رہا تو افسوس کے ساتھ ہاتھ
ملنے لگے۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ منکوٹ راج
کو غلطی ہوئی ہے۔ اس قسم کے دلاور کی نیت میں فرق آنا اصول
قدرت کے خلاف ہے۔ قلعہ کے جھروکوں میں رانیاں نیلے
کی دوسری عورتیں اور سوکھمو بیٹھی ہوئی حسرت زدہ نگاہوں
سے اس دلدوز منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ گو لب کشائی کی
مجال نہ تھی لیکن دل ہی دل میں سامنے بے بس و مجبور
کھڑے ایک خوبصورت نوجوان جس کے چہرے پر خوف و ہراس
کا نشان تک نہ تھا کی بن آئی موت پر افسوس کر رہی تھیں
غرضیکہ منکوٹ راج کے سوائے منکوٹ کا ذرہ ذرہ
کیسر کے حق میں دعائے خیر پڑھ رہا تھا۔ رکمنی کے باپ
نے ہوا وہ سب تھا کہہ دیا۔ لڑکی کا پاگل پن ہے میں

اس کی تشخیص کر چکا ہوں۔ رکمنی بھی محلات کے اندر تھی
اُس نے وہاں پر ایا گھنٹا کر دیا کہ یہ تو پاگل ہے۔ سرکار
خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو پھانسی دے رہے ہیں۔ لیکن
سنتا کون؟ منکوٹ راج نے اپنے اصلی مجرم کو گرفتار
کیا تھا۔ پھانسی دی جانے لگی۔ کیسر کو کہا گیا کہ اپنی آخری
خواہش کا اظہار کرے۔ اُس نے کہا کہ "اے دیوتاؤں کے
دیوتا۔ میرا گناہ معاف کر جو میں اپنے بزرگوں کی عداوت کو
تقویت دینے کے لئے منکوٹ راج کے محلات کو جلانے
آیا تھا"

یہ کہکر اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھانسی کا تختہ کھینچنے میں
صرف آنکھ جھپکنے کی دیر تھی کہ ہجوم میں کھلبلی مچ گئی۔ اور
آن واحد میں سوکھمو "جھوٹ۔ جھوٹ۔ سب جھوٹ" پکارتی
کیسر کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ راجہ لوگ حیران و ششدر
بُت سے بن گئے۔ وہ کہنے لگی "یہ جھوٹ کہتا ہے سفید جھوٹ
یہ محلات جلانے نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے لے جانے کیلئے آیا تھا
میں نے اسے بلایا تھا۔ میں اس دن سے اسے پریم کرتی ہوں
جب یہ راہ بھولا ہوا میرے گلپوش جھونپڑے کے پاس آکر
بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اس کے بغیر ایک پل زندہ نہیں
رہ سکتی۔ آپ لوگوں کی دشمنی ہوگی۔ بزرگوں کی عداوت ہی
لیکن ہماری تو محبت ہے۔ اے میرے بھائیو۔ بزرگو۔ ماتاؤ
اور بہنو۔ میرا کیسر کے بغیر زندہ رہنا محال ہی نہیں بلکہ غیر ممکن
ہے۔ اگر اسے سولی چڑھایا گیا تو میرے ستی ہونے کے لئے
بھی میرے ہارشنگار کے سامان تیار کرو۔ میں اس کو وعدہ
دے چکی ہوں۔ میں اس کے ساتھ شادی کر چکی ہوں۔ یہ میرا
شوہر ہے۔ میرے شوہر کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ مجھے
بیوہ بنایا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں بیوہ ہو جاؤں گی
میں بیوہ ہونے پر موت کو ترجیح دیتی ہوں۔"

... اچھوت دیویاں شوہر کی زندگی ختم ہونے کے بعد اپنا
[illegible] تو ہین سمجھتی ہیں۔ وہ زندہ نہیں

نہ سکتیں۔ میرا اپنی درت دہرم مجھے مجبور کرتا ہے۔ کہ میں بھی اپنے پتی کے ساتھ ستی ہو جاؤں۔ یہ کہکر وہ کیسر کی باہوں کو پکڑ کر زار قطار رونے لگی۔ کیسر کے آنسو بھی گر رہے تھے۔ اس رقت انگیز نظارے کی تاب آکاش پر دیوتا بھی نہ لا سکے۔ اور منکوٹ راج مسند سے اٹھ کر دونوں حسین مجسموں کے پاس آگئے۔ آتے ہی کہا۔ نہیں سوکھمو۔ کون کہتا ہے کہ تو بیوہ ہو جائیگی۔ تیری محبت نے تمدتوں کی عداوت کو مٹا دیا ہے۔ اور اس معاہدہ امن پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

میں نے بھی بچپن کے خاتمہ نوجوانی کے آغاز میں اس دادیٔ حسن کا سیر کی ہے: میں کو اب تک ایسے بے شمار حسینان مہ جبیں کی چہل قدمی کا ناز ہے۔ اور وہ اب تک ویسے ہی محبت کی روایت کو اپنانا اپنا طرۂ امتیاز سمجھتی ہے۔

حمید نظامی

پیغام

اے گل حسین جس کی جبین پر شبنم کی افشاں چنی ہوئی ہے اور جس کے رخ پر خورشید سحر کی زریں کرنیں فدا ہو رہی ہیں۔

اپنی اُن سب صباحتوں اور لطافتوں کے ساتھ ذرا وہاں تک جانا۔ اور اُس سے کہنا۔

تو تو مجھ سے بھی حسین ہے۔ پھر اس طرح چھپ چھپ کر رہنے کا مطلب؟

اٹھ اور باہر چل

دیکھ بہار زندگی کی جوشش سے دنیا کی عشرتوں کا لالہ رنگ پیئے جا رہی ہے۔

اے حسینوں کے حسین!

کنج عزلت چھوڑ۔ اپنا حسن اور اپنے چاہنے والوں کو لیل برباد نہ کر۔

اگر تو کسی ویران دشت میں لالہ خودرو ہوتا اور ——— تو نہایت بے کیف لمحے گذارنے کے بعد نطمۂ صرصر کی نذر ہو جاتا

کس کام کا وہ حسن اور کس کام کا وہ حسین

جو چھپ چھپ کر رہے اور دوسروں کو دعوت نظر نہ دے

اٹھ اور آ۔ یہ آ۔ اس خلوت میں کچھ بھی نہیں ——— تو ان سے باہر آ اور دعوت نظر دے۔

اے گل حسین!

اُس سے کہنا کہ زندگی کی کشتی نہایت تیزی سے مقام فنا کی طرف چلی جا رہی ہے اس لئے جام مسرت کو آخری گھونٹ تک پی جا۔ اگر وہ نہ مانے تب اُس کے سامنے پہلے کملانا۔ پھر مرجھانا اور مرجھا کر قدموں میں مٹ جانا

تاکہ وہ جان لے کہ ہر حسین چیز کا یہی انجام ہے۔

(انگریزی سے)

حنیف ہاشمی

انجلینا کی ڈائری کا ایک ورق

۵ ر اکتوبر

ماں کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا چہرا غمگین تھا۔ اس نے ہمیں گلے سے لگایا اور بہت سے پریشاں کن الفاظ کہے جو اکثر ایسے مواقع پہ کہے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے الفاظ پاکیزہ محبت اور پوشیدہ افسردگی سے معمور تھے۔

میں نے اپنا چہرہ جارج کے سینے سے چھپا لیا۔ بغیر کسی ظاہر وجہ کے سسک سسک کر رونا شروع کیا۔

ماں نے میرے آنسو پونچھے اور اسی اثنا میں جارج نے اپنے حواس قائم کر لئے تھے۔ اب وہ نہایت سکون اور ملاطفت سے گفتگو کرتا تھا۔ ہم شادی کی تاریخ پر بحث کرنے لگے مگر کسی خاص نتیجہ پر پہنچ نہ سکے۔

جب میں تنہا رہ گئی۔ میں غمگین طور پر افسردہ تھی۔

——— میں محسوس کرتی تھی کہ اس لامتناہی مسرت کا کہیں نشان بھی نہیں جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نامعلوم طور پر اپنی روح کا جائزہ لے رہی تھی ———

——— میرے اندر تمام خاموشی تھی۔ موت کا سا سکوت

رات

پھر نہیں سو سکتی۔

میں چاہتی ہوں کہ اپنے تئیں خوشی محسوس کرنے پر مجبور کردوں۔ کبھی کبھی وقت میری عظیم اور لامتناہی مسرت کا احساس ایک لمحہ کے لئے میرے دل کو مسرور کر دیتا ہے۔ لیکن محض ایک لمحہ کیلئے میرے دل کو منور کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں پھر بھی غیر فطری افسردگی میں مستغرق ہو جاتی ہوں۔ اور خود اپنے آپ سے حقارت اور تنفر محسوس کرتی ہوں۔

میری شادی پندرہ دسمبر کو ہوگی۔ میں خوش ہوں کہ یہ قریب نہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ میری محبت اس قدر حقیر اور کمزور ہے کہ میرے محبوب کی مسرت بھی مجھ میں زندگی پیدا نہیں کر سکتی۔

اور اپنے پریشان خیال

میں اپنی روح کی ہر حرکت کا تجزیہ کرتی ہوں۔ میں بے فائدہ اس افسردگی اور جمود کے اسباب پر تسکین کرتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ میں بھی اپنے زمانہ کے اکثر افراد کے مانند تفکر سے بغیر اپنے تئیں ایک سادہ جذبہ کے سپرد نہیں کر سکتی۔ یا کیا یہ ممکن ہے مجھے اپنے باپ کی مایوسی اور تاسف کا رنج ہے۔ جسے ایک منصف اور متمول داماد کی توقع تھی۔ شاید یہ میری آئندہ الم نصیبی اور فلاکت کا پیش خیمہ ہے

آہ ——— میں شکی ہوں ———

اب میں اپنے تئیں ملامت کرتی تھی۔ اب جبکہ میرے تمام پر شوق خوابوں کی تکمیل ہو گئی۔ میرا شوق اور تپاک غائب ہو گیا۔

میں نہیں جانتی کہاں چلا گیا۔

۱۵ راکتوبر

جارج میرے درے میں دروازے پر دستک دیئے بغیر بے تابانہ داخل ہوا۔ بستر سے اٹھی تھی ــــــ ایک مختصر سی نیند سے مجھے کچھ تازگی اور سکون ملا تھا۔ میں صبح کے آیاب سفید ساٹ میں تھی۔ اور اپنے بالوں میں تانا کر رہی تھی۔ معذرت کے بغیر اور بلا آداب اس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور مجھے چومنا شروع کیا۔

وہ مضطرب تھا بےچین۔ میں نے اُسے اس حالت میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اپنے کپکپاتے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میرے کھلے بالوں کو دبا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میری درمیانی کہنی کو پکڑا ہوا تھا۔ اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ گویا وہ مجھے کھا جانے والا ہے۔ وہ ایک زخمی جانور کی طرح غوں غوں کر رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے جلتے ہوئے ہاتھ پر رکھا۔

کیا ہوا ہے تمہیں جارج؟

میں خوش ہوں امیرا میں خوش ہوں۔ کس قدر عجیب انجام ہے۔ خوشی کا گمنشہ عجیب انوکھا انجام ہے۔

اب تم میری ہو امیرا میری۔ میری۔ صرف میری اس نے زیادہ قوت سے بھینچ کر پہلو سے لگایا۔

میں نے اس کے بازوؤں سے بڑی مشکل سے اپنے تئیں چھڑایا اور پوچھا کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس نے بتایا کہ اس کی اسے مجھے پرشوتی مل گئی ہے اور اب ہم شادی کر سکتے ہیں۔ یہ جس قدر جلد ہو اسی قدر بہتر ہے۔

میں نے محسوس کیا۔ میرے قلب کی حرکت بند ہو گئی کپکپاہٹ کی ایک لہر میرے جسم سے نکل گئی ــــــ میرا دل اندر گانے کو چاہتا تھا ــــــ لیکن یہ کیفیت صرف ایک لمحہ رہی۔

"واقعی جارج تم" میں صرف اس قدر ہی کہہ سکی۔

تم زیادہ خوش معلوم نہیں ہوتیں۔ اس نے بازوؤں میں بیٹھے ہوئے کہا۔

میری دلہن اس نے کہا میری ننھی جان ــــــ میری حسین دلہن۔

لفظ دلہن کی آواز مجھے کس قدر انوکھی اور عجیب معلوم ہوئی۔

اس کی تمام تر پرواز محبت اس ایک لفظ میں ابل رہی تھی اور اس کے محبت کے ساتھ فتح مندی کا احساس مسرور فتحمندی بادہ مقصد کی خوشی اور مسرت ــــــ

اسی وقت میری اماں داخل ہوئیں۔ اس کے بشرے سے فوراً معلوم ہو گیا کہ اسے جارج کا اس قدر سویرے آنا ناپسند ہے۔

جارج کو ترقی مل گئی ہے۔ میں نے اس سے پیشتر کہ وہ ملامت کا ایک لفظ بھی کہے پرجوش لہجہ میں کہا۔

ہماری شادی ہوگی۔ میں نے خود بخود کہا۔ مجھے احساس نہیں تھا میں کیا کہہ رہی ہوں۔

ــــــ(۰)ــــــ

کیفؔ اسرائیلی

انتظار

تجھے طفلی میں دیکھا تھا مری مستور آہوں نے — ترے بالوں کو چوما تھا محبت کی نگاہوں نے
حریمِ حسن کو بخشے جوانی نے طواف اتنے — ردائے آرزو اوڑھی تری عشرت پناہوں نے

مگر تو بے خبر تھی اے مری نوخیز محبوبہ!

مرے آکاش پہ چمکا ستارہ زندگانی کا ! — نیا اک باب پیدا ہو گیا میری کہانی کا !
بدل کر کروٹیں دیکھا زمانے کی نگاہوں نے — ترا نخلِ تمنّا منتظر تھا نوجوانی کا !

مگر تو بے خبر تھی اے مری نوخیز محبوبہ!

فضائے شوق میں اڑنے لگے رنگین شہپارے — زمینِ شعر سے پھوٹے مرے جذبات کے دھارے
غمِ پنہاں سے روتا تھا میں پچھلی رات کو اکثر — مری بے تابیوں کو دیکھتے تھے دور سے تارے

مگر تو بے خبر تھی اے مری نوخیز محبوبہ!

مرے قلب و نظر میں تھا جہانِ حسن و زیبائی! — جھلکتی تھی مری شب میں خیال انگیز رعنائی
دیارِ شعر و نغمہ میں ترے اک وصل کی خاطر — لہو روتی رہی برسوں مری فطرت کی دانائی

مگر تو بے خبر تھی اے مری نوخیز محبوبہ!

قیامت جاگ اٹھی آخر سحر کی آبیاری سے — ابھر آئے شگوفے حسن کے بادِ بہاری سے
سوادِ چشمِ نرگس ہے نئی تقدیر کی طالب — چمن کی پتی پتی منتظر ہے بے قراری سے

مگر تو بے خبر ہے اے مری نوخیز محبوبہ!

گلزار احمد فدا

"انقلاب آرہا ہے"

"انقلاب آرہا ہے"

یہ ہندوستان کے مشہور انقلابی شاعر ماہر القادری کی ایک ولولہ انگیز نظم کا دلپذیر عنوان ہے - اپنی قسم کی اس نرالی نظم کو ہماری ریاست - پنجاب اور ہندوستان کے متعدد اخبارات اور رسائل نے یکے بعد دیگرے شائع کر کے انقلاب پسندی اور حریت نوازی کا ایک مستحسن ثبوت دیا ہے۔

یہ دور پُر آشوب ہے - نئی روشنی کا ہر دل و دماغ نئی زندگی اور نئے نظام کا متمنی ہے - سیاسی - سماجی اور ذہنی بیداری سے تقریباً ہر ملک اور قوم بیدار ہوا چاہتی ہے - شاعری - آرٹ اور ادب کو عروس تکمیل سے ہمکنار کرنے والوں میں سب سے پیش پیش اگر کچھ ہے تو وہ ہے انقلاب زندگی کے ہر ہر شعبہ میں عظیم تغیر پیدا کر دینے والا انقلاب قوموں کی حیات و ممات کا ضامن انقلاب بلاشبہ بنیادی طور پر انقلاب کی افادیت اور اہمیت مستقل اور مسلمہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر ملی انسان کے جذبات اور احساسات انقلاب کو لبیک کہنے میں مضطرب دکھائی دیتے ہیں لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادبی اور سیاسی رسائل و اخبارات کی اس نظم سے متعلق قدر افزائی محض لفظ انقلاب کی ہمہ گیری اور اس کی ادنیٰ رعایت کا ایک دلچسپ نتیجہ ہے - کیونکہ لفظی ترنم کے قطع نظر اگر بنظر تعمق نظم کا معنوی تجزیہ کیا جائے اور پرکھا جائے کے وقت موجودہ عالمگیر حالات و واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے - تو نظم کی معنوی حیثیت میں ایک طرح کا پھیکا پن پیدا ہو جاتا ہے - کوئی ندرت نہیں رہتی - شاعرانہ تخیل - موسیقانہ انداز بیان، شگفتگی الفاظ اور اظہار جذبات کی لطافت کے اعتبار سے نظم واقعتاً لائق تعریف ہے - لیکن موجودہ اور پیش آنے والے واقعات کے مدنظر یہ نظم ایک دلکش اور صرف حسین ترین پھول ہے - یکسر تخیلی پیداوار اور واقعیت کی خوشبو سے قطعاً بیگانہ اور تہی دامن

لیجئے اب نظم ملاحظہ فرمایئے

امارت کے پرچم جھکے جا رہے ہیں
غلامی کے خاکے مٹے جا رہے ہیں
حقائق کے پردے اٹھے جا رہے ہیں
خودی کے ترانے سُنے جا رہے ہیں عجیب شان سے ....

امارت کا انتہائی دشمن ہے روس - اشتراکی روس جس کا دستور العمل فی الواقع امارت کے پرچم جھکانا اور غلامی کے خاکے مٹانا ہے - لیکن اب یہ حقیقت کسی کی آنکھ سے پوشیدہ نہیں رہی - کہ آج وہی روس مشرقی یورپ میں اپنی من مانیوں میں اس درجہ مصروف ہے کہ اس کا نصب العین فتوحات کے بادہ پُر جوش میں تحلیل ہو کر اس کے اگے پیچھے ہیں آہستہ آہستہ امارت کے خوان مرد کو نئے سرے سے گرم کر رہا ہے - تاکہ اس میں حرارت اِمارہ پیدا ہو اور زار کا زمانہ پھر پلٹ آئے - کون نہیں جانتا کہ مساوات اور آزادی اقوام عالم کا یہ مدعی آج رومانیہ، فن لینڈ، پولینڈ، ہنگری یوگوسلاویہ، بالٹکی ریاستیں اور مشرقی جرمنی کا کچھ علاقہ

اپنے زیرِ نگیں نہیں کر چکا۔ ہلاکت آفرین جنگ کے بعد شکست خوردہ اقوام سے جو معاہدے کئے جا رہے ہیں ان میں وہی "قانونِ امارت" کارفرما ہے۔ جس کی رُو سے زیرِ انتداب ممالک کو لاکھوں روپے تاوانِ جنگ ادا کرنا ہوگا اس کی ایک مثال رومانیہ کا معاہدہ ہے۔ جس کی شرائط پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر چرچل وزیرِ اعظم برطانیہ نے اپنی ایک گذشتہ تقریر کے دوران میں روس کے اس سلوک کو نہایت فیاضانہ اور منصفانہ قرار دیا۔ الحمدللہ ایک شخص پٹے اور دوسرا اس کی پیٹھ ٹھونکے ——

کیا یہی انقلاب ہے، جس کے پس پردہ غلامی کے نقدان حقائق کی نقاب کشائی اور خود ہی کے ترانوں کی توقع کی جا رہی ہے؟ —— ہندوستان غلام ہے اور صدیوں سے غلام چلا آ رہا ہے۔ یہ تلخ ترین حقیقت ہے اور اس حقیقت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ "غلامی کے خاکے مٹتے جا رہے ہیں" کیا ایک مضحکہ خیز خوش فہمی نہیں ہے؟ ایک کھلی آمیز خود فریبی نہیں ہے؟ —— روس چاہتا ہے کہ جرمنی کی شکست کے بعد اس کی صنعت کو تباہ نہ کیا جائے۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ جرمنی کی صنعت و حرفت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تاکہ جرمنی مستقبل قریب یا بعید میں کبھی بھی دنیا کے خرمن امن کو آگ نہ لگا سکے۔ لیکن روس جرمنی کی صنعت پر قابض ہونے کا متمنی ہے اور اس تمنا کے ماتحت ہی یالٹا کانفرنس میں جرمنی کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ روس یورپ میں ناقابلِ تسخیر بن جائے آج وہ ترکی کے درہ دانیال کو بھی حریصانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے حصول کے لئے اس نے ترکی سے دوستانہ تعلقات بھی منقطع کر لئے ہیں۔ اور چاہتا ہے کہ بیک وقت اس کا کنٹرول بحرہ اسود اور بحرہ روم پر ہو جائے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ تو ہندوستان سے بھی سفارتی تعلقات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مجبور و بے بس ہندوستان سے، جو ایک مدت سے "پابند سلاسل" ہے —— کیا روس کی ان تمناؤں کے ہوتے ہوئے اس کا اشتراکی نصب العین ایک فریب ہو کے نہیں رہ جاتا ہے؟ البتہ امارت کے پرچم شائد اس لحاظ سے ضرور جھکے جا رہے ہیں کہ سٹالن جو بالشویزم کا دعویدار ہے۔ اس کو منانے اور اس کی خوشنودی و سینہ زوری کی صحت کی خاطر امپیریلزم کے علمبردار مسٹر چرچل دنیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت کے وزیرِ اعظم بھاگے بھاگے تین بار ماسکو پہنچے۔ راز کی باتیں ہوئیں۔ وقار کے تحفظ میں تجاویز کو مرتب کیا۔ اور کامیاب و کامران واپس لوٹے۔ لیکن غلامی کے خاکے تو کسی عنوان نہیں مٹ رہے۔ اور نہ ہی ان کے مٹنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سان فرانسسکو میں ہونے والی امن کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے حکومت کے "جی حضوری" ہیں۔ جن کو ملکی اور قومی مفاد کا سرے سے احساس ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر حکومت کو ہندوستانیوں کے دلی جذبات کا کچھ بھی لحاظ ہوتا تو وہ سچے محبانِ وطن کو امریکہ روانہ کرتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور سان فرانسسکو کانفرنس میں کئی ایک چھوٹے ممالک کی آزادی بھی غصب ہو جائے گی۔ شائد یہی انقلاب ہے۔ جو شاعرِ محترم کے خیال میں عجیب شان سے آ رہا ہے —— واضح رہے کہ محض آنے والے انقلاب کی امید پر خود تسکین پا جانا معقولیت سے کوسوں دور ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اپنے میں وہ صلاحیت پیدا کی جائے جس پر انقلاب سو جان سے خود نثار ہوں۔ کیونکہ انقلاب آیا نہیں کرتے بلکہ برپا کئے جاتے ہیں۔

اٹھے خوابِ غفلت سے انسان سو کر
غلامی کی شہ رگ میں نشتر چبھو کر
اخوت کی شبنم سے چہروں کو دھو کر
رہے گا نہ اب کوئی مجبور ہو کر
عجب شان سے انقلاب آ رہا ہے

خدا جانے وہ کونسی دُنیا ہے۔ کہ جس کے رہنے والے خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے ہیں اور جنہوں نے غلامی کی شہ رگ میں نشتر چبھویا ہے۔ اخوت و محبت کو اپنایا ہے۔ اور مجبوری و غلامی کی تمام بندشوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہماری دنیا ہے ہندوستان بدنصیب ہندوستان۔ جس کے رہنے والے خوابِ غفلت سے بیدار ہونا "کسرِ شان" اور "تکلیف دہ گناہ" سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ پھر غلامی کی شہ رگ میں نشتر چبھونا تو ایک بڑی بات ہے۔ بڑے کام کی بات — رہی اخوت محبت اور اتحاد۔ تو بہ کیجئے صاحب۔ یہ ہندوستان ہے۔ غلامی کا پرستار۔ قومیت کا دشمن، چھوت چھات کا گھر اور باہمی تنفر کا گہوارہ۔

گاندھی جی اور مسٹر جناح کی ناکامی ملاقات اس ضمن میں ہندوستان کی سیاہ بختی کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ اس کو مت چھیڑیئے۔ ملک کا فرقہ پرست، قومیت سوز اور اتحاد شکن عنصر تڑپ اٹھے گا کیونکہ ہندوستان کی اخوت و محبت کا جنازہ جو نکل چکا ہے۔ تدبر و تفکر کا دیوالیہ بھی پٹ گیا ہے۔ اب زندگی ہے اور غلامی — غلامی ہے اور ہندوستانی .... پھر انقلاب؟ ...... ابھی وہ تو آ رہا ہے۔ اگرچہ بہت دور ہے۔ لیکن بے عمل ہندوستانی اسی میں مست ہیں۔ آہ یہ خوش فہم ہندوستانی —

غریبوں پہ نازل مصیبت نہ ہوگی
اب اربابِ زر کی حکومت نہ ہوگی
کسی سے کسی کو شکایت نہ ہوگی
کہ عزت کا معیار دولت نہ ہوگی
عجب شان سے انقلاب آ رہا ہے

بہت خوب — شاعر انقلاب نے مستقبل کی خوشگواری اور غریبوں کی خوشحالی سے متعلق جو پیشگوئی کی ہے۔ یہ زخمی دلوں پر وقتی طور پر مرہم تو ضرور رکھتی ہے۔ لیکن ایک طویل انتظار کے بعد جو مایوسی اور ناکامی کا گہرا زخم کھاتے ہیں۔ وہ اس کی کوفت اور جانگسل اذیت کو بخوبی جانتے ہیں۔ کہ بالآخر یہ زخم ناسور بن کر وبالِ جان ہو جایا کرتا ہے۔ رہی مصیبتیں۔ تکلیفیں دُکھ۔ درد اور رنج و غم — تو حضرت یہ غریبوں کے لئے مخصوص نعمتیں ہیں۔ یہ "سوغاتیں" ہیں جن کو اربابِ زر حاکمانہ انداز سے ونڈ کرتے ہیں۔ تاکہ غریب ان سے مستفید ہو سکیں — مختصر یہ کمال کیا ہندوستان کیلئے "نعمتِ غیر مترقبہ" نہیں تھا؟ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ کہ اس "مہربانی" کا محرک کون ہے۔ جاپان ہو یا کوئی دوسرا سرمایہ دار ملک۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اربابِ زر کی حکومت میں ہمیں کوئی تکلیف یا کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ کسی پر مصیبت کا نزول تو نہیں ہو رہا۔ سو خدا کا لاکھ شکر ہے کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ پھر اگر ہم سے زندگی چھین بھی لی جائے۔ تو جب بھی ہم غفلت شعار اور مآل نا اندیش ہندوستانی مطمئن ہوں گے۔ نہیں؟ کیا ذہنی مسرت کیلئے اتنا کافی نہیں ہے کہ "انقلاب آ رہا ہے"

یہ غریبوں کی شورش یہ طوفاں کے دھارے
لرزنے لگے قصر و ایوان سارے
اکڑتے تھے جو مال و زر کے سہارے
نظر ان کو آنے لگے دن میں تارے
عجب شان سے انقلاب آ رہا ہے

صاحب! نگاہِ تخیل ہی وہ قصر و ایوان دیکھ سکتی ہے جو لرزنے والے ہیں۔ ہماری نگاہ تو اس معاملے میں معذور ہے ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ کہ صاحبِ اقتدار اقوام مل کر مستقبل کی تشکیل اس طریق سے کر رہی ہیں۔ کہ جس سے ان کی انانیت اور ہوسِ زر چوراہے میں بے نقاب ہو گئی ہے۔ اور شرم۔ اجی توبہ کیجئے۔ ہزاروں اس کے دامِ فریب میں اُلجھے اور اکثر بے حس ہو کے رہ گئے۔ یہ بے باک قتالہ ہے۔ شرم تو بجائے خود اس سے منہ چھپاتی ہے۔

— کیوبک۔ قاہرہ۔ طہران۔ ماسکو اور یالٹا کانفرنسیں ہو

رہی ہیں۔ اطلانتک چارٹر کے تحت تعمیر نو اور تشکیل جدید کی من مانی تجاویز مرتب ہو چکی ہیں۔ کہ جن میں ہندوستان اور دوسرے غلام ممالک کا نام تک موجود نہیں۔ اس لئے ان حقائق کی موجودگی میں یہ کس حد تک صحیح ہے کہ " جو لوگ مال و زر کے سہارے اکڑتے تھے ان کو دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں" لیکن اطلانتک چارٹر تو ایک ڈھونگ تھا جس کی نقاب کشائی مسٹر روز ویلٹ نے کر دی ہے —— واہ رے دنیا کی سادہ لوحی اور بڑے آدمیوں کی مصلحت اندیشی۔ جب غلام اقوام نے شکوہ کیا تو اطلانتک چارٹر کے وجود سے ہی انکار کر دیا گیا۔

مشرقی یورپ پر روس غالب آ رہا ہے اور مغربی یورپ کی فاتح افواج کے کمانڈر انچیف ہیں امریکی النسل جنرل آئزنہاور اور یہ سب جانتے ہیں کہ امریکہ دنیا میں سب سے بڑا سرمایہ دار ملک ہے —— ہو سکتا ہے بقول شاعر امریکہ کو دن میں تارے نظر آ گئے ہوں۔ شاید اسی لئے جرمنی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے منصوبے باندھے گئے ہیں۔ اور یہ موجیں؟ . . . . صاحب ان موجوں کی شورش اور طوفان کے دھارے میں تو غریبوں کا خون بہہ رہا ہے۔ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھائے۔ اگست کی پلس رپورٹ اس تاریکی میں صداقت کی ایک آزاد روشنی ہے جس کی تنویر میں مذکورہ اشعار کی تغلیط و تکذیب لکھی ہوئی صاف نظر آ رہی ہے۔ " اصحاب بصیرت" کے لئے صلائے عام ہے ——
—— لیکن انقلاب؟ . . . . پھر وہی قصہ . . . . بھئی وہ تو آ رہا ہے۔ اور عجب شان سے ۔

ہوا عام پھر علم سینہ بسینہ
سکھایا گیا زندگی کا قرینہ
یہ طوفاں نہیں موت کا ہے پسینہ
وہ تہذیب مغرب کا ڈوبا سفینہ
عجب شان سے انقلاب آ رہا ہے

بے بسوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔ غریبوں کو مٹاؤ۔ کسی کو بھی فضائے بسیط میں آرام کا سانس نہ لینے

دو۔ اپنی غلامی کے شکنجے میں رکھ کر پسماندہ اقوام کو پیس ڈالو۔ کیا زندگی کا یہی قرینہ ہے۔ جس کا سیکھنا ہم پر لازم آتا ہے۔ اور جو دنیا کو عملی طور پر سکھایا جا رہا ہے۔ اگر آنے والے انقلاب کے دامن میں یہی تعلیم مستور رہے۔ تو بھی ایسے انقلاب کو دور سے سلام۔

اٹھا لو پاندان اپنا ہیں باز آیا محبت سے

بلاشبہ تہذیب مغرب کا سفینہ ڈوب چلا ہے۔ لیکن اس بربادی میں ایک ایسی آبادی نشوونما پا رہی ہے۔ جو موجودہ مغربی تہذیب سے بھی زیادہ ہلاکت آفریں ہوگی۔ چشم بینا اس نیلے آکاش پر لکھے ہوئے قدرت کے فیصلے کو پڑھ رہی ہے۔ مگر چشم ظاہر اس فیصلے کو موجودہ جنگ کے اختتام پر پڑھے گی۔ نہ پڑھے۔ آنے والا انقلاب خود ہی سب کچھ پڑھا لے گا۔ آخر وہ تو آ رہا ہے۔

جہاں میں نہ کوئی پریشان ہوگا
کہ امن و مسرت کا سامان ہوگا
زمانہ کا دستور قرآن ہوگا!
خدا کی حکومت کا اعلان ہوگا
عجب شان سے انقلاب آ رہا ہے

البتہ یہ اشعار لفظی اور معنوی لحاظ سے جامع اور مانع ہیں اور حقیقت و صداقت کے آئینہ دار . . . . قرآن ام الکتاب ہے۔ زمانے نے جب بھی اس کی تعلیم کو اپنا دستور العمل قرار دیا نجات گھٹنے تھام لے گی۔ امن سر جھکا دے گا۔ بدبختی اور بدحالی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ گیتا۔ وید۔ انجیل۔ تورات اور اس قسم کی تمام دوسری مقدس کتابیں یہی تعلیم دیتی ہیں۔ زمانہ اگر خلوص دل سے اس پاک تعلیم کو حاصل کرے تو سب تکلیفیں جاتی رہیں دنیا میں امن و مسرت ہو اور تمام پریشانیوں کا خاتمہ۔
—— کیا خدا کی حکومت کا اعلان بھی "آنے والے انقلاب" کا مرہون منت ہوگا؟ یا کبھی ہو سکتا ہے؟ یہ آپ سوچئے۔

ایم۔ اے عزیز

نئی تعلیم

تعلیم کی تعریف ہر زمانے میں مختلف طرح پر کی گئی ہے کسی نے ذہنی اور دماغی قوت کی ترقی کا نام تعلیم رکھا ہے تو کسی نے روحانی تہذیب و شائستگی کا، کوئی اخلاقی بالیدگی اور شخصیت کی نشوونما کو تعلیم کا نام دیتا ہے تو کوئی تعلیم سے صرف حواس اور جذبات کی اصلاح مراد لیتا ہے غرضیکہ انسانی شخصیت کے جتنے بھی داخلی یا خارجی پہلو اس وقت تک معلوم ہو چکے ہیں۔ تعلیم کی کوئی نہ کوئی تعریف ضرور ان کا احاطہ کئے ہے۔ جہاں تک اغراض و مقاصد اور روزمرہ زندگی کی بہتری کا تعلق ہے، انگلستان کے مشہور اور زندہ جاوید شاعر ملٹن کا نظریہ کافی مفید اور دلچسپ ہے ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے

"(اس لئے) میں مکمل اور تسلی بخش تعلیم اسے
کہتا ہوں جو کسی شخص کو صلح و جنگ کے تمام
فرائض خواہ وہ ذاتی ہوں یا پبلک، انصاف اور
فراخدلی کے ساتھ انجام دینے کا اہل بنا دے"

تعلیم کی یہ تعریف اتنی جامع اور وسیع ہے۔ کہ ہمارے زمانے تک سوائے اس کے کہ بعض خاص پہلوؤں کی تربیت اور نشوونما پر زیادہ توجہ دی جائے۔ من حیث المجموع اس سلسلے میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہو سکا۔ ملٹن نے اپنا تعلیمی نظریہ سترھویں صدی میں پیش کیا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں نشاۃ الثانیہ کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اور کامینیس، مانٹین، رابلے، بیکن، رامیش اور لاک جیسے تعلیمی مفکروں نے اپنے انقلابی نظریوں سے ہر طرف ایک ہلچل ڈال رکھی تھی۔ ملٹن کوئی بہت بڑا ماہر تعلیم نہ تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ پھر بھی اپنی عمر کے وسطی حصے میں اسے تعلیمی دنیا کے ساتھ براہ راست متعلق ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے اس کے تعلیمی نظریوں میں ایک حقیقت، اور گہرائی ہے اور زمانہ کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگی کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

کامینیس، بیکن، ملٹن اور لاک کی تعلیمی اور عصری تنقیدوں کی شروع شروع میں سخت مخالفت ہوئی مگر بالآخر کئی مقامات پر ان اصلاحی نظریوں کے مطابق تعلیمی تجربات کئے گئے کئی مدارس کو نئے ڈھنگ پر چلایا گیا۔ نئے خیالات کی آزمائش اور اشاعت کی گئی، اس طرح یورپ میں سترھویں صدی سے پہلی بار تعلیمی اصلاحات کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد تیزی، تیزی سے تعلیمی مسائل سوچے جانے لگے اور سیاسی بساط کے الٹنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی دنیا بھی بدلتی نظر آنے لگی۔

اٹھارھویں صدی یورپ کے لئے ایک انقلابی صدی تھی جس میں پرانے نظریوں کی عالیشان اور پرشکوہ عمارتیں دھڑام سے زمین پر آرہیں اور ان کے کھنڈروں پر نئے، سماجی سیاسی تعلیمی اور مذہبی نظریوں کے فلک بوس محل تعمیر کئے گئے۔ کامینیس اور لاک کے بعد روسو، بیسیڈو، اور پسٹالوزی وہ تعلیمی مفکر ہوئے جنہوں نے تعلیمی دنیا کا رخ ہمیشہ کے لئے نئی سمتوں کی طرف پھیر دیا۔ روسو نے پرانی روایات سے سب سے پہلے شدید انحراف کیا۔ وہ ایک جذباتی اور باغی انسان تھا۔ انقلاب فرانس بھی اس کا مرہون منت ہے لیکن سب سے بڑا احسان اس کا تعلیمی دنیا میں بچے کی شخصیت

کو منوانا ہے۔ وہ تعلیم میں فطری تحریک کا بانی ہے۔ سب سے پہلے بچوں کو آزادانہ ماحول میں براہ راست مشاہدہ کی امداد سے آزادی کے ساتھ تعلیم دینے پر زور دیا ہے۔ ایمیل اس کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے تعلیمی نظریہ کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ روسو اجتماعی نظریہ کی بجائے تعلیم کے انفرادی نظریہ کا سختی سے حامی ہے۔ وہ فرد کی شخصیت، آزادی اور تربیت کو سماجی زندگی کی کامیابی اور امن و سکون کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ بلیس وڈ روسو کا پرجوش پیرو ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے مشہور مدرسہ فلانتھروپینم کے ذریعے روسو کے نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی کامیاب اور سرگرم کوشش کی ہے پستالوزی بھی روسو کی فطری تحریک کا حامی ہے۔ اس نے نہایت کوشش اور محنت سے روسو کے نظریوں کی مضر اثر تیزابی کیفیتوں کو دور کر کے انہیں قابل عمل بنا دیا اور فطری تحریک کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تحریک کی بنیاد ڈالی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی دنیا سیاسی اقتصاد کے علاوہ تعلیمی ترقی کے بھی انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس دور کے ماہرین تعلیم میں ہربرٹ سپنسر، میڈم مانٹی سوری اور جان ڈیوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے تعلیمی دنیا کو اپنے ہنگامہ خیز حالات سے روشناس کیا۔ میڈم مانٹی سوری اور جان ڈیوی عصر جدید کے زندہ مفکر ہیں اور ان کے تعلیمی اصولوں نے اب ساری دنیا میں ایک عام اور ہمہ گیر حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مانٹی سوری کے سینے میں ایک عورت کا دل ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر بچوں کے ساتھ شفقت، ہمدردی، محبت اور خلوص برتنے اور نظام تعلیم میں ان اصولوں پر زور دیتے ہیں کوئی دوسرا تعلیمی مفکر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ڈیوی تعلیم میں اجتماعی نظریے کا قائل ہے۔ وہ اپنے تجرباتی مدرسہ میں تعلیم بذریعہ عمل کو ایک نمایاں جگہ دیتا ہے۔ مدرسہ اس کے نزدیک سماجی زندگی کی ایک مکمل تیاری ہے۔ اس لئے وہ ہر ایسے عملی پیشہ اور منصوبہ پر زور دیتا ہے جس سے بچوں کی پوشیدہ صلاحیتیں بیدار ہو کر انہیں عملی زندگی میں مفید اور کامیاب شہری بنا سکیں۔ ساڑھے تین سو سال کے تعلیمی تجربات اور علمی نظریوں کے بعد مغرب کا موجودہ نظام اب ڈیوی کے نظریوں سے شدید طور پر متاثر ہو رہا ہے ڈیوی تعلیم میں جمہوریت کا حامی ہے۔ اور بچوں کو آزادی، امن اور مساوات کے خیالات کی تعلیم دینا وہ مدرسہ کا ایک ضروری فرض سمجھتا ہے۔

یورپ اپنی موجودہ سیاسی اور ذہنی پریشانی سے نجات حاصل کرنے کیلئے کسی ایسے نظام تعلیم میں پناہ لینا چاہتا ہے جو اسے آئندہ کے ہولناک تصور سے محفوظ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیوی کے خیالات کی نہ صرف امریکہ میں بلکہ یورپ اور انگلستان میں عملی طور پر نشر و اشاعت ہو رہی ہے۔

مشرق بالخصوص (ہندوستان) نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ یہاں آج وہی ذہنی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی بحران ہے۔ جو ساڑھے تین صدیاں پہلے یورپ پر طاری تھا۔ ایک گھٹیا اور فرسودہ قسم کا غیر ضروری نصاب یہاں عرصہ سے رائج ہے جس نے ہماری سیاسی، سماجی اور علمی ترقی کی جڑوں کو ہمیشہ کیلئے کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہماری علمی اور عملی قوتیں مر گئی ہیں۔ محض ذہنی اور نظری تعلیم نے ہماری شخصیت کو پورے طور پر نشوونما حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تعلیم اور مدرسہ کا ہماری روزمرہ سماجی زندگی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ اور نتیجۃً سکول سے نکلنے کے بعد ہماری عملی زندگی ننانوے فیصدی حالتوں میں بیحد ناکام اور ادھوری رہتی ہے۔ شکر ہے۔ کہ اس خوفناک تعلیمی جمود کے خلاف تیزی سے ایک ردِ عمل پیدا ہو رہا ہے۔ ملک اور قوم کے بعض ذمہ دار اور سیاسی اور تعلیمی مفکروں کی کوششوں سے نئی قومی تعلیم کا ڈول ڈال دیا گیا ہے جس کا مقصد مدرسہ اور سماج کو ہم آہنگ بنا کر ملک کی نوخیز نسلوں کو ایک بہتر سماجی اور سیاسی زندگی سے ہمکنار کرنا ہے

اور یہ جان کر بھی مسرت ہوتی ہے کہ حکومت نے بھی نئی تعلیم کو ملک کے موجودہ ذہنی اور سماجی تعطل کے دور کرنے کا واحد حل سمجھ کر تعاون کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اور جنگ کے بعد ہندوستان کے طول و عرض میں نئے نظام تعلیم کو رائج کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ مغربی علمی ترقیوں اور تعلیمی مقامات تک پہنچنے کیلئے ابھی بہت عرصہ چاہیئے۔ لیکن ہماری تسکین کیلئے یہ کیا کم ہے کہ بالآخر تعلیمی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ اور ہمارا تعلیمی قافلہ ایک نئے سفر، ایک نئی راہ پر چل نکلا ہے۔

موجودہ عالمگیر بدامنی اور سیاسی پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے آج ساری دُنیا کے مدبروں اور مفکروں کی نظریں "تعلیم" مدرسہ اور استاد پر پڑ رہی ہیں بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگوں کا فیصلہ ہے کہ جب تک تعلیم اور اس کے نظام میں مناسب اور مفید تبدیلیاں نہ لائی جائیں گی اور مدرسوں کے ذریعے قابل، محنتی، باعمل، ہمدرد مخلص اور بااخلاق نوجوان نہ پیدا کئے جائیں گے۔ دُنیا کی موجودہ سیاسی بے چینی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس چیز کے بغیر ہم اپنی موجودہ زندگی میں اطمینان کا ایک سانس تک نہیں لے سکتے۔

عشرت کاشمیری

آرزوئے کیف!

وہ آرزوئے کیف شب انتظار کی
کیا کیا نہ شورشیں تھیں دلِ بیقرار کی

وہ ہے، نہ شغل مئے ہے، نہ صحنِ چمن تو پھر
کیفیتیں ہزار ہوں فصلِ بہار کی!

اب کے جنوں میں چاک گریباں ہو اگر
آتی ہے یاد پیرہنِ تار تار کی!!!

ہاں ہاں اے ہمنشین مجھے تھامو کہ میں چلا
گردش میں آگئی وہ نگہ سحر کار کی

میں ہوں اور اُن کے در کی غلامی، یہ کیا کروں
مجبور ہوکے رسمِ جہاں اختیار کی

اک آہِ سرد، اپنے لبوں سے نکل گئی!
آنکھوں میں بھر گئی جو شبیہہ گلعذار کی

اُس کا خیال آتے ہی آنسوئے ہو رواں
عشرت قسم ہے دیدۂ خونابہ بار کی

محترمہ ا۔ ر۔ محبوبہ

ماضی کا ایک حسین تصوّر

کمرے میں بھیانک سکوت ہے۔ در و دیوار کسی دیرینہ قفس کی یاد دلاتے ہیں۔ مختصر سا سامان ہے اور بوسیدہ کمرہ، طاق پر ٹمٹماتا ہوا چراغ اس خاموشی کے خوف کو قدرے کم کر رہا ہے۔ سامنے ایک میز ہے۔ جس پر چند کتابیں، کچھ رسالے اور ایک خوبصورت تصویر خاص سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی کسی کے ادبی ذوق اور جمالیاتی شوق کا پتہ دے رہی ہے۔ ایک طرف ایک بوڑھی عورت دو سالہ بچی کو تھپک تھپک کر سلانے کی بے سود کوشش کر رہی ہے۔ جو شدت بخار سے بار بار بلبلا اٹھتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھ سالہ لڑکی چارپائی پر پڑی کروٹیں لے رہی ہے۔ چہرے کی سرخی، تنفس کی تیزی اور پانی کی بار بار طلب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بیمار ہے ـــ اس کے پاس ہی ایک نوجوان عورت دیوار کا سہارا لئے کبھی بچی کی طرف اور کبھی میز پر پڑی تصویر کی طرف پُرنم نگاہوں سے دیکھ کر اور ایک آہ جانگداز بھر کے پھر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو جاتی ہے۔ اس کی آہ کا محرک زخمی احساس اور چوٹ کھایا ہوا دل ہے جس نے جانگسل تڑپ کو ہمہ گیر بنا رکھا ہے۔

ـــ "امّی ہم اپنے گھر کب جائیں گے؟ ہمارا وہ گھر کتنا اچھا تھا۔ جب ہم دوپہر کو کوٹھے پر بیٹھتے تو سامنے پاپا چلتے پھرتے۔ اور ہمیں دیکھ کر ہنس دیا کرتے ـــ دیکھ امّی وہ سامنے کون مسکرا رہا ہے۔ میں تمہیں بتایا کرتی۔ پھر تم بھی دیکھ کر ہنس دیا کرتی تھیں۔ وہ گھر کتنا اچھا تھا ہمارا! ہم کیوں یہاں رہتے ہیں؟" معصوم لڑکی نے درد بھرے لہجہ میں سوال کیا۔

ـــ زہرہ جو اب تک ضبط کا دامن تھامے ہوئے تھی۔ یہ سن کر مزید ضبط نہ کر سکی۔ لڑکی کے معصومانہ اور تلملا دینے والے استفسار نے زخمی احساس پر نمک پاشی کا کام کیا۔ بے ساختہ ایک ہوک اٹھی اور وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپ کے رہ گئی۔ جذبات کا متلاطم سیلاب گھٹا بن کر اشکوں کی صورت برس پڑا۔ ماضی کے حسین خواب اور رنگین واقعات دھیرے دھیرے نمودار ہو کر تصور کے سٹیج پر رقص کرنے لگے ـــ کہ کبھی وہ اپنے گھر خوشحال زندگی بسر کرتی تھی۔ ہر جگہ اس کی آؤ بھگت ہوتی۔ سب آنکھوں سے اٹھاتے اور دل میں بٹھاتے۔ زمانے نے کروٹ لی۔ سہاگن بیوہ ہو گئی۔ دنیا بدل گئی، دل بدل گئے، نظریں بدل گئیں لیکن وہ تو اپنے اچھے زمانے میں بھی کیف پرور محبت سے محروم تھی۔ اسی محرومی نے اس کے شباب کی دلآویزی چھین لی تھی۔ تاہم وہ بھی کچھ عجیب منظر تھا جب زہرہ کو زندگی کی پہلی بار سچی مسکراہٹ ملی۔ مضطرب زندگی نے ایک ایسی جگہ سکون پایا۔ جو بعد میں دائمی اضطراب میں بدل گیا۔ چٹان سے پانی کا تقاضا کیا۔ صحرا میں پھول کی تمنا کی۔ تاریکی میں نور کی جستجو کی۔ کاش وہ اس وقتی مسکراہٹ کو زندگی کا سرمایہ نہ سمجھتی۔ جو یکسر ہلاکت بار اور جراحت انداز تھی۔ لیکن اب تنگ دستی اور ناداری نے اپنا رنگ دکھایا۔ وہی ہستیاں جو کل تک والہ و شیدا تھیں اب بے التفاتی کا برتاؤ کرنے لگیں۔ عزیز و رشتہ دار کھنچنے لگے۔ یہ دنیا اس فلک

ستائی کے لئے تفکرات کا گہوارہ بن گئی۔ اُس کی زندگی کا نخلستان ایک دم صحرا بن گیا۔ ماحول متنفر ہو گیا۔ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ جذبات و احساسات کو ہر پہلو سے مجروح کیا گیا۔ اتہام بازی ہوئی اور اُس کا اخلاق بھی طنز کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سب دشمن ہو گئے۔ کوئی بھی اُس کا نہ رہا تو اُس انتہائی بیچارگی اور گہری بے بسی میں ایک قبول صورت اور خوش سیرت نوجوان نے اس کی ڈگمگاتی ہوئی زندگی کو کاندھا دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ وہ دوبارہ شگفتہ پھول کی طرح کھل گئی۔ اُس کے دل میں وہ نوجوان بس گیا۔ محبت کا ایک ایک لمحہ اُس پر قربان ہونے لگا۔

لیکن اس کی محبت مبنی بر حقیقت تھی۔ جنسیت اور منفیت سے پاک، خاص مادرانہ محبت —— اُس کو اپنا بیٹا تصور کرنے لگی۔ کیونکہ نہ اُس کا کوئی بیٹا تھا نہ بھائی اور نہ کوئی دوسرا غمگسار۔ بیٹے کی کمی پوری ہوئی۔ تو وہ پھولی نہ سمائی۔ جیسکی —— سہانی گفتگو، دلفروز مسکراہٹ اور دلفریب چال ماضی کا ایک بھولا ہوا افسانہ پھر سے آنکھوں کے سامنے لے آئی۔ اُس چال میں اور اُس چال میں کتنی مشابہت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ یہ چال تسکین بخش تھی اور وہ چال تسکین کش —— نوجوان نے زہرہ کی زندگی کو ایک لطیف کروٹ دی۔ اُس کی کایا پلٹ گئی۔ خزاں رسیدہ پھول بہار آفرین بن گیا۔ تنہا زندگی بتانے کا وہ طریق بتا دیا جس کو سمجھ کر وہ اپنے پر ناز کرنے لگی۔ وہ دونوں گھل مل گئے۔ اور محبت کے اتھاہ ساگر میں ڈوب سے گئے۔

انکی محبت پُر خلوص اور بالکل پاک تھی۔ مگر دُنیا اُس کی حقیقت نہ سمجھ سکی۔ غلط فہمیاں دل میں جاگزیں ہوئیں جس کی بنا پر نوجوان طرح طرح کی پابندیوں میں اسیر کر دیا گیا۔ پھر بھی وہ بے لوث عقیدت کے سخت ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر زہرا کو نوجوان کی بربادی منظور نہ تھی۔ دل پر ایک تکلیف دہ پتھر رکھا۔ اور ایک دن اُسے کہنا ہی پڑا۔ کہ تم میرے پاس آیا کرو۔ میری چشم پُر نم کو بس اسی حالت میں چھوڑ دو۔ وہ دُور ہو گیا۔ نظروں سے دُور۔ لیکن دل سے دُور نہ ہو سکا۔ پھر بھی وہ اُسے جب دیکھ پاتی گویا اُسے وہ سب کچھ مل جاتا جس سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ گاہ بگاہ دنیا کی نظروں سے بچکر ان دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ زخمی دل بہل جاتے۔ اور آنکھیں دنیا کی تنگ نظری اور تنگ خیالی پر آنسو بہا دیتیں۔

"بھری موسی" .... آہ کیسی شیریں۔ کیسی پیاری اور کیسی سُریلی آواز ہوتی تھی وہ۔ زہرہ یہ سُن کر جھوم سی جاتی۔ اُس کا دل لہرا جاتا۔ وہ فرطِ جذبات سے بے اختیار ہو کر کہہ اٹھتی۔ "کاش یہ میرا حقیقی بیٹا ہوتا"

فلک کج رفتار کب کسی کی خوشی برداشت کر سکتا ہے۔ روزگار نے مجبور کر دیا۔ زہرا کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اگرچہ یہ وطن چھوڑنا نہایت درد انگیز اور دل شگاف امر تھا بہر حال جانا پڑا۔ ناچار دیہاتی زندگی بسر کرنے پر زہرہ مجبور کر دی گئی۔ اُس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ نیز دُنیا کے طعنے دم نہیں لینے دیتے تھے۔ کیونکہ اب ان کی برداشت کی اس میں تاب نہیں رہی تھی۔ لہذا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اُسے دُور بہت دُور دیہاتی زندگی بسر کرنے کے لئے جانا پڑا۔ وہ چلی گئی۔

—— لیکن آج بھی ایک خلش ہے جو کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھتی رہتی ہے۔ جس کو کوشش کے باوجود اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔ جو اپنی جا ذبیتوں سے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی ہے۔ اجنبیت تنہائی۔ بے بسی اور بے چارگی۔ یہ سب ہے اور زہرا کی ناکام زندگی۔ آج وہ بیمار ہے۔ بخار سے تڑپ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی دیوار کا سہارا لئے بیٹھی کبھی میز پر پڑی تصویر کو دیکھتی ہے اور کبھی معصوم بچیوں کو —— اور کھو جاتی ہے ماضی کے حسین تصور میں ٭

رعنا نظامی

جنت الارض

جوشِ وحشت پھر مجھے لے چل وہیں دامن کشاں
رات دن فطرت ہے محوِ جلوہ افشانی جہاں

جاگتی رہتی جہاں ہر وقت ہے روحِ شباب
اوس کی بوندیں جہاں بن کر برستی ہیں شراب

اک تمنا زار بنجاتی جہاں ہے کائنات!
ذرے ذرے میں جہاں ملتا ہے پیغامِ حیات

قدسیوں کی بارگاہیں ہیں جہاں کے برگ زار
غیرتِ تسنیم و کوثر ہیں جہاں کے آبشار!

جس جگہ بیدار ہیں نغمے نگاہوں کی طرح
زندگانی ہے رواں خاموش راہوں کی طرح

وہ گھنے جنگل وہ گہری وادیاں وہ کوہسار!
جس جگہ فطرت کے یکجا ہیں نہاں و آشکار

برف اور سبزے میں ڈوبی اونچی اونچی چوٹیاں
آسماں کیا سخن کرتی ہیں جہاں سرگوشیاں

ہاں وہیں لے چل جہاں دنیائے حسن آباد ہے
حسن کافر جس جگہ بیباک ہے آزاد ہے

اک جہانِ کیف و مستی ہے یہاں اندر بہار
قدس کی وادی ہیں لاکھوں جنتیں جس پر نثار

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا آفتاب و ماہتاب
پردۂ دنیا پہ یہ خطہ ہے جنت کا جواب!

ہر قدم پہ دعوتِ نظارہ دیتی ہے نگاہ
عشق پختہ کار ہے حسن آشنائے رسم و راہ

ہر قدم پر حسنِ استقبال کو موجود ہے
جاذبیت گو شنازادوں کی نامحدود ہے

زندگی کی کشمکش سے گو نہیں حاصل فراغ
ہے حوادث کے تواتر سے دل اپنا داغ داغ

بڑھ کے دامن تھام لیتی ہیں کہیں ناکامیاں
ٹوٹ پڑتے ہیں مصائب دل پہ بن کر بجلیاں

جاگ اٹھتے ہیں مگر جذبے یہاں سوئے ہوئے
عشق ہے اس سرزمینِ حسن و نغمہ سے مجھے

حوصلہ کش نا امیدی کاہشِ غم جاں گداز
اس جگہ لیکن میں ہو جاتا ہوں ان سے بے نیاز

روح کی تسکین کا پیغام ملتا ہے یہاں
غنچۂ امید اپنا آ کے کھلتا ہے یہاں!

ادارہ

نازی پارٹی

ہٹلر:-

اس کا پورا نام اڈولف ہٹلر ہے۔ ۱۸۸۹ء میں آسٹریا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ کسٹم آفیسر کا بیٹا ہے۔ معماری اور مصوّری کا کام کر چکا ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوا۔ نیشنل سوشلسٹ جرمن لیبر پارٹی قائم کی۔ لیکن طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اور پانچ سال قید کی سزا ہوئی۔ قید کے دوران میں "میری جدوجہد" نامی ایک کتاب لکھی۔ جس میں جرمن قوم کی نسلی برتری کے اظہار کے ساتھ یہ حق جتایا۔ کہ جرمن قوم میں وہ خصوصیات موجود ہیں جن کے ماتحت وہ تمام دنیا پر حکومت کر سکتی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں اس کی پارٹی نے زور پکڑا۔ اور ہٹلر لگاتار طاقت حاصل کرتا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں جرمنی کا چانسلر بن گیا۔ اور اس کے بعد ڈکٹیٹر آج جرمن قوم کی قسمت اس کی مٹھی میں ہے۔ تقریباً تمام دنیا کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ جرمنی موجودہ جنگ میں فوجی طور پر ہار چکا ہے۔ لیکن ایک ہٹلر ہے جس کو اب بھی یقین ہے کہ بالآخر فتح جرمنی کی ہوگی۔

گوئرنگ:-

فیلڈ مارشل ہرمن گوئرنگ جرمنی کا فوجی افسر اعلیٰ اور جرمنی کی چار سالہ اقتصادی تجویز کا بانی ہے۔ یہ پرشیا کا پرائم منسٹر بھی ہے۔ اس کی پیدائش ۱۲ جنوری ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ کپتان کے عہدہ پر مقرر ہوا۔ اور اسے ہوائی فوج میں تبدیل کیا گیا۔ گذشتہ جنگ میں اس نے ہوائی لڑائیوں میں حیرت انگیز کام کیا۔ ۱۹۱۹ء میں یہ نازی پارٹی میں شامل ہوا۔ اور طوفانی دستوں کا تنظیم کنندہ بن گیا۔ ۱۹۳۲ء میں جرمن ریشتاغ کا رکن ہوا اور جرمن ہوائی بیڑے کا افسر اعلیٰ بن گیا۔ موجودہ جنگ کے شروع ہوتے ہی ہٹلر نے اسے اپنا جانشین مقرر کر لیا۔

گوئبلز:-

پال جوزف گوئبلز۔ یہ جرمنی کے محکمہ نشر و اشاعت کا وزیر اور بڑا مبلغ و مقرر ہے۔ اس کی پیدائش ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں نازی پارٹی میں شامل ہوا۔ اور جلد ہی پارٹی کا مبلغ بن گیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے محکمہ نشر و اشاعت کا وزیر بنا دیا۔ یہ ہٹلر کا رازدار اور معتمد آدمی ہے۔ اس کا پراپیگنڈہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ حال ہی میں ایک تقریر کے دوران میں اس نے کہا ہے کہ "۱۹۴۹ء میں ایک اور جنگ ہوگی جس میں روس برطانیہ پر حملہ کرنے کے بعد امریکہ پر بھی حملہ کر دے گا۔" گویا ایک طرح سے اس نے جرمنی کی شکست کا اعتراف کر لیا۔

ہملر:-

ہائینرچ ہملر۔ جرمنی کی خفیہ پولیس کے محکمہ کا افسر اعلیٰ ہے۔ اس کی پیدائش ۷ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔

۱۹۲۵ء میں نازی پارٹی میں شامل ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں تمام جرمنی پولیس کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس کا گسٹاپو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگست ۱۹۴۴ء میں ہٹلر پر جو بم پھینکا گیا۔ اس میں ہٹلر ہلاک ہوگیا تھا۔ اور آج کل جرمنی کا مختار مطلق ہملر ہی ہے۔ اس نے ایک تقریر کے دوران میں تسلیم کر لیا ہے۔ کہ موجودہ جنگ میں جرمنی سیاسی طور پر شکست کھا چکا ہے۔"

ربن ٹراپ:۔

وزیر امور خارجہ جرمنی ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک فوجی کام پر مامور رہا۔ ۱۹۳۰ء سے ہٹلر کے امور خارجہ کا قریبی مشیر بنا۔ ۱۹۳۶-۳۸ء میں برطانیہ میں جرمنی کا سفیر بن کر رہا۔ ۱۹۳۸ء میں وزیر خارجہ بنا اور ۱۹۳۹ء میں جرمنی اور روس کے درمیان معاہدہ پر دستخط کئے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ آجکل یہ جرمنی اور برطانیہ کے مابین صلح کی کوشش کر رہا ہے۔

ہیس:۔

اڈولف ہیس۔ بے قلمدان کا وزیر۔ جرمنی اور نازی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر ۲۶ اپریل ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوا۔ جنگ عظیم کے شروع میں اپنی خدمات فوج کو پیش کیں اور پھر لفٹنٹ بنا۔ اس کے بعد ہوائی فوج میں بھرتی ہو کر ۱۹۲۵ء میں نازی پارٹی میں شامل ہوگیا۔ ہٹلر کا ابتدائی حامی ہے۔ ۱۹۳۳ء سے کابینہ کا رکن ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ کے بعد ہٹلر کا دوسرا جانشین مقرر ہوا پھر پراسرار طور پر جرمنی سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر انگلستان کو بھاگ گیا۔ آج کل انگلستان میں نظر بند ہے۔

فان پاپن:۔

پورا نام فرنیز فان پاپن۔ یہ جرمنی کا سابق چانسلر تھا۔ آغاز میں نازی پارٹی کی مخالفت کرتا رہا۔ لیکن بعد میں اس نے ہٹلر سے مل کر کولیشن بنائی۔ جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اس نے ہٹلر کے ماتحت کام کرنا بھی منظور کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود ہٹلر اس سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے اس کو مرعوب کرنے کے لئے اس کے ساتھیوں کو گولی سے اڑا دیا۔ جس سے فان پاپن صد درجہ متاثر ہوا اور صحیح معنوں میں ہٹلر کا وفادار بن گیا۔ مگر ہٹلر جب بھی اس کی ریشہ دوانیوں سے خائف رہا۔ چنانچہ اس نے اس کو ہمیشہ ہی اپنے سے دور رکھا۔ ۱۹۳۹ء میں اسے ترکی میں سفیر مقرر کیا گیا۔ حال ہی میں ترکی نے جب محوری ممالک کے خلاف اعلان جنگ کیا تو یہ بھی جرمنی واپس چلا گیا۔ گذشتہ جنگ میں اس نے امریکنوں کے خلاف بڑی خوفناک اور منظم سازش کی تھی۔ جو معلوم کرلی گئی۔ ۱۴ اپریل کو رہر کے علاقہ میں امریکن فوجیوں نے جرمنی کے اس بوڑھے سیاستدان کو گرفتار کر کے نیو یارک بھیجدیا۔ گرفتاری کے وقت اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ موجودہ جنگ جلد ختم ہو جائے۔"

لی رابرٹ:۔

جرمن نازی رہنما اور جرمن فرنٹ کا لیڈر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں نازی پارٹی میں شامل ہوا۔ ۱۹۳۳ء جرمن لیبر فرنٹ کا رہنما بنا۔ اس کا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے تمام جرمن قوم کو پیداواری مشقت میں مشغول کر دیا۔

نسوانی دنیا

بیداری کی راہ پر

ہندو عورتوں کی نیک مثال

مس زینب شبیر حسین لکھتی ہیں ——

ہندوستان میں اس وقت قومی بیداری کے جو آثار ہویدا ہیں۔ مسلمان خواتین بھی ان سے لاپرواہ نہیں ہیں ہندو عورتوں کی دیکھا دیکھی مسلمان عورتوں میں بھی خدمت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اور وہ چاہتی ہیں کہ میدان علم اور میدان سیاست میں جہاں پہلے مسلمان لڑکیاں نظر نہ آتی تھیں۔ اب حصہ لیں۔ کچھ برس پہلے اگر کہیں شریف عورت کا سایہ بھی نظر آ جاتا تھا۔ تو مرد جھک جاتے تھے اور عورت غیرت سے کٹ مرتی تھی۔ اب اونچے اونچے گھرانے کی عورتیں۔ قومی کانفرنسوں میں حصہ لیتی ہیں۔ کونسلوں میں ڈسٹرکٹ بورڈوں میں جا کر مردوں کے پہلو بہ پہلو قومی خدمت بجا لاتی ہیں خود میری بڑی بہن ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبر ہے۔ اور اب کونسل میں جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ بعض تعلیم یافتہ مستورات کا خیال ہے کہ وہ سرکاری ملازمتوں میں حصہ لیں۔ چنانچہ میری ایک سہیلی نے جو انٹرنس پاس ہے ڈسٹرکٹ جج کی میم صاحبہ سے تعلقات پیدا کئے ہیں۔ اور اس کوشش میں ہے۔ کہ جج میں کوئی ملازمت مل جائے۔

نہ اب پرانے خیال کے لوگ باقی ہیں۔ نہ دیہات کے سوا کہیں پرانی طرز معاشرت باقی ہے۔ قومی خدمت کا جوش ہر زن و مرد کے دل میں ہے۔ وہ پڑا بدبخت سمجھا جاتا ہے۔ جو قومی خدمت نہ بجا لائے۔ زمانہ کی رفتار ہماری ضعیف الاعتقادی سے بدل نہیں سکتی۔ مسلمان عورتوں میں بھی پبلک کی خدمت کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ کافور ہو رہا ہے۔ ہندوستانی مستورات کا یہ مطالبہ ہے۔ کہ جب دوسرے ملکوں میں پردہ نہیں تو ہندوستان کے مسلمان کیوں لکیر کے فقیر بنے رہیں جب مصر اور ترکی کی لڑکیاں قومی خدمت بجا لاتی ہیں۔ تو ہندوستان کی لڑکیاں قومی خدمت سے کیوں محروم رہیں اور قوم کا نصف حصہ ایک عضو معطل بنا رہے۔ ہندو یا مسلم مستورات کی جس قدر کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ سب میں پردہ کی مخالفت کا ریزولیوشن پاس ہوتا ہے۔ اور آزادی نسواں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

مردوں کے اخلاق درست کرو

میری ناچیز رائے میں اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے۔ کہ یا تو یورپین اقوام کی طرح مرد اپنی عورتوں کا احترام کرنا سیکھیں۔ اور وہ بدمعاشی ختم ہو جس کی وجہ سے عورتیں پبلک میں آتے ڈرتی ہیں۔ یا مردوں کو پردہ میں رکھا جائے تاکہ عورتیں آزادی کے ساتھ پبلک کی خدمت بجا لائیں۔ عورتیں صدیوں سے مردوں کی غلامی اور چار دیواری میں بند رہیں۔ اب عورتوں میں بیداری آ گئی ہے۔ ——— اور ان کو اس مطالبہ کا حق ہے۔ کہ اب مرد چار دیواری میں بند رہیں۔ اور عورتیں آزاد ہوں۔ مرد اگر پردہ کرنا شروع کریں اور گھروں کے اندر بیٹھیں۔ تو عورتیں بے کھٹکے قومی خدمت بجا لائیں۔ اور مردوں کو عضو معطل بنا دیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ میری یہ رائے قوم سے شرف قبولیت حاصل کرے گی اور آئندہ کونسلوں میں جو مستورات جائیں گی وہ ایسا قانون پاس کریں گی۔ کہ مرد پردہ نشین ہو جائیں اور عورتیں قومی خدمت بجا لائیں۔

ابھی کیا تماشہ

ایک تعلیم یافتہ بیوی کی فلاسفی درد دل کو

اس پر کم از کم اتنا فائدہ حاصل تھا کہ اُن پر کوئی بوجھ نہ پڑتا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت گھر کے کام کاج کے اپن کر دیتی تھیں اس کمی کے باوجود تعلیم یافتہ بیوی سے بہت کچھ توقع کی جاتی ہے۔ لیکن گھر کی مالکہ بننے کے لئے نہ ہی مشکل امتحانات پاس کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کی ڈگری عورت کو ماں بنا سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ بیوی کے نکتہ نگاہ میں یہ صورت حالات خوشگوار نہیں ہے۔ بعض اوقات اُسے شک گذرتا ہے کہ اُس کے خاوند کی ناراضگی کی تہ میں یہ راز پایا جاتا ہے کہ خاوند اُسے اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ بہت سی تعلیم یافتہ عورتوں کو بدقسمتی سے یہ تلخ تجربہ ہو رہا ہے۔ کہ فیاض اور فراخدل خاوند بھی آہستہ آہستہ قدامت پسند بنتے جاتے ہیں۔

غلط تعلیم

سارا قصور صرف غلط تعلیم کا ہے۔ یہ خراب تعلیم ہی ہے جس کے طفیل عورتیں مردوں سے نفرت کرنے لگ گئی ہیں۔ یا ناقابل اور باعث کشیدگی بیویاں ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں کے حصول پر زیادہ توجہ دینے سے نوجوان عورتوں کے دماغ اصل زندگی کی جدوجہد سے ہٹ کر کتاب پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ پرانے خیال کی پردہ نشین بیوی قدامت پسندی کی انتہا پر پہنچی ہوئی کچھ نا پکا سکتی ہے اور گھر کے کام کی طرف اچھی طرح دھیان دے سکتی ہے اور دوسری طرف اس کی تعلیم یافتہ بہن ہے جو ستار بجا سکتی ہے لیکچر دے سکتی ہے اور موجودہ فیشن کی مادہ گو سے سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ گھر کی مالکہ اور ماتا بننے کا گر نہیں جانتی۔

ہمارا فرض

مگر عورتوں کی آزادی ایک عجیب روِش ہے کسی کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہندوستان کی تعلیم یافتہ عورتوں کی سچی نمائندہ دلیریاں دن بدن زیادہ ہی زیادہ میدان میں آ رہی ہیں۔ وہ دیانتداری سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ اپنی دریافت کردہ آزادی کی اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکیں۔

بہتر گھر بنانے اور اچھی اولاد پیدا کرنے سے جی چرانے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنی علمی قابلیت کا پورا پورا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی پورا کر رہی ہیں۔ لیکن وہ ایک غیر منظم اور منتشر طاقت ہیں۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ اپنی تمدنی سطح کو بلند کرنے اور اپنے مستقل فرائض کی صادق بجا آوری کی کوشش میں اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کا جائزہ لیں۔ ان میں سے ایک اہم فرض اور سب سے ضروری فرض یہ ہے۔ کہ تعلیم نے ان کو جو فوائد بخشے ہیں۔ اُن کو اپنے گھروں کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے استعمال کریں۔ تاکہ اُن کا گر بہت زیادہ باقاعدگی زیادہ زندگی۔ زیادہ زندہ دلی۔ زیادہ شیریں کلامی اور زیادہ روشنی کا مرقع ثابت ہو سکے۔

ہندوستانی عورتوں کے بال سنوارنے کے فیشن

بال اپنی قدرتی حالت میں ہی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر قدیم زمانہ سے مختلف اقوام میں بال سنوارنے کے مختلف فیشن چلے آتے ہیں۔ ہندوستان کی غاروں اور دیگر جگہوں پر تصویریں دیواروں وغیرہ پر قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے یہاں بال سنوارنے کا رواج تھا اس زمانے کی عورتیں بالوں کے متعلق خاص احتیاط کرتی تھیں بالوں میں کئی قسم کے پھول اور سونے چاندی کے زیور لگائے جاتے تھے۔ کئی امیر عورتیں ہیرے اور جواہرات بھی استعمال کرتی تھیں۔ اجنٹا کی غاروں کی دیواروں پر عورتوں کی جو تصاویر ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بالوں کے ایسے فیشن تھے۔ کہ پیرس اور ہالی ووڈ کے ماہر ہیئر ڈریسرز کے فیشنوں کو مات کرتے ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں کا بالوں کو سنوارنے کا فیشن بالکل سادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں اب یہ خیال کرتی ہیں کہ قدرتی طریقہ بہت اچھا ہے۔

عورتیں کیوں زیادہ باتیں کرتی ہیں؟

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں

ایک طرف تو ایک ناخواندہ ...

کی نسبت زیادہ باتیں کرتی ہیں۔ واشنگٹن کے ڈاکٹر ہارڈ میکا نے کئی تجربوں کے بعد یہ معلوم کیا ہے۔ کہ اُس کی یہ وجہ ہے۔ کہ اگر قد برابر ہو۔ تو عورتوں کا منہ مردوں کی نسبت چوڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہارڈ میکا نے کئی سفید "حبشی" ہندوستانی اور اسکیمو عورتوں کے چہروں کا معائنہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں

ایک عورت جو کبھی نہیں ڈوبتی

گینی از مینو ساوھ ریلیز کی مسز الیبا پارکر خواہ کتنا گہرا یا تیز پانی ہو۔ ہرگز نہیں ڈوب سکتی۔ اس کا وزن مخصوص پانی سے بہت کم ہے۔ اس نے تیراکی کا ایک مظاہرہ کیا جس سے وہ پانی پر لیٹ گئی۔ اس حالت میں نا ول پڑھتی رہی اور ادھر اُدھر لڑھکتی رہی۔ جب پانی میں لہریں اٹھنے لگیں تو وہ بھی کارک کی طرح اوپر نیچے اٹھنے لگی۔ وہ پاؤں بالکل نہیں ہلاتی اور پانی کی سطح پر چت لیٹ رہتی ہے۔ پانی خواہ بالکل صاف ہو یا نمکین یہ عورت ڈوبتی نہیں۔ ڈاکٹروں کو ابھی تک پتہ نہیں لگ سکا۔ کہ اس کا وزن پانی کے وزن سے کیوں کم ہے۔

عورت کیا ہے؟

عورت ایک مدبّر وزیر اعظم ہے جو ہر ایک کام میں بادشاہ (خاوند) کو صلاح اور صائب مشورہ دیتی ہے۔

عورت ایک مشیر مال ہے۔ جو روپیہ پیسہ کے خرچ میں عقل اور دانش اور کفایت شعاری سے کام لیتی ہے

عورت ایک پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو ہر کام میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

عورت ایک استاد ہے جو اپنے شیریں۔ خوشگوار اور غیر محسوس طریقوں سے اپنی اولاد اور اپنے خاوند کو دنیا کے قیمتی سبق پڑھاتی ہے۔

عورت ایک مخلص دوست ہے۔ جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی وفاداری کے پاک و مقدس عہد پر کاربند رہتی ہے۔

عورت ایک وفادار خادم ہے جو اپنے گھر میں ذلیل سے ذلیل خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے

عورت ایک رُوح ہے جو ہر مردہ چیز میں زندگی پیدا کر دیتی ہے

عورت ایک پھول ہے۔ جس کی معصوم پتیوں میں محبت کی سینکڑوں دنیائیں آباد ہیں

عورت سازِ قدرت کا ایک شیریں نغمہ ہے۔ جس کے دم سے کائنات کی رونق قائم ہے۔

عورت قدرت کی حسین ترین شاعری ہے۔ جس میں بے لوث محبت، پر خلوص عقیدت اور نکھری ہوئی سیرت کی لطیف شعریت ہے۔ جو بلاشبہ ملائک فریب اور راہزنِ تمکین و ہوش ہے۔

پریم جیون

نشاط کشتواڑی

باپ کا خط بیٹے کے نام

اے مرے لختِ جگر نورِ نظر — جانِ مادر راحتِ جانِ پدر!

آنکھ کے تارے سدا جیتے رہو — گلشنِ ہستی میں تم پھولو پھلو

دور بیٹھا ہوں وطن سے اے پسر — حال سے بھی ہوں تمہارے بے خبر

خط نہیں بیٹا کوئی تم نے لکھا — ہو رہا ہے دل مرا بے چین سا!

ہاں تمہاری اک شکایت آ گئی! — جس سے میرے دل پہ حسرت چھا گئی

یعنی کچھ تعلیم سے غافل ہو تم — اور لہو و لعب پہ مائل ہو تم!!

یہ تمہارے واسطے اچھا نہیں — آدمی زادوں کو یہ زیبا نہیں

ہے تمہیں لازم یہی اے جانِ من! — شوق سے حاصل کرو تم علم و فن

علم سے تم سربلندی پاؤ گے — رہنما و راہبر کہلاؤ گے!

علم کا جلتا ہے سینے میں چراغ — آدمی ہوتا ہے پھر روشن دماغ

ہے نہاں تعلیم میں رازِ حیات — ہے یہی روحِ نظامِ کائنات

پائے استقلال کو جنبش نہ ہو — ہمت و جرأت سے تم آگے بڑھو

خدمتِ عالم سے رکھو صرف کام — دہر میں بیٹا بنو تم نیک نام

مدعا جو کچھ تھا وہ بتلا دیا — یعنی خط میں نیک و بد سمجھا دیا

ہے عمل کرنے پہ تم کو اختیار — ہر عمل کا ہے نتیجہ آشکار

سب عزیزوں اور سب احباب کو — میری تسلیم و دعا سب کو کہو!

اور اس خط کا بھی اے بیٹا شتاب — پاس میرے بھیجو لکھ کر جواب

نشاط کشتواڑی

باپ کے خط کا جواب

اے جناب محترم اے قبلہ گاہ
تحفۂ تسلیم ہو میرا قبول
کل مجھے جو نامۂ دالا ملا !!!

خط نہیں تھا بلکہ تفسیرِ حیات
آپ شفقت سے ہے وہ لکھا گیا
میں نے اُس خط کو پڑھا ہے بار بار

چشمِ شفقت آپ کی قائم رہے
ہاں شکایت جس کا خط میں ذکر تھا
کر رہا ہوں غلطیوں کا اعتراف

اب مجھے تعلیم ہی کا شوق ہے
قسبز جو کچھ آپ کا فرمان ہو
خدمت عالی میں ہے یہ التجا

تاکہ میری مشکلیں آسان ہوں
ہاں سبھی احباب خویش و اقربا
مادرِ مشفق بھی میری شاد ہے

پیاری اماں کا میں خدمت گار ہوں
اپنے استادوں کا کرتا ہوں ادب
آپ کی خدمت میں کہتے ہیں سلام

آپ کی آمد کا ہے اب انتظار

اے مرے محسن مرے شفقت پناہ
ہدیۂ تعظیم ہو میرا قبول !
اس کا آنکھوں نے مری بوسہ لیا

جس سے پلٹی میرے دل کی کائنات
جس میں جوہر موتیوں کا ہے ملا !
اور عمل سے بھی ہوا ہوں ہمکنار

مجھ پہ سایہ آپ کا دائم رہے
تھی کسی حد تک وہ اے قبلہ بجا
ہو خطا یہ میری اے قبلہ معاف !

رات دن مجھ کو اسی کا ذوق ہے
کیوں فدا اس پر نہ میری جان ہو
کیجئے کچھ مجھ کو نقد زر عطا !

اور بے فکری سے میں لکھوں پڑھوں
شادماں ہیں اور کرتے ہیں دعا
اس کے قدموں سے یہ گھر آباد ہے

آپ کا بھی ایک تابعدار ہوں
مجھ سے راضی ہیں میرے بھائی سب !
خویش و احباب اور ہمسائے تمام

تا ہمارا گلستاں ہو پُر بہار

پریم مجنوں

روسی سائنسدان

روسی سائنسدان اپنے تجربہ میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ کچھ مدت اور انسان اور حیوان کو دُور دُور رکھنے کی تمنائی تھی۔ اسے شدہ وہ انقلاب نہ ہو سکا جو اس نے تجربوں کا لازمی نتیجہ تھا۔ سائنسدان اپنی لیبارٹری میں بند رہتا۔ کئی کئی ہفتے وہ باہر نکلنے کا نام نہ لیتا۔ اس نے باہر کی دنیا سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی ہے۔ ایک دن ڈاک میں اس نے بیوی کا خط دیکھا۔ اسے کوئی حیرانگی نہ ہوئی۔ قلم دوات اٹھائی اور سلیقہ بیوی کو طلاق کے لئے شکریہ کا خط لکھ دیا۔ اور اس کے نئے خاوند کو شادی پر مبارکباد دی اور امید ظاہر کی کہ وہ کبھی روز ان سے ملنے آئے گا۔ اُسے اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ طلاق کی وجہ پر ہی غور کر سکے۔

لیبارٹری کے باہر سائنسدان کا اسسٹنٹ ڈاکٹر بیٹھا رہتا تھا۔ کسی شخص کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ پولیس ڈاکٹر کو پریشان کرتی۔ کہ سائنسدان اندر کیا کر رہا ہے۔ اور وہ یقین دلاتا کہ یقیناً وہ بم تیار نہیں کر رہا ہے۔

سائنسدان اندر کیا کر رہا تھا؛ مختلف قسم کے مرکبات سے وہ دوائیاں تیار کرتا اور پھر انہیں زمین پر پھینک دیتا۔ ڈاکٹر ہر روز نئی نئی چیزیں بازار سے خریدتے تنگ آگیا تھا کہ وہ کیا نسخہ تیار کر رہا تھا۔ لیبارٹری کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا اصطبل تھا۔ جس میں ایک ہاتھی ریچھ اور ریچھنی اور ایک بندر اور ایک بندریا تھی۔

ایک صبح ڈاکٹر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ سائنسدان نے آواز دی ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بھاگا بھاگا اندر گیا۔ سائنسدان ہاتھ میں کوئی چیز لئے کھڑا تھا۔ اس کا چہرا چمک رہا تھا۔ اس نے کہا یہ دوائی تمام جانوروں کو پلا دو ـــ اور دن بھر ان کی نگرانی کرو ـــ اگر وہ کوئی غیر معمولی حرکت کریں تو مجھے فوراً اطلاع دو۔

ڈاکٹر نے وہ تمام دوائی تمام جانوروں کو پلا دی اور خود کرسی پر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ۔ آدھ گھنٹہ۔ گھنٹہ۔ دو گھنٹے، وقت گذرتا چلا گیا۔ لیکن ہاتھی۔ ریچھ اور بندر اسی طرح رہے۔ سائنسدان کو ڈاکٹر پر شاید اعتبار نہ تھا وہ خود بار بار اپنے کمرے سے نکل کر جانوروں کے پاس جا کر دیکھتا اور پھر واپس چلا آتا۔

دوسرے دن سائنسدان نے دوگنی مقدار میں دوائی دی اور ڈاکٹر کو تمام دن جانوروں کے پاس بیٹھنا پڑا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سائنسدان پاگلوں کی طرح کبھی اندر آتا اور کبھی باہر جاتا۔

تیسرے دن سائنسدان نے پھر دوائی کی ایک شیشی ڈاکٹر کے حوالے کر دی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ سائنسدان باقی ماندہ دوائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیران تھا۔ کہ اس میں کیا نقص رہ گیا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اپنی زندگی کے مقصد میں فیل ہو چکا تھا۔ اس کا تجربہ ناکام رہا تھا۔ اس نے دوائی منہ سے لگائی اور غٹ غٹ کر کے پی گیا۔

ڈاکٹر روز روز کی نگرانی سے تنگ آگیا تھا۔ وہ سمجھا تھا

سائنسدان دنیا بھر میں انقلاب نہ کر سکا تھا جتنا کہ ڈاکٹر کو خود بھی یہ معلوم نہ تھا

نہ سائنسدان پاگل نہیں ہے۔ لیکن اسے تو اپنی تنخواہ سے غرض تھی۔ اس نے دوائی پلائی اور آرام کرسی پر جانوروں کے نزدیک لیٹ گیا وہ کچھ غنودگی کی حالت میں تھا۔ کہ اس نے آواز سنی جیسے اسے کوئی بلا رہا ہو ــــ آنکھیں کھول کر باہر کی طرف دیکھا۔ دوسرا کوئی نہ تھا۔ وہ پھر کرسی پر دراز ہوگیا۔ لیکن اب کی آواز زیادہ واضح اور کرخت تھی۔ اس نے سنا کوئی کہہ رہا ہے۔ ڈاکٹر اٹھو ہمیں بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ اس کی حیرانگی فوراً دور ہوگئی۔ جب ہاتھی نے زور سے کہا دیکھتے کیا ہو۔ اٹھو کھانے کو کچھ لاؤ ورنہ تجھ کو مار نکال دوں گا۔

ڈاکٹر پاگلوں کی طرح اٹھ بیٹھا اور بھاگا سائنسدان کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار ٹھوکریں کھا کر زمین پر گرا کمرے کے دروازے کھول کر ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

وہاں اور ہی منظر تھا۔ سائنسدان فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے منہ اور نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا اور دوا کی خالی شیشی بھی پاس ہی پڑی تھی اور ادھر اصطبل سے متواتر آوازیں آ رہی تھیں۔ ہاتھی بندر ریچھ شور مچا رہے تھے کہ ہمیں کھانے کو دو۔ ورنہ کسی کی بھی جان کی خیر نہیں۔

دم زدن میں تمام سرکردہ سرکاری افسر پولیس اور سائنسدان وہاں پہنچ گئے۔ بجلی کی طرح یہ خبر ملک بھر میں پھیل گئی اور لوگوں کے ہجوم کو روکنے کے لئے خاص انتظامات کی ضرورت پڑی۔ سائنسدانوں نے جانوروں کی نگرانی شروع کر دی۔ ان کو پیٹ بھر کھانے کو دیا۔ اس سے پہلے وہ جتنا کھاتے تھے۔ اب اس سے کئی گنا بھی زیادہ کھا کر شکایت کرتے۔ کہ ابھی بھوک نہیں گئی۔ ریچھ اور بھینس مقابلتاً خاموش تھے۔ بندر اور بندریا سارا دن بالوں کو کنگھی کرتے رہتے اور سائنسدانوں سے پوچھتے کہ کیا ہم زیادہ خوبصورت ہو گئے ہیں۔

ہاتھی کی ڈکٹیٹرشپ نے سائنسدانوں کو پریشان کر دیا۔ اس نے نوکروں اور سائنسدانوں پر زبردست جھاڑ ڈالی اور کہا۔ تم چھوٹے چھوٹے لوگ جسم پر کپڑے کیوں پہنتے ہو۔ میری طرف دیکھو کوئی کپڑا نہیں پہنتا۔ سائنسدانوں نے کہا تمہارے لئے بھی کپڑے تیار کئے جائیں گے۔ لیکن ہاتھی نے کہا کہ نہیں تمہیں میری طرح کپڑے اتار کر رہنا پڑے گا۔ اس کا یہ مطالبہ دھمکی کی صورت اختیار کر گیا۔ غرضیکہ نوکر اور سائنسدان اس کے پاس جاتے تو بالکل ننگے ہو کر۔

ہاتھی نے دوسرا مطالبہ کیا۔ کہ میری دم کاٹ دی جائے لیکن اس طرح کہ بالکل تکلیف نہ ہو۔ اور اگلی دو ٹانگیں کاٹ دی جائیں کیونکہ میں بھی انسان کی طرح چلنا چاہتا ہوں۔ پہلا مطالبہ تو پورا کر دیا گیا۔ اس کی دم کاٹ دی گئی۔ اپریشن بغیر تکلیف کے ہوگیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد درد شروع ہوا۔ سائنسدانوں نے دانستہ ایسا کیا۔ جب اس سے پوچھا گیا۔ ٹانگیں بھی کاٹ دی جائیں تو اس نے جواب دیا نہیں۔ اب میں اپریشن نہیں کراؤں گا بہت تکلیف ہوتی ہے۔

ہاتھی نے تیسرا مطالبہ پیش کیا کہ میں اس غلیظ مکان میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے ایسی جگہ رکھو جہاں روشنی اور صفائی کا بہترین انتظام ہو۔ اگر تم ہمارے لئے رہائش کا انتظام نہیں کر سکتے تو ہمیں جنگل میں چھوڑ دو ــــ آخر اسی روز تمام جانوروں کو کھلی جگہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ریچھ اور بندر خاموش تھے۔ لیکن ہاتھی کے مطالبات بڑھ رہے تھے۔

سرکاری اعلانات کے ذریعہ جانوروں کی حالت سے لوگوں کو باخبر رکھا جاتا تھا۔ ایک دن ہاتھی نے کہا میرا اکیلے دل نہیں لگتا۔ میرے لئے بیوی لاؤ۔ چنانچہ ایک ہتھنی لائی گئی۔ لیکن ہاتھی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کہ یہ بالکل غیر مہذب ہے۔ اسے بولنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اسے ہمارے پہلے مکان میں رکھو۔ میں اس کے پاس کبھی کبھی ہو آیا کروں گا۔ ہاتھی کو یقین دلایا گیا کہ ایشیا سے خوبصورت ہتھنی اس کے ساتھ شادی کرنے کیلئے روانہ ہو رہی ہے۔

بدیع محبوب　　　　سیالکوٹ سٹی ۲

کئی دن کے بعد سائنسدان نے آنکھیں کھولیں لیکن اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ پچھلی باتیں بھول گیا تھا۔ یہ سے اپنا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح خود بخود باتیں کر رہا تھا۔ تیمارداری کرنے والے ڈاکٹروں نے قرار دیا کہ اس کا دماغ کبھی درست نہ ہو گا۔

ایک دن صبح سائنسدانوں نے دیکھا کہ ہاتھی وہ پہلا ہاتھی اور ریچھ وہی پہلا ریچھ، بندر وہی پہلا بندر بن گئے ہیں ان کی بولنے اور سمجھنے کی طاقت جا چکی تھی۔ دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔

اسی طرح یہ دنیا کا نہایت ہنگامہ خیز تجربہ کامیاب ہو کر بھی فیل ہو گیا۔　　　(ترجمہ)

ایک دلچسپ کہانی

ملت جوئی۔ سالو اور میراں دو بہن بھائی سمندر کے کنارے رہا کرتے تھے۔ دونوں مچھلیاں پکڑتے اور بیچ کر گزارہ کرتے۔ لیکن تھے بڑے لالچی

سالو مچھلیاں پکڑنے میں ماہر ہونے کے علاوہ گاتا بھی خوب تھا۔ اس کی آواز نہایت رسیلی تھی اور اس میں غضب کا لوچ تھا۔ جب وہ گاتا تو اڑتے ہوئے پرندے رک جاتے اور دریا کا پانی تھم جاتا۔

ایک دن وہ مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ میراں کشتی چلا رہی تھی۔ سالو جال پھینک کر جی بہلانے کو گا رہا تھا۔ کہ اچانک ایک نہایت خوبصورت مچھلی جس کے سنہری پر نہایت خوشنما معلوم دیتے تھے۔ پانی سے ابھری اور ایک اشرفی کشتی میں اگل گئی۔ دراصل یہ مچھلی نہیں تھی۔ بلکہ ایک پری تھی۔ جو مچھلی کے روپ میں سمندر میں رہا کرتی تھی اور وہ گانے سے خوش ہو کر سالو کو انعام دے گئی تھی۔ دونوں بہن بھائی بہت خوش ہوئے۔ اور اشرفی گھر لے آئے۔ اب سالو ہر روز اسی طرح گاتا اور وہ مچھلی اسی طرح اشرفی پھینک دیتی۔ ایک دن دونوں نے صلاح کی۔ کہ کیوں نہ اس مچھلی کو پکڑ کر اس کے پیٹ سے ساری اشرفیاں ایک ہی دفعہ نکال لیں۔ اور اس طرح ہم خوب امیر ہو جائیں۔

چنانچہ دوسرے دن مچھلی آئی تو انہوں نے پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ جادو کے زور سے غائب ہو گئی۔ اس پر انہیں بہت رنج ہوا۔ دوسرے دن وہ پھر آئے۔ سالو نے اسی طرح گایا۔ میراں اسی طرح کشتی چلا رہی تھی۔ مچھلی بھی اسی طرح آئی۔ لیکن اب وہ بھیانک صورت میں ایک خوفناک انتقام لینے کے لئے کشتی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

پریم

جولائی
۱۹۴۵

فن کار

کشن سمدابوری

کیف اسرائیلی	اخگر عسکری
محمد بشیر	رعنا نظامی
دولت رام گپت	عزیز کاش

رسا جاودانی

آٹھ آنے

مکتبہ چاند جموں

ایڈیٹرز
گلزار احمد فدا۔ ادیب فاضل
اقبال تمنائی
چندہ سالانہ۔ پانچ روپے

رسالہ "پریم" جموں

جولائی ۱۹۴۵ء
جلد نمبر ۲ — شمارہ نمبر ۳

لاہور آفس
گورو ارجن نگر لاہور
مہتمم:- ناگر مل مہاجن
فی پرچہ:- آٹھ آنے

پریم رس

(دیوان گیان چند پرنٹر پبلشر نے دیوان پریس جموں سے چھپوا کر دفتر "پریم" سے شائع کیا)

ادارہ

پریم کہانی

"پریم" آپ کے سامنے ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا اور ان سے متعلق ہمیں مفید مشوروں سے نوازنا قارئین اور ادبائے کرام کا کام ہے۔ ہم نے پرچہ کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ، معلوماتی، صحیح ادبی معیار کے مطابق ادبا ہیں ذوق کے سامنے پیش کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہمیشہ سرگرم عمل رہے گی لیکن اس حد تک [illegible] ہمیں ایک طرح کی کوفت ہوتی ہے کہ ریاستی فنکاروں کا تعاون ہمیں تسلی بخش حد تک میسر نہیں۔

"پریم" کا مقصد جو آپ کی وضاحت کا [illegible] ہے حیرت ہے کہ اس کو جاننے کے باوجود ریاستی فنکاروں کے ادبی خیالات اور علمی رجحانات میں تحریک نہیں [illegible] انہیں رسالوں میں حرارت پیدا نہیں ہوئی اور خوشی سے باچھیں نہیں کھل گئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مضامین کے اعتبار سے "پریم" [illegible] ہے۔ اگر ریاستی فنکاروں نے پورا پورا تعاون نہ کیا۔ تو "پریم" میں بیرون ریاست کے ادبا و شعرا کے مضامین کی اشاعت شروع ہو جائے گی ہمیں باہر کے اچھا لکھنے والوں نے چند مضامین ارسال کئے ہیں۔ ہم اس ضمن میں ان کے شکرگزار ہیں۔ اور خوش ہیں کہ [illegible] یہ کوششیں اپنے میں اتنی جاذبیت اور کشش ضرور رکھتی ہیں کہ جس سے اچھے لکھنے والوں کی توجہ خود بخود اس طرف منعطف ہو سکے ــــ ریاستی فنکاروں کو ہم کس درجہ محترم اور لائق عزت سمجھتے ہیں اس کا اندازہ آپ "ریاستی فنکار" کے مطالعہ سے بخوبی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد یقیناً آپ پر ریاستی فنکاروں سے متعلق ہماری محبت و عقیدت واضح ہو جائے گی۔ اور ہمارے ان جذبات کا بھی پتہ چل جائے گا جو ریاستی فنکاروں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ہر لمحہ بے قرار رہتے ہیں ــــ اب بھی اگر ریاستی ادبا و شعرا کی حمیت نے کوئی خوشگوار کروٹ نہ لی اور ادبی خدمت کے لطیف ارادوں میں ہیجان پیدا نہ ہوا۔ تو یہ امر یقیناً افسوسناک ہوگا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں۔ کہ ریاستی فنکاروں کے نزدیک ہماری کوششیں کوئی قیمت ہی نہیں رکھتیں۔ "پریم" کی خوبیوں اور ہماری کوششوں کے بارے میں ریاست کے کونے کونے سے جو توصیفی خطوط موصول ہو رہے ہیں وہ ہماری تسکین کے بہترین ذرائع ہیں کبھی آئندہ اشاعت میں چند خطوط شائع کئے جائیں گے۔ اس دفعہ حضرت اثر لکھنوی اور پنڈت پریم ناتھ پردیسی کے دو خصوصی شذرے شائع ہو رہے ہیں۔ قارئین ان کے مطالعے سے یقیناً محظوظ ہوں گے اور اس لئے بھی خوش ہوں گے کہ قدیم و جدید ادب کے اتحاد کی علمبرداری کا دعوےٰ جو "پریم" نے اپنی نئی زندگی کے آغاز میں کیا تھا۔ وہ مبنی بر حقیقت ہے کہ جس میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ علاوہ ازیں اس شمارہ میں بشیر صاحب کا مقالہ "غزل کی تدریجی ترقی" بھی بالفعل ادب قدیم کی حمایت میں ہے لیکن آئندہ اشاعت میں جب اس کی تکمیل ہو جائے گی تو آپ حیران ہوں گے کہ وہ ادب جدید کی اعانت کا علم بھی اٹھائے ہوگا۔ نرگس صاحب کا ڈرامہ "تعارف" کالج کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے مغربی تہذیب نے ہمارے نوجوانوں کو علمی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے جس بری طرح مفلوج اور زخمی کر دیا ہے۔ نرگس صاحب نے ان ہی زخموں کو ہمارے سامنے رکھا ہے جن کا علاج کرنا ہم سب کا فرض ہے ــــ [illegible] مہجور کا افسانہ "الفت رفتہ" دو دھڑکتے دلوں کے طویل فراق کا منظر پیش کرتا ہے ایک ایسا منظر جو رومان کی انوکھی دنیا میں بسا رہا ہے۔ [illegible] عزیز کا ڈرامہ "نوشتۂ تقدیر" ایک شریف اور مہذب خاندان کی داخلی تصویر ہے جو انتہائی دلچسپ اور اخلاق آموز ہے۔ عبدالعزیز علائی کی "طوطیا بیگم" اور دولت رام گپت کا "پردیسی پریتم" دونوں کس پایہ کی چیزیں ہیں؟ بہتر ہے کہ اس کا فیصلہ آپ پر
۱ غزلیں اور منظومات کی عمدگی اور ندرت کو بھی ہم آپ کے فیصلہ پر چھوڑتے ہیں۔

از جناب محترم
اثر لکھنوی

ادبِ قدیم

جناب اثر لکھنوی اور مسٹر پرویزی کے دو خطوط موصول ہوئے ہیں۔ پہلا ادب قدیم کی تعریف میں ہے اور دوسرا ادب جدید کی توصیف میں۔ ہم تصویر کے یہ دونوں رخ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ پریم کے پڑھنے والوں کی ادبی تشنگی زیر نظر خطوط کے مطالعہ سے بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ — مدیر

سری نگر، کشمیر
۲۵ جون ۱۹۶۰ء

مکرمی! تسلیم

رسالہ "پریم" کا تازہ نمبر ملا۔ شکریہ۔ "پریم" حیرت انگیز ترقی کر رہا ہے۔ شاید وہ دن دور نہیں کہ اس کا شمار ملک کے متوقر جرائد میں ہو۔ آپ کا مضمون "..." بہت خوب ہے۔ مگر آپ نے قدیم ادب کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کیا ہوتا تو انداز بیان مختلف ہوتا۔ یہ تسلیم کہ نئے ادب کی طرح قدیم ادب بھی نقائص سے پاک نہیں مگر آپ کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ "غدر سے پہلے ہندوستان ایک طرح کی پرسکون اور بے ضرر زندگی بسر کر رہا تھا اور مغلیہ معاشرت اور تمدن میں خاص قسم کی آسودگی اور آرام تھا۔"

میر کے ان اشعار کی صداقت کی تاریخ شاہد ہے اور یہ غدر سے پہلے کی باتیں ہیں:۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

سودا کا شہر آشوب اور میر کی متعدد نظمیں ہیں جس میں انہوں نے زمانے کی "شریف گردی" اور "ہمہ پری وقت" کے حالات درج کیے ہیں۔

"آپ کا خیال ہے کہ اس وقت ہندوستانی دل فرقہ وارانہ منافرت سے پاک و صاف تھے، تعصب تھا لیکن تشویشناک اور نقصان دہ عناصر کا اس میں شائبہ نہ تھا" سنیے:

مسلمہ کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
دشمن ہو لوگ میں کرنی رہنگی کٹتے ہیں سگے سر کے سر (میر)

آپ نے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "اسی وجہ سے اس وقت کا ادب محض حسین اور رنگین تھا جس میں زندگی نہ تھی، حرکت نہ تھی، جوش نہ تھا۔ گل و بلبل کے قصے، شیریں فرہاد کے افسانے، ہجر و وصال کے نغمے اور زلف و کاکل کے قصیدے ضرور تھے۔"

معاف فرمایئے اس عہد کے ادب میں حسن و جمال کے علاوہ اور بہت کچھ تھا۔ بشرطیکہ زندگی مراد ہے مستقل قدروں اور ابدی حقیقتوں اور ان کی تعبیر و تفسیر سے۔ کیا حسن و عشق ان حقائق سے خارج ہیں، کیا حسن میں کشش اور عشق میں جذب نہیں، کیا زندگی کے ضمن میں حرکت کے معنی جذب و کشش کے ماسوا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا حسن بغیر صداقت کے ممکن ہے۔ کیا صداقت حقیقت نہیں، کیا عشق تلاش حقیقت و صداقت کا دوسرا نام نہیں، کیا حسن و عشق ایک ہی حقیقت کے دو رخ نہیں؟

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں (میر)

البتہ اگر ادب محض بھوک اور جنسی خواہشات کے طوفان کا نام ہے تو میں خاموش ہوں۔

قدیم ادب میں جوش کی بھی کمی نہ تھی

[illegible] ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں [illegible] ہم ہیں

مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

[illegible] مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

[illegible] ہستی ہے اپنے طور پہ جولاں بحر جوش میں

گرداب کیسا موج کہاں [illegible] حباب کیا

[illegible] گل کا ثبات

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا

[illegible] ہے

[illegible] جوش مستی ہے

آپ گل و بلبل کے افسانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں — حالانکہ یہ بعض [illegible] ہیں جن کے پردے میں [illegible] حکم بیان کئے جاتے ہیں۔

[illegible] بلبل اور گل پہ تو [illegible] سے آنکھ کھول

گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر

[illegible] نشان ہے کسو خوش زبان کا

یہی راز شیریں فرہاد اور لیلےٰ مجنوں کے قصوں میں مضمر ہے۔ اور یہی شمع و پروانہ کی سرگذشت ہے، ایک یادگار حسن، ایک یادگار عشق، اور حسن و عشق کی دنیا وسیع سے وسیع تر دنیا سے عالم میں پھیل رہا ہے عشق۔ [illegible] جو محض ہوس پرستی اور نفس کی آگ بجھانے تک محدود نہیں۔ جس میں جنس لطیف کو بدکاری پر ابھارنے کا اغوا نہیں۔ کیا تماشا ہے کہ ایک طرف تو "اشاریت" کو سراہا جاتا ہے مگر دوسری طرف یہی اشاریت ادب قدیم میں ملتی ہے تو نامطبوع ٹھہرتی ہے یا اس کی "اشاریت" سے ہی انکار کیا جاتا ہے۔

اب آئیے زندگی کے ٹھوس مسائل کی طرف۔

میرے [illegible] مکان و منزل اکیلوں کو سب جگہ ہے

اکیلوں کو جا نہیں ہے، دنیا عجب جگہ ہے

[illegible] ظلم نے کہ اس کی خبر بس شتاب ہے

آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی

[illegible] ہے اگر شمشیر سروں پر منہ موڑیں نہ نہیں

سیدھے جانے والے ادھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

البتہ اس زمانے میں پروپیگنڈا کا رواج نہ تھا۔ نہ امیر اور متوسط طبقے کی باہمی آویزش تھی۔ بلکہ متوسط طبقے کا وجود ہی نہ تھا۔ جو مزدور اور کسان کو اپنا آلۂ کار بناتا اور ان کی آڑ میں اور ان کے نام پر قوت و اقتدار حاصل کرنے کی سعی کرتا۔ اصل یہ ہے کہ نئے اور پرانے ادب کی تفریق سراسر بے جا ہے، ادب اگر صحیح معنوں میں ادب ہے تو باوصف قدیم ہونے کے تازہ ہے اگر "ادب" نہیں تو جدید ہونے کے بھی مکروہ اور متعفن، لائق صد نفرین ہے۔ پہلے طے کیجئے کہ ادب کیا ہے۔ پھر یہ کہ اس کا مقصود بالذات افادیت ہونا چاہیئے یا انشراح قلب و دماغ۔ اس کو اصلاح کا آلۂ کار راست بنانا چاہیئے۔ یا طبائع میں ایسا انقلاب پیدا کر دے کہ خیالات کی شگفتگی و شیفتگی کثافتوں سے یکسر کنارہ کش ہو جائے اور پاکیزہ فضا و ماحول کی متلاشی رہے۔

غرض یہی ادب جو چل رہا ہے، کہیں بدلتا ہے یوں زمانہ

خیال تحریک ہے عمل کی، خیال میں انقلاب کر دے (راقم)

خیر اندیش آثر

رُونما خاک کے پردے سے ہوا ہے لالہ

لالۂ رخسار کو کب رسم حجاب اچھی ہے!

عمادالدین سوز

پریم ناتھ پردیسی

ادبِ جدید

ڈیئر گلزار ——— تسلیم

تمہاری چٹھی ملی۔ اس سے قبل ماہنامہ پریم بھی موصول ہو چکا ہے۔ شکریہ!

پریم کو میں نے فرصت کے لمحوں میں بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا۔ یہ ایک کامیاب کوشش ہے خصوصاً ریاستی ادب کی ترجمانی اور ملکی ادبا تک پہنچنے کے لئے جس کی ہم ایک مدت سے آرزو رکھتے تھے۔ شمارہ زیر نظر میں جہاں محاسن ہیں وہاں کچھ معائب بھی ہیں۔ پھر محاسن زیادہ ہیں اور معائب کم۔ لیکن کیا محنت اور توجہ سے اسے سراسر مجموعۂ محاسن نہیں بنایا جا سکتا؟ یہ میرا خیال ہے کہ بنایا جا سکتا ہے جب ہمارا مقصد خدمتِ ادب ہو۔ ہمارے دلوں میں ہمت ہو اور عمل میں جوش!

میں نہ نقاد ہوں نہ تبصرہ نگار، لیکن تمہاری خواہش کے مطابق ہر مضمون پر اپنے ذاتی خیالات ظاہر کروں گا۔ اس سے تم استفادہ تو نہیں کر سکتے البتہ میرے مذاق کو پرکھ سکتے ہو۔

سب سے پہلے ٹائیٹل آتا ہے۔ اس پر جو فہرست دی گئی ہے اس میں ان فنکاروں کا اندراج ہی نہیں جو ہمارے اور ہمارے ادب کے لئے باعثِ افتخار ہیں مثلاً اثر صہبائی۔ آتش لکھنوی، کشن سمیل پوری، کنبھن اسرائیلی وغیرہ۔ کیا یہ فنکار نہیں ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ٹائیٹل پر تمام نام نہیں آ سکتے۔ لیکن ادب میں جن لوگوں نے اپنا مقام پیدا کیا ہے وہ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ دکاندار اپنے گاہک کو ہمیشہ اچھی چیز کا نمونہ دکھاتا ہے۔ اور ٹائیٹل پر چیدہ چیدہ فنکاروں کے نام لکھنے میں یہی بھید پنہاں رہتا ہے کہ پڑھنے والا محض ایک نظر میں مجلسِ ادارت کے ذوقِ انتخاب اور حسنِ مذاق کا کچھ اندازہ لگا سکے۔

دوسرے ٹائیٹل پر مہینے کا نام نہیں لکھا گیا۔ جو بہت ضروری ہے

اس کے بعد اقبال متنائی کی پریم کہانی ہے یا بصورت دیگر پریم کے نصب العین کی وضاحت۔ اس میں ریاستی ادب اور ریاستی فنکاروں کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ خصوصاً اس وقت جب پریم ان کے تمام سچے جذبات اور دماغی کاوشوں کے نتائج کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس خلا کو پُر کرے گا جسے ریاستی ادیب بیرونِ ریاست کے ادبی رسالوں اور جریدوں کو دیکھ کر محسوس کرتے تھے اور بے بسی کے عالم میں ملکی رسالوں کی طرف دیکھتے تھے اور مایوس ہو جاتے تھے۔ آگے چل کر اقبال نے یہ کہا ہے کہ پریم نئے اور پرانے ادب کا یکساں طور پر احترام کرے گا۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ آدمی بیک وقت دو کشتیوں میں سوار نہیں ہو سکتا۔ اسے یا تو پرانے ادب (بقول آپ کے) کا ترجمان بننا پڑے گا یا نئے ادب کا۔ جو پرانے ادب ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے اور جو مذاق اور ماحول کی تبدیلی کے سبب پیدا ہوئی۔ بھلا کبھی ہم اب پرانے ادب کو اپنا رہنما نہیں بنا سکتے اس سے صرف استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسے DIS OWN نہیں کر سکتے۔ اس سے گذری ہوئی تہذیب اور گذرے ہوئے مذاق و ماحول کا اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن اس کی رہبری قبول نہیں کر سکتے۔ موجودہ عوامی جنگ سے زندگی کے نظریے بدل گئے ہیں معاشرت اور سیاست کے فلسفے بدل گئے ہیں۔ دنیا دو کیمپوں میں بٹ گئی ہے۔ فسطائیت اور جمہوریت۔ اگر ہم سچے ترقی پسند ہیں تو ہم فسطائیت کی حمایت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ نسلی امتیاز اور طبقاتی کش مکش کو جائز قرار دیتی ہے اور ماضی ہی کو اپنا رہنما سمجھتی ہے جو اجتماعی ارتقاء کے خلاف ہے۔ اور ترقی تہذیب و انسان کے منافی۔ تم کہو گے ہم پرانے ادب کا احترام کریں گے۔ لیکن احترام سے

نظارا کیا مطلب ہے۔ عوام میں موجودہ جنگ کے سبب جو سیاسی
شعور پیدا ہو گیا ہے۔ کیا اس کے ہوتے ہوئے تم انہیں گل بکاؤلی
اور الف لیلیٰ کی کہانیاں سناؤ گے؟ موجودہ مشینی عہد میں تو ادب
صرف Reproduction ہی سے ہو سکتا ہے۔ ذرا
سوچو یہ کس قدر مضحکہ خیز سی بات بن جاتی ہے کہ جب سرمایہ دارانہ
نظام اپنی زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔ دنیا میں ہوائی جہازوں
ٹینکوں اور ایٹم بموں کے چرچے ہوں۔ ہندوستان سے امریکہ
کا سفر چند گھنٹوں میں طے ہو سکتا ہو۔ اور ریڈیو کے ذریعے دنیا
بھر کی آوازیں ڈرائنگ روم میں گونج پیدا کر رہی ہوں۔ تم عوام
کو کوہ قاف کی کسی حسین شہزادی کا حال سناؤ گے۔ جسے حاصل
کرنے کے لئے کسی بادشاہ کا بیٹا بے سروسامانی کی حالت میں
اپنے راج محل سے نکلا ہو۔ میرا خیال ہے تم مجھ سے متفق ہو گے
اور اقبال کی نادانستہ غلطی پر دوبارہ سوچو گے۔

اختر فاروقی کی دعائیں پروف ریڈر نے ان کے ساتھ انصاف
نہیں کیا ہے۔ جس وجہ سے کسی کسی مصرعہ کا توازن قائم نہیں رہا۔
ورنہ چیز بذات خود اچھی ہے اور اقبال کے یہ تنقید :

دیا کرشن صاحب گردش سے میں پہلے متعارف نہیں تھا
اس بار مجھے ان کا نیاز حاصل ہو سکا۔ خاموش سے آدمی ہیں لیکن
سراپا ترقی پسند جن کے لہو میں آگ جل رہی ہو۔ مجھے ان کا مضمون
"نیا ادب" پڑھ کر روحانی کوفت ہوئی۔ میں اب یہ ماننے کے
لئے تیار نہیں۔ کہ گردش نے یہ مضمون اپنے رجحان طبع سے مجبور ہو
کر لکھا ہو گا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں نئے ادب کو بہت کالے
رنگوں میں پیش کیا ہے۔ اور آخر میں پرانے ادب کے تحفظ کے
لئے پرجوش اپیل بھی کی ہے۔ جہاں تک نفس مضمون کو سمجھ سکا ہوں
گردش کو نئے ادب کے متعلق تین اعتراض ہیں۔

۱۔ فحاشی

۲۔ مادیت سے وابستگی

۳۔ برہنہ حقیقتوں کو موضوع ٹھہرانا۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے مجھے معلوم نہیں کہ گردش
کے نزدیک فحاشی کی کیا تعریف ہے البتہ جو کچھ انہوں نے اس کے
جواز میں لکھا ہے۔ اس سے تعریف کی ایک جھلک سی دکھائی دیتی
ہے۔ کہتے ہیں کہ منٹو کو کہکشاں سے لے کر مصر کے مخروطی میناروں
تک ہر شئے پر شلوار محیط و مسلط دکھائی دیتی ہے اور وہ اپنے
افسانوں کے لئے اسی شلوار کی سلوٹوں میں پلاٹ تلاش کرتا ہے
اس سے باہر کی دنیا اس کے لئے بے حقیقت ہے"۔ ظاہر ہے کہ
گردش کے آگے منٹو کے وہ افسانے قابل اعتراض بلکہ اخلاق
سوز ہیں جن میں بنیادی تھیم شلوار ہے۔ جو اس قدر پھٹ گئی ہے
کہ سر راہ گیر شلوار پہننے والی کی رانیں کولہے اور ٹانگیں وغیرہ دیکھ
سکتا ہے۔ اور شاید بقول معترض ایک لذت سی محسوس کرتا
ہے۔ نئے ادب کے ہر معترض کے نزدیک یہ بہت بری بات
ہے۔ کہ ایسی چیزوں کا ذکر ادیب اپنی کہانیوں میں کرتے ہیں صرف
اسی لئے کہ کہانی پڑھنے والوں کا اخلاق بلند ہے۔ سماج میں ان
کی قدر ہے۔ لیکن یہ سمجھنے کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ کہ شلوار کیوں پھٹ
گئی۔ نئی کیوں میسر نہ آئی۔ اور شلوار پہننے والی اپنی عریانی کا مظاہرہ
کس لئے کر رہی ہے؟ ان کی نظر صرف ننگی رانوں اور گول کولہوں
تک ہی جا سکتی ہے۔ اس سے پار نہیں اس پوست تک جو سوکھ
گئی ہے۔ اس خون تک جس میں گرمی نہیں۔ اس چیخ تک جو سینے میں
دبی ہوئی ہے۔ وہ کفن میں لپٹی ہوئی لاش دیکھنا پسند کرتے ہیں
لیکن اگر ادیب کفن اٹھا کر لاش کا بگڑا ہوا چہرہ یا اس میں پیدا
ہوئی سڑاند دکھانے کی کوشش کرے۔ تو گردن زدنی ہے صرف
اس لئے کہ معترضین کا بلند اخلاق اسے گوارا نہیں کرتا۔ اور یہ لفظ
وضع کردہ ہے۔ سماجی ٹھیکیداروں کا۔ سیاسی EXPLOITS
کا۔ جو اسی حد تک ہمارے خیر خواہ ہیں۔ کہ ہم ان سے اپنا حق طلب
کریں۔ اپنی اجرت کا مطالبہ نہ کریں۔ ہم بھوکے ہیں ننگے ہیں۔ خانہ بدوش
ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کا کام بھوک اور عریانی کے باوجود
ہماری سوکھی ہوئی پسلیوں اور ننگی رانوں سے اپنے نظام کے
تحت چلنا چاہیئے۔ نئے ادب کا ادیب یہ برداشت نہیں کر سکتا۔
یہ تضاد اور یہ مظالم اس پر گراں گذرتے ہیں۔ وہ نسلی امتیاز کے

خلاف ہے سماجی قدروں کا دشمن ہے۔ وہ ہر شخص کو انسان اور مکمل انسان دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسی لئے یہی شلوار اور بلاوز یہی لحاف اور اوڑھنیاں دکھا دکھا کر ہمارے شعور کو لاکار رہا ہے۔ اور ہم اسے فحاشی کا الزام دیتے ہیں۔ کتنی بے انصافی ہے؟

دوسرے اعتراض کے متعلق زیادہ نہیں کہوں گا۔ مختصر اً صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ اب دنیا کا کوئی فرد بشر سائنس کی ترقی سے انکار نہیں کر سکتا جس نے اپنے تجربوں سے ان ناقابل یقین باتوں کو ثابت کیا جو سماج نے روحانیت سے منسوب کر کے انسانی دسترس سے بالا تر قرار دے رکھی تھیں۔ نیا ادب ان حقائق کا پرستار ہے جو انسان کو اجتماعی صورت میں ترقی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اسی لئے اس کے نزدیک مادیت زیادہ اہم اور قابل پرستش ہے۔ وہ اسی میں انسانیت کی بہتری اور بہبودی سمجھتا ہے۔ روحانیت کا ڈھونگ جو مذہب کے علمبرداروں نے عوام کی پسماندگی کا فائدہ اٹھا کر اپنی جہالت کے سبب رچایا تھا۔ سائنس کے نزدیک بے حقیقت اور گمراہ کن ثابت ہو چکا ہے۔ چونکہ آج کل کی زندگی کے ہر شعبے پر بلکہ زندگی کی ہر کروٹ پر سائنس کا بہرگو پڑنا لازمی ہے اور ادب ہمیشہ زندگی کا عکاس رہا ہے۔ لہٰذا نیا ادب سائنس کا معتقد ہے۔ اسے یقین ہے کہ سائنس کی ترقی ہی سے سماج کی موجودہ گھناؤنی صورت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ جس سے پسماندہ عوام کے دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔

تیسرا اعتراض، اعتراض نہیں بلکہ بجائے خود اعتراف ہے نئے ادب کی حقیقت نگاری اور حقیقت پرستی کا۔ ہمارے معترضین شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ نیا ادب اس امر کا دعوے کرتا ہے کہ وہ زندگی کو بہت قریب سے جھانکتا ہے اور جہاں جہاں اسے چیر پھاڑ کر پردے ہٹا کر حقیقت تلاش کرنے کے لئے اندر بھی داخل ہونا پڑے وہ وہاں بھی نہیں ہچکچاتا۔ اسی لئے اس میں ایسے تذکرے آتے ہیں جو حقیقی ہونے کے سبب ذرا آکڑے اور غیر مانوس سے نظر آتے ہیں۔ پرانے ادب نے آج تک صرف بیرونی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ نیا ادب گھر کا بھیدی بن کر پرانی اور فرسودہ سماجی لنکا کو ڈھا کر نئی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جو زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر ہو گی۔ جس میں صرف راون ہی نہیں رہ سکے گا۔ بلکہ سب انسان بھائی بھائی کی طرح۔ ہمارے معترضین اسی قسم کا اعتراض اٹھا کر ہمارے تجربے کی داد دے رہے ہیں اور ہمارے اس انصاف کے معترف ہیں۔ جو ہم اپنے گرد و پیش کے ماحول سے کرتے ہیں۔

مگر دشت صاحب سے اس ضمن میں اب اتنا ہی کہوں گا کہ صاحب اگر آپ نے یہ مضمون صرف "لکھنا برائے لکھنا" کے اصول کے تحت لکھا ہے۔ تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ ورنہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی کہ دنیا بدل رہی ہے۔ بالخصوص اردو شعریت بدل رہے ہیں پھر ادب کیوں نہ بدلے۔ آخر یہ سب تہذیب کی مختلف شاخیں ہی تو ہیں جب آج کا ادب برائے ادب معرض وجود میں آتا ہوگا۔ اس وقت بھی کہیں نہ کہیں سے مخالفت ہوئی ہو گی لیکن چونکہ وہ چیز عوام کی نہ تھی۔ بلکہ خواص کی تھی۔ لہٰذا زیادہ شور و غوغا نہ ہوا ہوگا۔ اور آج اسی لئے زیادہ شور سنائی دے رہا ہے کہ ادب خواص کے محلات سے نکل کر عوام کی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے کے لئے آ گیا ہے۔ چھوڑ دیجئے ان قصوں کو اپنے جوان ہو کی کرسی سے تنقید کی چیزیں لکھئے اور عوام کو دیجئے جو آپکے دروازے پر جمع ہو کر آپ کی جانب پر امید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

پھر اثر صہبائی، اثر لکھنوی اور گلشن صمیاپوری آتے ہیں۔ تینوں کے ہاتھوں میں تین چیزیں ہیں۔ جو دلکش بھی ہیں اور نئی بھی۔ ان کے متعلق کچھ لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ البتہ جو لوگ قبلہ اثر لکھنوی کو قدامت پسند شاعر مانتے ہیں۔ وہ نہ معلوم ان کا یہ شعر پڑھ کر کیا رائے قائم کریں گے۔

حیات نو عطا ہو گی دوبارہ شکل باراں میں!
لہک اٹھیں گے وہ پودے جنہیں غش پر غش آئے ہیں

پھر آذر عسکری صاحب کا چار سطری سے چیز اچھی ہے لیکن اتنا قدر برق رفتار کہ پڑھنے والا افسانہ نگار سے پہلے کلائمکس پر پہنچ جاتا ہے اور افسانہ نگار کی چابکدستی پر قہقہے بلند کرتا ہے۔

حاجی لگ لگ کا ترجمہ سفر ہوتا خطرناک ہے اور سو فیصدی "ترقی پسندانہ" ـــ خدا خیر کرے۔ علائی صاحب پرانے شکاری

دیا جیسے ہر میدان میں نئے ترکش لے کر آتے ہیں۔ لیکن تیر دل سے ترک کچھ زنگ خوردہ ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں ہاجی کی یہ کہانی انہوں نے کسی تاریخی واقعے سے اخذ کی ہے یا طبع زاد لکھی ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت نے انہیں کہیں کہیں تام فہم نہیں رہنے دیا۔

پھر کوثر سیمابی کا مزدور ہے — وہی بھوکا مزدور — جو جینا نہیں جانتا۔ البتہ جس کا بچہ ماں سے پوچھتا ہے —

کس طرح انداز سے مہتاب ابا آئے گا
اماں … لے کر … بھی لیتے آئیگا

اور ماں کہہ رہی ہے —

پھر بھی سب لائیگا ابا تمہارا ۔ روشنی ماں
… اس کی نرگس آنکھوں سے آنسو بہہ گئے

معلوم نہیں اس کو کیوں سوال ہو گئے۔ کیا اسے یقین نہیں کہ باپ ضرور نیا لے کر آئیگا۔ لیکن کوثر نے ہمیں زیادہ دیر تک تذبذب میں نہیں رکھا ہے خود ہی یاسیت پرستی کا پورا پورا ثبوت دیتے ہوئے مقطع میں کہا ہے —

وقت نے سرمایہ داروں کے لئے سارا جہاں
اور غریبوں کے لئے … دیا

اس کے بعد نرگس صاحب کا "معاہدہ امن" ہے۔ سان فرانسسکو کانفرنس نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعے کی صورت ہے انہوں نے الفاظ اور بناوٹ بڑی محنت سے تیار کیا ہے لیکن تو یہ ہے کہ آج کی صورت کی نسبت لکھنے میں بھی دیکر انسان ملول ہو جاتا ہے لیکن جب سوکھو اپنی حیا اور انسانیت سے بغاوت کر کے آگے آتی ہے۔ تو دل واہ واہ کر اٹھتا ہے۔

حمید نظامی صاحب کا "پیغام" انگریزی نظم کا ترجمہ ہے اور خوب ہے لاولی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ حنیف ہاشمی کی … اچھی چیز ہے۔ … کے لئے باعث انعام … کیونکہ کردار اور کرداروں کی نشست و برخاست وغیرہ خالص … ہیں۔

کیف اسرائیلی کا "انتظار" پڑھنے کی چیز ہے خصوصاً مقطع کا یہ شعر

سواد چشم نرگس ہے نئی تقدیر کی طالب
چمن کی ہستی ہستی منتظر ہے بے قراری سے

مگر تو بے خبر ہے اے میری نوخیز محبوبہ

کیا اچھا ہوتا اگر نوخیز کی جگہ کوئی اور لفظ ہوتا جس میں محبوبہ کی بے بسی ظاہر ہوتی … اس کے بعد … مضمون آتا ہے "انقلاب آ رہا ہے" یعنی یہ لفظ استعمال … ہندوستان میں اس لفظ کے غلط معنی لئے جاتے ہیں یعنی لوٹ، غارتگری، خون خرابہ وغیرہ۔ حالانکہ انقلاب کا صحیح مفہوم محض تبدیلی ہے جو زندگی کے بدلتے ہوئے ہر شعبے میں خود بخود آتی ہے۔ بلائی جاتی ہے سیاست میں … معاشرت میں، تعلیم میں، ہمارے ہاں یہ لفظ سیاسی نوعیت کے لئے … ہو گیا … اور جو نہی کوئی صلح پسند شخص سنتا ہے … مضمون قابل داد ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کافی غور و خوض کے بعد سپرد قلم کیا گیا ہے۔

ایم۔ اے عزیز صاحب کا … پر ایک مضمون Running Commentary ہے۔ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کامیاب رہے ہیں کاش وہ اسے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تاکہ زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکتے

عشرت کاشمیری صاحب کی "آئندہ" ایک غزل ہے یعنی وہ چیز جس نے مجھے پڑھنے پر آمادہ کیا … وہ یہ ہے کہ غزل گوئی کا زمانہ گزر گیا۔ اب عوام تماشا بینی سے غزلوں کے عوض ٹھوس چیزیں طلب کرتے ہیں جن میں زندگی زیادہ نمایاں … زیادہ ابھری ہوئی اور … نزدیک دکھائی دے … عشرت صاحب اس پر ضرور سوچیں گے۔

تحفہ … کا افسانچہ … ہے اس زندگی کی کہانی کا جس کا شیرازہ کسی بے درد … کے ہاتھوں سے بکھر گیا۔ زہرہ اس … دکھ جانتی ہے لیکن خاموش رہتی ہے … اس لئے کہ احتجاج کرنا مناسب نہیں وہ اپنے سینے میں ایک فریاد … اور … تصویر … اپنے لمحات گزارتی ہے نیا ادب … صرف … نہیں بلکہ ان کے خلاف ایک … آواز بھی ہے

آخر میں … نظامی صاحب اور … صاحب کی نظمیں ہیں دونوں … اچھی ہیں ایک تصویر کشی ہے … دوسری …

اس … کو ختم کرنے سے پہلے ایک … لکھنا چاہتا ہوں … بھی … اس میں جو اعلان میرے متعلق کیا گیا ہے مجھے امید ہے اب … ہی اس کی تلافی کرے گی

تمہارا بہی خواہ — پریم ناتھ پردیسی

پیام چودل
اخگر عسکری

موجِ دریا

(تعارف)

فیضِ طوفاں ہوا سے جو اُبھر آتی ہیں | چادرِ بحر پہ جو سلوٹیں پڑ جاتی ہیں
موجِ دریا انہیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں! | زادۂ سیلِ طوفاں ہوا کہتے ہیں
دیکھنے والے کو اپناتی ہے عذرا ہو کر | رگِ ساحل میں سما جاتی ہے صہبا ہو کر

ندّیاں کا کل پیچاں سی بنا دیتی ہے!
خس و خاشاک کو ساحل سے لگا دیتی ہے

(آغاز)

نام قطروں کو دیا ہے میری رعنائی نے | اور دریا کو سمیٹا میری انگڑائی نے

میرے نغموں میں نہاں راگ خدِ خم الوں کے
ذرّے سر پہ لئے پھرتی ہوں بیابانوں کے

(سرگذشت)

میری اک چھیڑ سے آجاتے ہیں دریا پہ حباب | میرے ایما میں ہیں تعمیر و فنا کے اسباب
لرز اُٹھتا ہے سمندر میری جولانی سے | منہ بناتا ہے ساحل میری طغیانی سے
وہ مسافر ہوں نہ بھٹکے جو رہِ منزل میں | وہ بہادر ہوں رہے خوف نہ جس کے دل میں
مضطرب رکھتا ہے جذبِ لبِ منزل مجھکو | سر اُٹھاتے ہی نظر آتا ہے ساحل مجھ کو

اک بھرے جوش سے منزل کی طرف جاتی ہوں
جا کے ساحل سے جو ٹکرائی ہوں مٹ جاتی ہوں

(انجام)

فی الحقیقت اسے کہتے ہیں فنا ہو جانا
لبِ منزل کو جو پانا تو ہوا ہو جانا

آ۔ صہبائی

شادکامِ محبّت

طرب انگیز ہے دنیائے محبت کی فضا!　　دل نے ہر رنگ میں لوٹے ہیں قیامت کے مزے
اپنے محبوب کی نظروں میں جو محبوب رہے　　ہیچ ہیں اُس کے لئے کوثر و جنّت کے مزے
اپنی خوش بختی پہ نازاں ہوں اے رُوحِ نشاط　　مجھ سے پُوچھے کوئی فردوسِ محبّت کے مزے

میں نے چاہا تجھے اور تو نے بھی چاہا مجھ کو

ڈال کر دل پہ مرے ایک محبّت کی نظر　　رشکِ صد ساغرِ جم اس کو بنایا تُو نے
مُسکرا کر دلِ برباد کو اے رشکِ بہار　　بُوئے گلہائے تمنّا سے بسایا تُو نے
جس میں ہے مستیٔ جاوید و سرورِ ابدی　　اپنے متوالے کو وہ جام پلایا تُو نے

خاک سے عرش کی مسند پہ بٹھایا مُجھ کو!

مرے نغموں میں ہے رنگینیٔ اُلفت کی بہار　　مری مستی میں ہے طوفانِ محبّت کا خروش
نور کا ایک تلاطم ہے بپا آنکھوں میں!　　مری ہر موجِ نظر ہوگئی خورشید بدوش
اہلِ حکمت تو مرے پہلے ہی دیوانے تھے　　آج اربابِ جنوں بھی ہیں مرے حلقہ بگوش

کچھ اس انداز کا دیوانہ بنایا تُو نے

کیفؔ اسرائیلی

عزمِ جدید

آفاق پہ چھائے ہیں شفق زار کے پردے!
مصروفِ جنوں مشرق و مغرب کے جگربند
اس دیس میں پیدا کیا تقدیر نے مجھ کو!
"جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند"
خود بین و ریاکار مزاروں کے خلیفے
کم بین و بد اندیش مدارس کے خداوند
آلودہ و ناپاک سیاست کے ترانے
زہراب میں بھیگے ہوئے دولت کے شکرخند
حیران و پریشان، رہِ توحید کے راہی
بیزار و غمیں، مادرِ تہذیب کے فرزند
ادبار میں ڈوبے ہوئے بنگال و پشاور
تدبیر میں کھوئے ہوئے تاتار و سمرقند
ڈوبا ہے جہاں، قلزمِ ظلمات میں یارب!
پھیلے گی نہ تنویر ترے دہر میں تا چند؟
دنیا میں ہے کب تک یہ سراپردۂ امروز؟
کب تک میں رہوں، ظلمتِ حاضر میں نظربند؟
فطرت کو سکھاؤں گا میں آئینِ بغاوت
کھاتا ہوں تری عظمت و جبروت کی سوگند

کوثرؔ سیمابی

بربادیاں

میرے دل کو رہینِ کاوش و فریاد رہنے دے
میں بربادِ تمنا ہوں مجھے برباد رہنے دے
ستالے باغباں ہم کو نہ مڑو دادِ چمن اپنی!
ابھی کچھ دن قفس میں مائلِ فریاد رہنے دے
میں خود ہی غم کے شعلوں میں فنا ہو جاؤں گا جل کر
چراغِ صبح ہوں میں صبح تک آزاد رہنے دے
مرے اکثر فسانے یادگارِ بزمِ فانی ہیں
نشاں میرا بقدرِ مورۂ برباد رہنے دے
مرے دل کو عطا کر وسعتیں صبر و تحمل کی!
الٰہی اس کو محوِ عشوہ و بیداد رہنے دے
مری بربادیاں ہیں ضامنِ ہنگامۂ ہستی
میں جس منزل میں ٹھہرا ہوں وہیں آباد رہنے دے
ہے تیری مصلحت پہ میری آبادی و بربادی
مجھے آباد رکھ تو، یا مجھے برباد رہنے دے
مکمل آج ہی کر دے نہ رودادِ الم کوثرؔ!
کسی شب کے لئے گنجائشِ فریاد رہنے دے

گلزار احمد فدا

ریاستی فن کار

تقریباً تمام دنیا کے مہذب حلقے یہ جانتے ہیں کہ ریاست کشمیر میں خوبصورت باغات اور رفیع الشان عمارات ہیں، دلفریب قدرتی مناظر ہیں، حیات بخش آب و ہوا ہے۔ دو پہلی ندیاں اور حسین چشمے ہیں۔ رنگ برنگے پھول ہیں۔ حسن ہے، صنعت و حرفت ہے، سیاست ہے، امارت و غربت ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس سرزمین پر حسن و عشق کے امتزاجی جذبات کے پرستار شعرا بھی ہیں، شمع کے سوز میں ابدی ساز زندگی معلوم کرنے والے تخیلی پروانے بھی ہیں۔ روس ادب کے باریک نقاب میں سے حسن و جمال کی نازک جھلکیاں دیکھنے والے ادبی عشاق بھی ہیں۔ مورخ و سوانح نگار بھی ہیں اور جہاں ادب قدیم کی پرزور حمایت کرنے والے پرانے قلم کار ہیں تو وہاں ادب جدید کی جدتوں پر قربان ہونے والے نئے فن کار بھی ہیں —

آج ادبی دنیا والوں سے ایسے ہی فنکاروں کا تعارف کرانے کیلئے ایک طرح کی انوکھی کوشش کیا جا رہا ہوں۔ "انوکھی اور مطلق" کے معنوی مفہوم کا ادراک قارئین پر چھوڑنے کے بعد ریاستی فن کاروں سے متعلق بحیثیت مجموعی صرف اتنا کہوں گا کہ ریاستی کائنات کا ہر ذرہ اپنے فن کاروں کے ادبی، علمی اور اصلاحی کمالات کے تفاخر سے ہر لمحہ سربلند رہے گا اور پکار پکار کر کہے گا کہ ریاست کشمیر ہر اعتبار سے ایک گنجینہ ہے اور بےمثال خزینہ ہے۔

کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، دسند باد جہازی، مہندر ناتھ، رامانند ساگر اور سیوک رام آیا مر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تمام اردو دنیا ان کے ادبی کارناموں کی معترف ہے۔ ریاستی ماحول کو جب ان کی تڑپتی چڑھتی امنگوں اور مچلتے جذبات و خیالات نے تنگ اور گھٹا گھٹا پایا تو گھبرا کر انہوں نے ہندوستان کی راہ لی اور چند عرصہ میں ہی آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے بن گئے۔ ان میں کرشن چندر، مہندر ناتھ اور رامانند ساگر حال کے بہترین افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت ایک جید عالم، سلجھے ہوئے نقاد اور پرلے درجے کے ظریف اور خوش باش ادیب ہیں۔ ان کے ظرافتی مضامین ظرافت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ "سرگزشت، سلام ودا، جغرافیہ پنجاب" لکھ کر آپ نے بیک وقت سنجیدہ مورخ اور ہنس مکھ جغرافیہ نویس سائنسدان ہونے کا ثبوت دیا ہے — سیوک رام آیا مر آجکل فلمی دنیا میں جوہر دکھا رہے ہیں۔

آئیے اب ریاست میں بسنے والے ادبا و شعرائے کرام سے متعارف ہو جئے۔

دیا کرشن گردش :- آپ ریاست کے مایہ ناز ادیب، نامی نقاد اور اچھے شاعر ہیں۔ نظم و نثر کو جب تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کے لطیف زیورات سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تراوش مرزا غالب کے زمانہ کی یادگار ہے۔ تحریر میں سرشار ایسی روانی اور تیزی ہے۔ جب حسن و عشق کے نازک معاملات پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو طرز تحریر پر قاضی عبدالغفار اور سجاد حیدر یلدرم کا گمان ہوتا ہے۔ سیاسی مضامین بڑے جچے تلے اور پر از معلومات ہوتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ تصویر کے تاریک اور روشن دونوں رخ بڑی عمدگی اور صفائی سے دکھاتے ہیں۔ شعر بہت کم کہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ جب کہتے ہیں خوب کہتے ہیں چونکہ ادب قدیم کے حامی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی انشا میں زندگی کے ٹھوس مسائل کی فراوانی نہیں۔

نرسنگداس نرگس :- دیہاتی کسانوں کی زندگی کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے میں جو کام یو۔پی میں پریم چند، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور پنجاب میں احمد ندیم قاسمی اور بہار میں سہیل عظیم آبادی نے کیا اسی کام کو نہایت چابکدستی اور بالغ نظری سے پورا کرنے والے ہماری ریاست میں نرسنگداس نرگس ہیں۔ آپ نے دیہاتی کسانوں پر کئے گئے ناجائز مظالم کے خلاف اپنے سینکڑوں افسانوں میں پرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ پریم چند کی مانند ان کی زبان بھی نہایت سادہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں اپنا مقام کر لیتی ہے۔ تحریر میں آمد کا ایک دریا بہتا ہے جس میں آورد کی کوئی موج نہیں اٹھتی۔ روزمرہ لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ زبان نہایت میٹھی اور پیاری استعمال کرتے ہیں لیکن صرف افسانہ میں، کیونکہ جب کوئی سیاسی مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو غلام رسول مہر بن جاتے ہیں۔ نئے ادب کے زبردست حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زبردست بغاوت اور جوش و خروش ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جب

انہیں دیہاتی افسانہ لکھنا ہو تو مسوّدا رام کوئی بن جاتے ہیں۔ تصویر کشی کرنا ہو تو مصوّر ہو جاتے ہیں۔ عریاں نویسی سے جب سوسائٹی کا سدھار مقصود ہو تو یہ محترمی مرحوم کہلائیں گے۔ اور جب علمی، ادبی، سیاسی اور معلوماتی مضامین لکھنے ہوں۔ تو نرگس ایڈیٹر چاند ــــ

اے۔ آر۔ ساغر:- آپ ریاست کشمیر کی واحد شخصیت ہیں جن کی تقریر میں تحریر بصد بادہ جوش حرارت اور لوچ ہے۔ تقریر کرتے وقت فصاحت و بلاغت کا ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک ساغر صاحب کی تقریر و تحریر یہ دونوں بے بدل ہیں۔ انداز تحریر میں خاص قسم کا طنز ہے جو ملکی ظرافت سے ہم آہنگ ہونے کے بعد رشید احمد صدیقی کا اسلوب بیان ہو جاتا ہے۔ کیپٹن وزیر گنگا رام اور مرزا محمد افضل بیگ پر جب طنز کے تیر چلاتے ہوتے ہیں تو آپ کا قلم مولوی عبد الحق کی تنقیدی جولانیوں اور مولانا نیاز فتحپوری کی تحقیقی روانیوں کا پتہ دیتا ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قدم بقدم دانستہ لکھتے ہیں اور دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں لیکن جب ذاتیات پر آتے ہیں تو عالم برزخ میں سودا اور تیشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کی روحیں بھی کانپ جاتی ہیں اگرچہ ریاست کو آپ جیسے طنز نگار ادیب پر بڑا فخر ہے لیکن اگر آپ کی نگاہ تخیل تخریبی حدود سے گذر کر تعمیری اور آفاقی قدروں کا بھی مشاہدہ کرے تو میرے خیال میں آپ کی خداداد ذہانت اور ادبیت پر نہ صرف ریاست ہی بلکہ سارا ہندوستان فخر کرے۔

معراج الدین احمد:- آپ "پاسبان" کے ایڈیٹر ہیں۔ نثر میں تخلیق اور لطیف الفاظ سے معانی پیدا کرتے ہیں۔ نئی نئی تشبیہوں اور نئے نئے استعاروں سے جب تحریر کو فنی حسن و جمال کے بلند معیار پر پہنچاتے ہیں تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ تحریر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلالی رنگ جھلکتا ہے ریاست کے پہلے اور شاید آخری ادیب ہیں جو نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلنشیں جملے اس وقت بڑا لطف دیتے ہیں جب ان سے آپ منظر نگاری کا کام لیتے ہیں۔ ادب قدیم کے مبلغ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تحریر پر فارسیت اور عربیت کا اثر غالب ہے۔ اور مولانا محمد حسین آزاد کی طرح ہواؤں میں اڑتے اور خلاؤں میں سیر کرتے ہیں۔ شاید زمین ان کو پسند نہیں آتی۔ بعض اوقات اتنا بلند جاتے ہیں کہ راکٹ کی مانند فضا میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں یا جیسے

ہندو سبھا کے متعلق لکھتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ اس کو سمجھے گا کون؟ غالب کی طرح عوام کو ان کی مشکل پسند کا رونا ہے۔

محمد عمر (نورالہی):- آپ نے "ناٹک ساگر" لکھ کر دنیائے ڈرامہ میں خوب نام پیدا کیا ہے ریاست میں فن ڈرامہ کی حقیقت و اہمیت سمجھنے والی شخصیت رہیں اگر کوئی ہماری نظروں میں جچتی ہے تو وہ آپ ہی ہیں۔ بلا شبہ آپ ریاست کشمیر کے کالی داس ہیں۔ پرانے لکھنے والے ایک اچھے بزرگ ہیں۔ برجموہن دتاتریہ کیفی کی طرح دوسروں کو ہر وقت نصیحت فرماتے ہیں کہ مشکل پسندی اور ادق نویسی سے دستکش ہو جائیے۔ لیکن ان کی اپنی تحریر کا یہ عالم ہے کہ کیفی کی منشورات کی مانند شروع سے آخر تک ضرورت سے زیادہ دقیق اور مبہم ہوتی ہے۔

محمد الدین فوق:- اگر صاحبزادہ محمد عمر ریاست کشمیر کے مستند ڈرامہ نویس ہیں تو آپ ریاست کے واحد مورخ اور سوانح نگار ہیں۔ "تاریخ بڈشاہی" اور "اہلیا بائی" آپ کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے کمال کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ مورخ کی حیثیت سے ان کا انداز بیان اور تاریخی تحقیق و تدقیق علامہ شبلی کی یاد دلاتی ہے اور اس وقت الطاف حسین مولانا حالی کا دھوکا ہوتا ہے جب انہیں سوانح نگار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

عبدالعزیز علائی:- ریاست کے کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں جناب گردش کی طرح ادبی کمالات کو نذر گمنامی کر رکھا ہے انداز تحریر میں ناصحانہ رنگ غالباً انہوں نے مولوی نذیر احمد اور حزن و ملال علامہ راشد الخیری سے پایا ہے تاریخی افسانے انتہائی دلچسپ لکھتے ہیں جن میں عبرت و درس کا پہلو بدرجۂ اتم نمایاں ہوتا ہے۔ چاندنی راتوں میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ان کے سحر تخیل میں کبھی کبھار تموج پیدا ہوتا ہے اگر اس میں ہر وقت طوفان رہے تو مجھے امید ہے کہ ایک وقت آپ ریاست کے سب سے بڑے افسانہ نویس تسلیم کئے جائیں۔

ا۔ ر۔ مجبور:- ریاست کشمیر کی سب سے پہلی اور کامیاب افسانہ نویس خاتون ہیں۔ ان کے افسانوں میں عصمت چغتائی کی طرح رومان، رنگینی اور جاذبیت ہے لیکن عریانی اور جنسی بھوک نہیں۔ حزن و یاس اور درد و فراق کے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرنے میں جواب امتیاز حاصل کیا ہے طرز تحریر میں خاص قسم کا بانکپن اور حسن ہے۔ شاہدہ دیوی عراقی

کی مانند ان کا دل بھی حد درجہ حساس اور درد مند ہے جس میں مرد کے احترام کے ساتھ ساتھ عورت کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا جذبہ بہ نسبتاً زیادہ کارفرما ہے۔ غالب کے تتبع میں آپ کے خطوط واقعی قابل داد ہیں۔ جن میں ہلکے مزاح کے ساتھ طاہرہ دیوی شیرازی کے چوٹ کھاتے ہوئے دل کی طرح درد و یاس بھی ہے۔ بڑے مزے کی بات ہے کہ ایک رومان پرداز افسانہ نویس ہونے کے باوصف پانچ وقت کی نمازی اور مذہبی امور سے کما حقہ واقف ہیں۔

غلام حیدر چشتی :- یوں تو آپ ریاست کشمیر کے مانے ہوئے نقاد ہیں لیکن آپ کے نقد و نظر کا معیار صرف لفظی حسن و قبح تک ہی محدود ہے۔ مشرقی اور نحوی قسم کے ادیب ہیں۔ تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے جھگڑے آپ کو بہت مرغوب ہیں۔ اس قدامت پسندی کے باوجود آپ کی علمیت سے کسی عنوان انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک عرصہ سے شعر و شاعری کو خیر باد کہہ چکے ہیں شاید یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں آج تک ان کے کلام بلاغت نظام سے شاد کام نہیں ہو سکا۔

پریم ناتھ پردیسی :- ریاست کشمیر کے کرشن چندر ثانی ہیں۔ ان کے خیالات و رجحانات کی نس نس میں نیا ادب سما چکا ہے۔ یہ اول درجے کے انقلابی اور جدت طراز افسانہ نویس ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی مانند خاطر نشین سادہ اردو لکھتے ہوئے درمیان میں جب کوئی دقیق لفظ پھینک دیتے ہیں تو ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی طرح نئی نئی اضافی تشبیہیں بڑی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ادبی کہانیاں بڑی موثر اور دردناک ہوتی ہیں۔ آنے والے دور میں نہ صرف ریاست کے بلکہ ہندوستان کے بہترین ادبا میں شمار ہوں گے۔

کشن سمیلپوری :- ریاست کے وہ درد مند، حساس اور دلگداز شاعر ہیں جن کو ریاستی کائنات کے ذرہ ذرہ سے پیار ہے اور اسی پیار کا تقاضا ہے کہ آپ "شاعر ڈوگرہ" کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں آپ کا تخیل بہت بلند ہے بعض آزاد نظمیں اتنی عمدہ ہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی آزاد نظموں سے ایک حد تک مشابہت رکھتی ہیں آپ کے کلام میں تشبیہہ و استعارہ اتنا ہے۔ جتنا آٹے میں نمک۔ سچی اور سیدھی باتیں اس صفائی سے منظوم کرتے ہیں کہ قلم چومنے کو جی چاہتا ہے۔

کیفؔ اسرائیلی :- آپ ریاست کے نوجوان شاعر ہیں لیکن جوانی صرف شاعری اور تخیل تک ہی محدود ہے۔ اس سے آگے نہیں اور اگر اس سے آگے بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کلام پر اقبال اور جوش کا رنگ غالب ہے۔ ریاستی ماحول کو اپنے خیالات کی وسعتوں کے مقابلہ میں بہت تنگ پاتے ہیں اور یہ ہے بھی درست۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ نئے ادب کے سچے پرستار ہیں حسن و عشق کی نزاکتوں اور رعنائیوں کی جب خامہ فرسائی کرتے ہیں تو فیض احمد فیض اور الطاف مشہدی بن جاتے ہیں حیرت ہے کہ نثر لکھنے کی جانب آج تک کیوں متوجہ نہیں ہوئے۔ آپ کا مستقبل روشن ہے۔

محمود ہاشمی :- جو کیفیت نظم میں کیفؔ اسرائیلی کی ہے۔ تقریباً وہی حالت نثر میں محمود ہاشمی کی ہے آپ علمی اور تنقیدی مضامین لکھنے میں خاص صلاحیتوں کے مالک ہیں، لیکن آپ میں بڑا نقص یہ ہے کہ بہت کم لکھتے ہیں اگر یہ نقص دور ہو جائے تو آپ ریاست میں چوٹی کے نقاد مانے جائیں۔

ایم۔ اے۔ عزیز :- آپ تعلیمی اور معلوماتی مضامین بہت خوب لکھتے ہیں۔ تحریر میں بے ساختہ پن اور خاص برجستگی ہے تعلیمی مضامین میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور سر راس مسعود کا خاص رنگ جھلکتا ہے۔ ڈرامہ بھی لکھتے ہیں لیکن محمود ہاشمی کی طرح۔ اگر آپ بھی کم لکھنے کا نقص دور کر دیں تو ریاست کے تعلیمی حلقے آپ کے خیالات سے اچھی طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمد لشیر :- ریاست کشمیر میں اگر ہم سید سلیمان ندوی اور محی الدین قادری زور کے اسلوب بیان تنوع خیالات اور علمی ادبی معلومات کے عکس لطیف دیکھنے کی تمنا کریں۔ تو لشیر صاحب کی تحریر ہماری اس تمنا کی تکمیل کر دیتی ہے آپ کی تحریر میں فصاحت و بلاغت جامع و مانع ہے۔ تنقیدی اور ادبی مضامین لکھنے میں آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے آپ کے پاس الفاظ کا ایک ایسا قیمتی ذخیرہ ہے۔ جو غالباً ریاست کے بہت کم ادبا کے پاس ہوگا۔ گردش اور عبد العزیز علائی کی طرح گوشہ گمنامی میں اپنے علم و فضل کو دیمک کے سپرد کر رکھا ہے۔

کشمیری لال ذاکر :- افسانہ نویسی میں آپ ریاست کشمیر کے سدرشن ہیں اور شاعری میں میر تقی میر۔ لیکن ذرا ترقی پسند اور جدید رجحانات کے ساتھ چلنے والے میر صاحب ہیں۔ حضرت آثر لکھنوی اگر میر کو قنوطی شاعر نہیں مانتے تو نہ سہی۔ لیکن ہم تو ضرور کہیں گے کہ ذاکر کی شاعری میں میر کی قنوطیت حد درجہ نمایاں ہے اگرچہ اس قنوطیت میں گل و بلبل، زلف و کاکل اور شیریں فرہاد کے قصے نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس اور جدید حقائق ہیں تاہم دونوں کی اساس یاس اور غم ہے۔

ایک تلخیص وہ فرار۔ جو شاید ہمیشہ ہی انسانی زندگی کے ساتھ چپکا رہے گا۔

قیس شروانی ویسے تو آپ ریاست کے "ادیب گڑھ" میں لیکن خوش بختی سے آجتک خود اپنے آپ کو صحیح معنوں میں ادیب نہیں بنا سکے آپ کی ادبی سرگرمیاں زیادہ تر محض نقلی اور تخیلی ہوتی ہیں کیونکہ آپ شاعرانہ مذاق رکھنے کے باوجود شعر بہت کم کہتے ہیں۔ اور نثر میں اچھا یا برا مضمون لکھنے کی تو شاید آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ آجتک آپ کا کوئی طبعزاد مضمون یا افسانہ میری نظروں سے نہیں گذر سکا۔ اگر نظم کے ساتھ ہی نثر لکھنے کی کوشش بھی جاری رکھیں تو ممکن ہے۔ آئندہ دور میں ریاست کے اچھے ادیبوں میں آپ کا شمار ہو سکے

عشرت کاشمیری :۔ ریاست کے ہونہار اور ترقی پسند ادیب و شاعر ہیں۔ زبان میں بلا کی حلاوت ہے۔ انداز بیان اچھوتا اور دلنشیں ہے متوسط طبقہ کے خارجی اور داخلی حالات و واقعات کی نقاب کشائی بڑے اچھے انداز میں کرتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی اور عشرت کاشمیری کی زبان و خیال میں بہت مناسبت ہے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ عشرت کے یہاں اختر انصاری کی مانند لفظی تسلسل شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے لیکن پردیسی جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں راہ چلتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کی طرح ایک قسم کی لطیف ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔

دولت رام گپت / **اقبال تمنائی** گپت صاحب ہماری ریاست کے ڈیلو نر سنیار تھی ہیں۔ جیسے کی روح نواز بولیوں میں جب الہڑ دوشیزائیں حسین پہاڑی نغمے الاپتی ہیں تو آپ چپکے سے ان کا ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ کرکے تقریباً تمام ہندوستان کے موقر جرائد میں بھیج دیتے ہیں ہندی کے زبردست ٹیکنیک ہیں خواجہ حسن نظامی کی طرح ہندی میں نہایت دلکش قلمی چہرے لکھتے ہیں آپکے اردو افسانے میں نکھرا ہوا آدمان ہوتا ہے محبت کے نازک اور گہرے رموز نفسیاتی مطالعہ کی روشنی میں خاص انداز سے بیان کرتے ہیں ـــ ادبیات لکھنے میں اقبال تمنائی نہ صرف ریاست بلکہ پنجاب بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ نہایت شستہ اور خوش آئند زبان لکھتے ہیں۔

حمید نظامی :۔ انگریزی افسانوں کا دلچسپ ترجمہ کرنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے اس دلکش پیرایہ میں ترجمہ کرتے ہیں کہ اصل اور نقل کا امتیاز اٹھ جاتا ہے ترجمے کا انداز بیان مولوی عنایت اللہ اور ل۔ احمد سے ملتا ہے خیالات کی طرح ان کی زبان میں بھی رومان کو بڑا دخل ہے طبعزاد افسانے بھی خوب لکھتے ہیں تخلیقی افسانوں میں چند سے مشکل پسندی ہو آتی ہے جس سے طرز ادا

مجنوں گورکھپوری سے جا ملتا ہے۔

طالب گورگانی / **طالب کاشمیری** دونوں حضرات ریاست کے بہترین شعراء میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں طبیعت طرز میں نازک خیالی کی آمیزش نمایاں ہے۔ صحت محاورات اور تازگی مضامین کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تصنع اور لفاظی سے دونوں اصحاب کو اجتناب ہے فارسی تراکیب کا استعمال بہت کم ہے اور جہاں ہے وہاں بہت خوب ہے طالب کاشمیری اگر شعر کہنے میں ذرا "تحمل" سے کام نہ لیں تو جانے یہ کیا سے کیا ہو جائیں طالب گورگانی نظم کے علاوہ نثر میں بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔

عماد الدین سوز / **حبیب کیفوی** دونوں بزرگ سچے اچھے سخن سنج اور سخن فہم ہیں۔ بلندی مضامین صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات کی بدولت ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں دونوں غزل گو ہیں۔ سوز کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ غالب کی طرح بلند پروازی ان کے کلام کی اولین خصوصیت ہے۔ حبیب صاحب نظم کے علاوہ علمی اور تنقیدی مضامین بھی خوب لکھتے ہیں۔

آذر عسکری / **بی۔ ٹی۔ ایل۔ شرما** ریاست کے بہترین مزاح نویس ہیں۔ حاجی لق لق کی طرح ان کی ظرافت کو محض تمسخر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی تہ میں نہایت عمیق اور لطیف معانی ہوتے ہیں ان کا مذاق سوقیانہ نہیں۔ بلکہ ظرافت نہایت جامع اور وسیع ہے۔ آذر عسکری کے انداز تحریر اور خیالات میں عظیم بیگ چغتائی اور پطرس بخاری کا سا اجلا رنگ ہے۔ بی۔ ٹی۔ ایل شرما چونکہ بہت کم لکھتے ہیں اس لئے ان کے جوہر ابھی دبے دبے اور عوام کی نگاہوں سے مستور ہیں۔

رسا جاودانی / **رعنا نظامی** ان کو قدیم و جدید دونوں رنگوں سے فطری مناسبت ہے دونوں رنگوں کے عیوب کو چھوڑ کر ان کے محاسن کو اپناتے ہیں لیکن رسا جاودانی زیادہ تر طرز قدیم کی ڈگر پر چلتے ہیں۔ ان کے کلام میں میر درد کا تصوف اور میر سوز کی سادگی ہے خیالات نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں البتہ رعنا نظامی ترنم سے خیالات کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔ اور بڑے مزیدار شاعر ہیں علم و فضل سے ماہر ہے۔ مومن کی طرح کبھی کسی کے کلام سے متاثر ہو کر توصیفی کلام ادا کرنا کو سمجھتے ہیں۔

کوثر سیمابی دونوں حضرات بیک وقت بہترین افسانہ نویس اور خوش گو شاعر ہیں۔

اختر فاروقی جذبات نگاری اور درد و اثر ان کے کلام کا جوہر ہے حزن و یاس ان کے دل کو ہمیشہ گرفتار رہتا ہے کہیں کہیں حب الوطنی کے خیالات سے کلام میں ندرت اور دلآویزی پیدا کر دیتے ہیں۔ کوثر کی شاعری سے ان کی افسانہ نگاری زیادہ تحسین و کشش

کی مستحق ہے طرزِ تحریر سعادت حسن منٹو سے ملتا ہے۔ لیکن منٹو کی طرح عریانی اور فحاشی ان کے کلام کا طغرائے امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ افسانوں میں ان کا درد مند دل تڑپتا اور محبت دکھائی دیتا ہے ان کے تغزل میں فنی دقتوں کا رنگ ہے۔ اختر فاروقی کی نظم افسانے سے زیادہ دل پسند اور شستہ ہے اور غیر مہذب باتوں سے قطعی پاک جو ایک اعلیٰ خصوصیت ہے۔

ملک عمر دین / عمر حزیں ریاست کے نوجوان اور بے باک ادیب ہیں۔ نہایت آزاد خیال اور جدت طراز۔ ملک صاحب کا طرزِ تحریر پُرزور اور سادہ ہے اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں بلکہ صرف نفس مضمون پر زور دیتے ہیں۔ تحریر پر منٹو کا اثر غالب ہے۔ عمر حزیں ریاست کے نرالے ادیب ہیں۔ تحریر میں خاص قسم کی رنگینی، دلآویزی اور چلبلا پن ہے گویا ایک الہڑ حسینہ ہے جو دنیا وی تفکرات سے بے نیاز آگے بڑھے جاتی ہے۔

محمد امین / محمد اسحاق دونوں حضرات نہایت مہذب اور زندہ دل واقع ہوئے ہیں جاوید اور حقانی کے نام سے جو نظمیں شائع ہوتی ہیں ان سے امین صاحب کی جامعیت، علمی تبحر اور خداداد قابلیت کا پتہ چلتا ہے کلام میں اکبر الہٰ آبادی کا ظریفانہ طنز اور مولانا ظفر علی خان کی علمیت پائی جاتی ہے نثر بھی بڑی جامع اور زور دار ہوتی ہے اسحاق صاحب بہت کم لکھتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو واقعی لکھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

اخگر عسکری / لطیف ہاشمی ان کے کلام میں اعلیٰ تخیل، سلاست، روانی اور دلکش عاشقانہ رنگ ہے۔ اخگر صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اشعار میں شگفتگی، نزاکتِ خیال، بلند پروازی، شیرینی اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔ لطیف صاحب کی غزل بہت شگفتہ ہوتی ہے جس میں داغ کی شوخی اور امیر کی سنجیدگی دونوں موجود ہیں۔

عزیز کاشش / انور لکھنوی دونوں نوجوان اور خوبصورت ادیب ہیں اور یہ خوبصورتی ان کی تحریر میں بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کاشش صاحب رنگین اور جذباتی افسانے لکھنے میں عبدالرحمان کے ہمسر ہیں۔ بڑی میٹھی اور حسین زبان لکھتے ہیں لیکن انور کی زبان میں زور اور آمد زیادہ ہے۔ طرزِ تحریر علامہ تاجور نجیب آبادی سے قدرے ملتا جلتا ہے۔ ان کے ادبی مضامین ان کے افسانوں سے زیادہ جاذب نظر ہوتے ہیں۔ کاشش صاحب حقیقت نگار ہیں۔ حسن کو نہایت قریب ہو کر دیکھتے، سمجھتے اور پرکھتے ہیں۔

جگدیش چندر کنول / کندن لال جو خصوصیات عزیز کاشش میں پائی جاتی ہیں تقریباً تمام کی تمام ان دونوں میں موجود ہیں۔ کندن لال بچوں کے ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں اس لحاظ سے ان کی تحریر میں بڑھاپے کے نشان نہیں بلکہ بچپن اور جوانی کے ملے جلے آثار ہیں۔ افسانہ خوب لکھتے ہیں۔ کنول ہندوستان کے بعض افسانہ نگاروں سے زیادہ متاثر ہیں بڑی بھڑکیلی اور چمکدار زبان لکھتے ہیں۔

مذکورۂ بالا ریاستی فنکاروں کے علاوہ اور بھی ایسے نوجوان ہیں جو مضمون لکھتے اور شعر کہتے ہیں مثلاً گنگا ناتھ شرما۔ دیانند کپور۔ صدت کاشمیری۔ سعید احمد ضیا صدیقی۔ رفیق بھاکر لوپچھی۔ وشوا ناتھ ماہ۔ ضیاء الحسن خان فیق۔ وفا سماہنوی۔ مولوی عبد الرحمان۔ نشاط سیمابی۔ جمیل شاہ۔ آفتاب احمد۔ زین العابدین۔ عبد العزیز ملہمیہ۔ سید ارام شرما۔ الیس ریاض غازی۔ سدا نند الندقوت۔ بشیر آرٹسٹ۔ ناصر جعفری۔ ابن رضا۔ منظور ہاشمی۔ رگھو نندن لال۔ باقر۔ انور۔ ذہرہ۔ جمال پوری۔ نثار فاروقی۔ منیر لال ڈل۔ اور عورتوں میں صاحبزادی عابدہ۔ حمیدہ بانو۔ صغرا بیگم۔ بملا پنڈت۔ جمیرا۔ ذکیہ خاتون۔ کماری کرشنا۔ حمیدہ بیگم۔ محمودہ احمد علی اور نجمہ لکھتی ہیں یہ سب ادیب کیا ہیں؟ کیسے ہیں؟ کیا ہوں گے؟ کچھ ہو بھی سکیں گے کہ نہیں؟ ان سوالات کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ البتہ ان کی کوششیں اگر ایسے ہی جاری رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک وقت یہی ادیب و شاعر ہماری ریاست کے اعلیٰ فنکار ہوں۔ فنکاروں کے علاوہ ہمارے یہاں ایک طبقہ اخبار نویسوں کا ہے جو ریاستی صحافت کو بامِ عروج پر لے جانے میں شبانہ روز مصروف کار ہے۔ ان میں پریم ناتھ بزاز۔ مولوی محمد سعید۔ سراج الحسن۔ ملک شرف۔ پریم ناتھ کنہ۔ عبد المجید قرشی۔ شوم گپتا۔ ادم پرکاش صراف۔ وشوا ناتھ کیرتی۔ مولوی عبد الواحد۔ مسٹر صادق۔ گردھاری لال آنند۔ کامریڈ محمد شفیع اور صدر الدین مجاہد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس موضوع پر ریاست میں آج تک کسی ادیب نے قلم نہیں اٹھایا اور نہ ہی ریاستی فنکاروں کے علمی کمالات سے ادبی دنیا کو آگاہ کرنے کی کسی صاحب نے ہی کوشش کی ہے راقم الحروف نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ نہیں جانتا کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے؟ ہو سکتا ہے کہ بعض ادباء و شعرا کی غیر ارادی طور پر حق تلفی ہو گئی ہو یا بعض اچھے لکھنے والے سرے سے فنکاروں کی اس فہرست میں شامل ہی نہ ہو سکے ہوں لیکن اپنی طرف سے اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بھی صاحب مذاق چھوٹنے نہ پائے تاہم توقع ہے کہ اس نوعیت کی کسی غلطی یا کمی سہو و خطا کو قارئین و ادباء کرام ضرور نظر انداز کر دیں گے۔

نرسنگداس نرگس

تعارف

کردار:-

وسنت:- ایک پچیس سالہ کالجیٹ نوجوان۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ۔ اور بیسویں صدی کی رومانی محبت کا پرستار۔

راگنی:- ایک کالج کی رومان پرور فضا میں میٹھے راگ الاپنے والی کھدر پوش دوشیزہ۔

منظر

حضوری باغ میں ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے مسٹر وسنت تنے کے ساتھ پشت لگائے سینٹ جان ہاکن کا ڈرامہ (کانسٹنٹ لور) پڑھ رہا ہے اور آس پاس سے پرندوں کے چہچہانے کی صدائیں آ رہی ہیں۔ درخت کی شاخ پر کوئل پھڑپھڑاتی ہے۔ اور پھر ایک دوسری شاخ پر بیٹھ کر ایک اندوہگیں صدا بلند کرتی ہے۔

وسنت:- (آپ ہی آپ) "کانسٹنٹ لور" میں بھی ہاکن نے ایسا ہی منظر بیان کیا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ سیسل کو اسی طرح جنگل میں بیٹھے بیٹھے ایک حسینہ سے تعارف نصیب ہوا تھا! اور مجھے تو یہاں کوئی بدصورت آدمی بھی نہیں دکھائی دیتا۔ سیسل وکیل تھا۔ اور میں ابھی کالج میں تعلیم پا رہا ہوں۔ شاید اسی لئے کسی لڑکی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ یہ سب اتفاقات ہیں۔

(ڈرامہ پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

(درخت پر ایک بلبل ایک شیریں نغمہ الاپتا ہے۔ دور سے کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی ہے۔ وسنت سامنے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ ایک اٹھارہ سالہ کھدر پوش حسینہ کتابیں بغل میں دبائے آ رہی ہے)

وسنت:- (دل ہی دل میں) یہ بھی محض اتفاق ہے۔ آخر سیسل کو اپنی محبوبہ مل ہی گئی۔ وسنت اس لڑکی کے تکبر پر سیتل ہی کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہوگا (لڑکی اور نزدیک پہنچ جاتی ہے) یہ تو ہمارے ہی کالج کی طالبہ ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ خوب یاد آیا۔ راگنی کتنا پیارا نام ہے۔ صورت بھی تو کم نہیں۔ سارے کا سارا کالج اس پر جان دیتا ہے

(لڑکی بالکل قریب پہنچ جاتی ہے)

وسنت:- (کتاب نیچے رکھ کر مؤدبانہ انداز میں) "آخر آپ پہنچ ہی گئیں" (گھڑی دیکھ کر) آپ آدھ گھنٹہ لیٹ ہیں مس راگنی"

راگنی:- "میں؟ میں نے آپ سے کب یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا؟"

وسنت:- "وعدہ کے بغیر مجھے یہ توقع تھی کہ آپ تین بجے تشریف لائیں گی۔ مگر اب ساڑھے تین ہو چکے۔ آپ آدھ گھنٹہ لیٹ ہیں مس راگنی"

راگنی:- "مگر میں تو یہاں مطالعہ کے لئے آئی ہوں۔ کسی کے کہنے پر نہیں"

وسنت:- اور میں اپنے کالج کی ایک ہونہار طالبہ کو اس کے مطالعہ میں مدد دینے کے لئے یہاں آیا تھا۔ محض دل کی کشش ہے جو آپ کو یہاں کھینچ لائی۔ مگر آدھ گھنٹہ لیٹ۔ آپ معذرت کیجئے مس راگنی"

راگنی :- "معذرت ؟"

وسنت :- "کیوں نہیں ؟ لیٹ آنے والے کو یہ رسم ادا کرنا ہی پڑتی ہے۔ یہ کتابیں کیا ہیں۔ ذرا دکھایئے تو (راگنی کتابیں اس کی طرف بڑھاتی ہے) اور آپ بیٹھئے نا۔ کیوں نہیں یہاں بیٹھنے کے سہارے" ؟

راگنی :- (بیٹھنے کے لئے جھکتے ہوئے) "میں نہیں سمجھتی کہ یہاں بیٹھنا میرے لئے مناسب ہے" ؟

وسنت :- "نامناسب ہی تو نہیں۔ آخر کھڑے رہنے میں فائدہ ہی کیا ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھئے۔

راگنی :- (بیٹھتے ہوئے) "معاف فرمایئے۔ مدعا یہ تھا۔ کہ آپ کے پاس بیٹھنا مناسب نہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہوا۔ کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں !

وسنت :- "مگر ناواقفیت کا اشتہار بنے رہنے میں بھی تو فائدہ نہیں۔ کیا آپ مجھے نہیں جانتیں ؟

راگنی :- "نہیں ہمارا ابھی تعارف نہیں ہوا۔ آج اتفاق ہی سے آپ کو اس باغ میں دیکھا ہے"

وسنت :- "بجا۔ ---- ---- ---- اور یہ اتفاق بھی کتنا خوبصورت ہے"

(درخت پر کوئل ایک غمناک صدا بلند کرتی ہے)

"کوئل کو سنئے۔ کتنا دانشمند پرندہ ہے۔ زیادہ تر پرندے بیوقوف ہوا کرتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہی وہ شادی کر لیتے ہیں۔ اور باقیماندہ عمر بچوں کی پرورش اور ان کے دانہ دنکا چننے میں گذرتی ہے۔ کوئل کی یہ بات نہیں۔ وہ شادی نہیں صرف محبت کرتی ہے۔ اور انڈے کسی بیوقوف کوّے کے گھونسلے میں رکھ دیتی ہے۔ وہ بچوں کی پرورش نہیں کرتی۔ ان کی تعلیم کا بل اوا نہیں کرتی۔ وہ صرف چہچہاتی ہے۔ اور محبت کرتی ہے۔ کتنا عقلمند پرندہ ہے" ؟

راگنی :- "مگر یہ خود غرضی ہے۔ دانش وری نہیں"

وسنت :- "بجا۔ مگر عقلمند انہ خود غرضی۔ بلبل بھی کوئل کی طرح عقلمند ہے۔ وہ اپنے انڈے خود نہیں سیتی۔ وہ انڈہ دیتے ہی اطلاعی صدا بلند کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ زمیندار آکر انڈہ اٹھا لیتا ہے۔ اور اسے سینے کے لئے کسی بیوقوف مرغی کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ کتنی ہوشیار ہے بلبل"

راگنی :- "وہ ہوشیار تو دکھائی نہیں دیتی"

وسنت :- "جسم بھدا ہی سہی۔ مگر فعل سے ہوشیاری ظاہر ہے۔ دنیا کو بیوقوف دکھائی دینا بھی عقلمندی ہے۔ اس سے اپنی حفاظت کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلبل کی منطق ہے"

(راگنی اس فلاسفی پر کچھ حیران سی دکھائی دیتی ہے وہ آگے کی طرف جھکتی ہے۔ معمولی سا وقفہ)

"آپ کچھ تکلیف محسوس کر رہی ہیں۔ میری طرح درخت سے پیٹھ لگا کر آرام دہ طریق پر بیٹھئے۔ نہایت اچھا درخت ہے۔ میں نے اسی لئے منتخب کیا ہے"

راگنی :- (درخت کے ساتھ پشت لگانے کی کوشش کرتی ہے مگر پھر سیدھی ہو جاتی ہے) "آج گرمی ہے کچھ اور گرمی میں درخت سے بیٹھنا کچھ موزوں دکھائی نہیں دیتا"

وسنت :- "اس میں درخت کا نہیں۔ کھدر کی موٹی چادر کا قصور ہے۔ سر سے چادر اتار دیجئے اور پھر ہوا کا لطف لیجئے۔ اگر گردن کو ہوا نہ چھوئے تو سارے جسم کو پسینہ آ جاتا ہے جسم کا حساس ترین حصہ صرف سر اور گردن ہے"

راگنی :- (سر ٹکا کر کے درخت کے ساتھ لگ جاتی ہے) اخاہ اب کچھ ہوا لگی ہے۔

وسنت :- (محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر) اس انداز میں آپ کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں۔ موٹے کپڑے سے سر ڈھانپے رکھنا جہالت کے زمانے کی یادگار ہے"

راگنی :- "آپ" ......

وسنت :- (بات کاٹ کر) "میں سچ کہتا ہوں مس راگنی۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔ کالج میں آتے جاتے بارہا آپ کے سر سے ساڑھی کھسل جاتی ہے۔ اور میری نگاہیں

ان بالوں پر ہی لگی رہتی ہیں۔ کالج میں اور بھی کتنی ہی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ لیکن یہ بات کہاں؟ قدرت نے راگنی کی بناوٹ میں انتہائی فراخدلی سے کام لیا ہے۔"

راگنی:۔ "آپ کو ایک لڑکی سے ایسی باتیں واجب نہیں ہیں۔"

وسنت:۔ "کیوں نہیں؟ کیا اظہارِ حقیقت بھی لڑکیوں کی دنیا میں جرم ہے؟"

راگنی:۔ "جرم تو نہیں۔ لیکن کیا آپ کو ایسی باتیں زیب دیتی ہیں؟"

وسنت:۔ "پھر وہی دلیل؟"

راگنی:۔ "مطلب یہ ہے کہ مردوں کو لڑکیوں سے ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔"

وسنت:۔ "اگر الفاظ غلط نہ ہوں تو پھر میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ آپ کے بال سچ مچ بڑے خوبصورت ہیں۔ آپ کی آنکھیں بھی کتنی خوبصورت ہیں۔ اور آپ کے رخسار ——— ان میں یکایک یہ چمک کیسے پیدا ہو اٹھی ہے دفاتحانہ انداز میں کیا میں ان الفاظ کا حقدار نہیں؟"

راگنی:۔ "بس" (راگنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

وسنت:۔ "یہ کیا بات ہے؟ مس راگنی آپ تو رو رہی ہیں۔"

راگنی:۔ "میں۔ نہیں۔"

وسنت:۔ "کیوں نہیں۔ یہ آنسو تو دیکھئے۔ میں نے کچھ برے الفاظ کہہ دیئے ہیں کیا؟"

راگنی:۔ "نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ صرف آپ کو ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں" (رومال نکالتی ہے)

وسنت:۔ "آنکھیں پونچھ ڈالئے۔ آپ ناپسند کرتی ہیں تو میں خاموش رہوں گا۔ آؤ ہم اچھے بچوں کی طرح صلح کر لیں۔" (راگنی کے ہاتھ سے رومال لے کر اس کے آنسو پونچھتا ہے)

راگنی:۔ "شکریہ" (رومال لے کر جیب میں رکھ لیتی ہے) "آپ کتنے بے تکلف ہیں۔ میں حیران ہوں۔"

وسنت:۔ "اور اسی بے تکلفی میں زندگی ہے" (اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ اور اسے نرمی کے ساتھ اپنی طرف کھینچ کر اس کے گلابی لبوں کو چوم لیتا ہے)

راگنی:۔ "یہ سراسر ناواجب ہے مسٹر قطعی طور پر ناواجب۔"

وسنت:۔ "کوئی وجہ بھی تو؟"

راگنی:۔ "اس لئے کہ آپ کو کسی لڑکی کا بوسہ نہیں لینا چاہئیے۔"

وسنت:۔ "لڑکی کا بوسہ نہیں لینا چاہئیے؟ آخر لڑکیاں پیدا ہی کس لئے ہوئیں؟"

راگنی:۔ "مگر بوسے کا حق محض محبت سے پیدا ہوتا ہے۔"

وسنت:۔ "اور یہی بوسہ میری محبت کا ثبوت ہے۔ آپ کے بال کتنے خوبصورت ہیں مس راگنی۔ بالکل ریشم کے گچھے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا میں انہیں چھو سکتا ہوں" (راگنی خاموش رہتی ہے) (وسنت اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتا ہے)

"محبت ہی دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے محبت کے بغیر یہ دنیا تاریک ہوتی۔"

راگنی:۔ "محبت ہی انسان میں حقیقی روح ہے مسٹر وسنت"

وسنت:۔ "خوب کہا۔ آپ ان الفاظ کے لئے انعام کی حقدار ہیں۔ آپ بلا سہارے بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں گی۔ میرے سینہ پر سر رکھ لیجئے" (راگنی ایسا ہی کرتی ہے)

(پیڑ پہ کوئل بولتی اور ایک قریبی شاخ پر جنگلی کبوتر پھڑپھڑاتا ہے)

راگنی:۔ "خیال ہے کہ آپ کی محبت دیرپا ثابت ہوگی"

وسنت:۔ "ہاں میری محبت ایک بہتی ندی کے پانی کی طرح ہے جس میں کبھی ٹھگاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ میں مستقل طور پر محبت کرتا ہوں۔"

راگنی:۔ "اور میں شاید پہلی لڑکی ہوں جس سے آپ نے زندگی میں پہلی بار محبت کی ہے۔"

وسنت:۔ "ہاں مس راگنی وہ پہلی لڑکی ہے جس سے یہ سنے اس پرفضا منظر میں اور اس گھنے درخت تلے محبت کی ہے۔"

راگنی:۔ "کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اس سے پہلے بھی کسی سے محبت کر چکے ہیں۔"

وسنت :- مجھے شہر کی کسی ایک لڑکیوں کے ساتھ محبت کا فخر حاصل ہے ''

راگنی :- (رالگ ہوتے ہوئے) ''پھر آپ نے کیسے کہا کہ میری محبت مستقل ہے - ایک بہتی ندی کی طرح اُنکاؤ سے غیر آشنا ''

وسنت :- اس لئے کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی کے ساتھ محبت کا سلسلہ قائم کئے رکھتا ہوں - اسے ٹوٹنے نہیں دیتا ''

راگنی :- (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) ''میں آپ کے ساتھ رسمی تعارف کی روا دار بھی نہیں - اچھا ہوا میں نے آپ کا نام تک دریافت نہیں کیا - ہم ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں - خدا کرے ہم کبھی آشنا نہ ہوں ''

وسنت :- ''میرا نام وسنت ہے مس راگنی - میں فورتھ ائیر میں پڑھتا ہوں (اٹھتے ہوئے) آپ اپنے ساتھ کتابیں بھی لائی تھیں - مجھے ان کے مطالعہ میں مدد لینی ہی نہیں ''

راگنی :- مطالعہ کیلئے یہ جگہ موزوں نہیں - آپ نے میرا وقت ضائع کیا ہے وسنت ''

(چند گز کے فاصلہ پر سامنے کی ایک جھاڑی سے ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکا کتابیں لئے ہوئے نکلتے ہیں - راگنی لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر جھینپ جاتی ہے وسنت لڑکے کو دیکھ کر مسکراتا ہے - لڑکی کچھ آگے بڑھتی ہے اور راگنی کو اشارہ کرتی ہے - وہ دونوں اکٹھی باغ سے باہر نکل جاتی ہیں)

نوجوان :- ''ہم نے آپ کو یہاں اکیلے چھوڑا تھا - مس راگنی کہاں سے آ ٹپکیں ''

وسنت :- ''آپ تو بڑی بے اعتنائی سے مجھے یہاں اکیلے چھوڑ کر اپنی محبوبہ کے ساتھ اس جھاڑی میں جا بیٹھے - مگر خدا نے میری بے بسی اور تنہائی پر رحم کھا کر میرے لئے بھی ایک محبوبہ بھیج دی ''

نوجوان :- ''گویا آپ نے بھی محبت کی کچھ منزلیں طے کر لی ہیں ''

وسنت :- ''محبت کی نہیں - صرف تعارف کی منزلیں طے کی ہیں ''

رعنا نظامی

محرومِ نشاط

جگمگاتا جب اُبھرتا ہے افق سے آفتاب جب تجلی زار بن جاتی ہے بزمِ کائنات!
بانٹتا ہے ساقیٔ میخانۂ فطرت شراب رندِ مستِ آشام پر کھلتے ہیں اسرارِ حیات
نغمہ پیرا ہو گیا اس طرح ہستی کا رباب گم ہوا مضراب کے تاروں میں چرخِ نیلگوں
ظلمتِ اندوہ نے اوڑھی ہے تسکیں کی نقاب عالمِ ہستی کا ہر ذرہ ہے دنیائے سکوں
کہتے ہیں سب دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر آہ! اس احساس سے شاعر کا دل بیگانہ ہے
شمع کے جلنے کا ہوتا ہے پتنگوں پر اثر زندگی ایفائے عہدِ شمع و پروانہ ہے
ہو سکوں کیونکر مجھے حاصل کہ سینے میں مرے ایک دلِ دیوانۂ اُلفت ہے اور ارماں ہزار
زیرِ خاکِ نامرادی دب گئے سب ولولے کیوں نہیں کرتی بپا طوفاں نگاہِ اشکبار
ذوقِ جذب و ضبط اپنے بس کی شے ہمدم نہیں بے نتیجہ ہی رہا قلب و نظر کا ارتباط
کچھ سوائے گریۂ پیہم علاجِ غم نہیں زندہ جب تک ہوں مجھے رہنا ہے محرومِ نشاط

دیاکرشن گردشؔ

نقوشِ ماضی

یہ شبِ تیرہ، یہ خاموشی یہ تنہا ساعتیں   طاقچے پر گاہے گاہے تھرتھراتا ہے چراغ
ناچنے لگتے ہیں دیواروں پہ کالے سے نقوش   دیکھ کر جیسے جواں عورت کو بوڑھوں کے دماغ

کھونٹیوں پر چند بے ترتیب میلی چادریں   میز پہ چینی صنم گر کا زنانہ شاہکار
آئینے میں لڑکھڑاتی شمع کا عکسِ جمیل   جس طرح ساغر میں غوطہ زن نگاہِ مے گسار

سامنے روزن میں دھندھم سے تاروں کی جھلک   سسکیاں بھرتی ہے دروازے پہ رہ رہ کر ہوا
گاہے گاہے ایک چمگادڑ کی کمرے میں اڑان!   چھت پہ اک چڑیا کے پیہم پھڑپھڑانے کی صدا

شب کی اس پرہول تنہائی میں بھر آتا ہے دل   خامشی کے ساز پہ روتی ہے عمرِ بے ثبات
پھر بھڑک اٹھتی ہے سینے میں محبت کی چتا!   آنسوؤں میں تیرنے لگتی ہے ساری کائنات

پھر تخیل ان حسیں راتوں کا کرتا ہے طواف   جب اسی وحشت کدے میں دل کو ملتا تھا سکوں
جب تمناؤں کی گودی میں مچلتا تھا شباب   جب نظر آتا تھا ہر شے میں فسوں اندر فسوں

دم بدم جھنکار پازیبوں کی آتی تھی قریب   اور پھر باہر کے دروازے پہ ہلکی سی تھپک
وہ قدم رکھتے تھے اس کمرے میں اس انداز سے   جیسے صحرا میں ہوا کے ساتھ پھولوں کی مہک

زلفِ شبگوں میں مہک عنبر کی دل کا پیچ و تاب   چشمِ جادوزا میں شعلے کی چمک مے کا خمار
عارضوں میں پھول کی سرخی محبت کی مٹھاس   تن میں نغموں کی لچک تازہ شگوفوں کا نکھار

مرمریں شانوں پہ ساڑھی کا سنہری حاشیہ   قرمزی جمپر سے تن کی دلفریبی میں اٹھان!
دلنشیں رخ چودھویں کے چاند کا عکسِ لطیف   آتشیں ہونٹوں پہ جامِ ارغوانی کا گمان

گرمیوں میں دوپہر کے وقت لیکن ایک دن   مسکراتے پھول کی نزہت خزاں نے چھین لی
بجھ گیا اٹھتی جوانی میں تمنا کا چراغ!   سو گئی آغوشِ ویرانی میں یکسر زندگی

میں ابھی زندہ ہوں فرقت میں تڑپنے کے لئے   جس طرح صیاد کے پنجے میں مرغِ بے نوا
یا لحد پہ ٹمٹماتا ہو کہیں تنہا چراغ!   جل رہی ہو یا شبِ تیرہ کو مرگھٹ میں چتا

نشتر سمیلپوری

نرسنگداس نرگس کے نام

حسینہ کی جلتی چتا کو دیکھ کر

وہ مرمریں کھلونا وہ سرو قد حسینہ — الماس کی صراحی بے مثل آبگینہ
شرم و حیا کی پتلی، انداز کا خزینہ — تھا نکہتیں لٹاتا جس شوخ کا پسینہ
دھومیں مچی ہوئی تھیں کل جس کے بانکپن کی — گلشن سے بھی سوا تھیں رنگینیاں پھبن کی
ہر عضو تن انوکھا، ہر خال و خد امولا — کھاتا تھا رشک جس کی رفتار پہ ممولا
لیتی تھیں خاک پا کی پریاں بلائیں آ کر — حوریں بھی سیکھتی تھیں جس سے ادائیں آ کر
لاکھوں شباب ہوتے تھے کل نثار جس پر — سو جان سے فدا تھے لیل و نہار جس پر
ہاں جس کی پیاری ایسی صورت کے تذکرے تھے — سیرت کے تذکرے تھے صورت کے تذکرے تھے

چھلکتا تھا جس کا جوبن مخمل سے بھی قبا میں!
وہ آج سو رہی ہے جلتی ہوئی چتا میں!

شوہر تڑپ رہا ہے ماں باپ رو رہے ہیں — ساس اور سسر الگ سے بے حال ہو رہے ہیں
بھائی بہن کے لب پر نالے ہیں ہچکیاں ہیں — آنکھوں سے اشک جاری ہیں سینہ کوبیاں ہیں
ہر سمت یاس و حسرت کی نوحہ خوانیاں ہیں — خوف و ہراس و دہشت کی حکمرانیاں ہیں
مرگھٹ کی یہ اداسی سو راز ہے سمجھاتی! — آنکھوں میں ناچتی ہے دنیا کی بے ثباتی
ان ہولناکیوں سے ہے روح کانپ جاتی — ہر چیز اس جگہ کی انساں کو ہے ڈراتی
ہر غمزدہ چتا کو حیرت سے تک رہا ہے — ہر قلب میں قضا کا کانٹا کھٹک رہا ہے
گیسو جھلس چکے ہیں اعضا جھلس رہے ہیں — ہر سمت سے چتا کے شعلے بھڑک رہے ہیں

دست اجل کو یہ کہنا، شیدائے حسن فانی!
وہ راکھ ہو چلی ہے، اٹھتی ہوئی جوانی!

دولت رام گپت

پردیسی پریتم

رام ناتھ شہر کے بلکہ سارے ضلع کے اچھے قانون دان تصور ہوتے تھے۔ اس بیکاری کے زمانہ میں بھی سینکڑوں روپیہ ماہوار کی آمدن موجود تھی۔ ایک اچھے وکیل ہونے کے لئے جو اوصاف درکار ہیں۔ وہ ان میں سب کے سب موجود تھے۔ ذاتی عیش و عشرت کے علاوہ آپ دریا دلی سے خرچ کرتے۔ سیر و سیاحت کے بھی شوقین تھے۔ لیکن وہ اس قسم کی سیاحت سے دور رہتے جو مشاہدات یا یا تاریخی مقامات کو دیکھ لینے تک یا قوم و ملک کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ تک محدود ہوتی ہے۔ ان کی غرض سیاحت سے معلومات حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ محض تفریح طبع تھی۔ ہر سال تعطیلات میں وہ کسی نئی جگہ سیر کے لئے جاتے لیکن پہاڑوں پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہاں اس مرتبہ وہ کسی پہاڑی وادی کی سیر کا تخیل باندھ رہے تھے۔ پروفیسر راج موہن جو مسٹر رام ناتھ کے دوست اور مقامی کالج کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات بتا کر مشورہ دیا تھا کہ سیرگاہ اگر ہے تو پہاڑ۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ حسن و جمال کی تجارت کرنے والی یعنی بڑے شہروں میں رہنے والی عورتیں بناؤ سنگار سے کتنی ہی حسین و جمیل بن جائیں وہ پہاڑی لڑکیوں کے خداداد حسن قدرتی خوبصورتی اور بھولے پن و نفیس گی کو نہیں پہنچ سکتیں۔ سرسبز و شاداب پہاڑی جہاں کے قدرتی مناظر کی گود میں پلی ہوئی دیہاتی دوشیزائیں شباب و حسن کا ایک نیا عالم لئے ہوتی ہیں۔ باغوں کی کیاریاں اور گملوں کے پھول کتنے ہی شاداب اور شگفتہ ہوں۔ پہاڑی وادی کے خود رو پھولوں کی تر و تازگی کو نہیں پہنچ سکتے۔

رام ناتھ اسی لئے للچائی ہوئی نگاہ سے پہاڑی وادی کا منظر تخیل میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ کلی کا رستہ بنا ہوا تھا۔ دوسرے ہی روز تیاری ہونے لگی۔ مختصر سا سامان بند کیا گیا علاوہ چند ضروری چیزوں کے فوٹو لینے کے لئے کیمرہ بھی ساتھ لیا گیا

ایک دو میں چند ہلکی قسم کی سگرٹوں کے ڈبے بھی سامان میں رکھ لئے گئے۔ اور یہ محض اس لئے کہ پروفیسر راج موہن نے پہاڑیوں اور پہاڑنوں سے میل ملاپ اور بے تکلفی پیدا کرنے کے لئے بتلایا تھا کہ سگرٹ کی ایک ڈبیہ دینے پر پہاڑی لوگ ممنون احسان ہو جاتے ہیں۔ ہرے بھرے درخت۔ گلہائے رنگا رنگ۔ جن کی خوشبو سے چڑھائی میں ہانپتے ہوئے جانے والے مسافروں کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ پھول لہلہا رہے تھے۔ اور پرندے ہری ہری گھنی چھاؤں کے جھرمٹ میں بیٹھے نغمے الاپ رہے تھے۔ آس پاس کے کھیتوں میں عورتوں کی ٹولیاں فصل کاٹ رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی میٹھے سروں میں گیت بھی گائے جا رہی تھیں۔ چرواہے مویشی چرا رہے تھے۔ اور تانیں اڑا رہے تھے۔ مسٹر رام ناتھ محسوس کرنے لگے کہ گویا وہ جیتے جی بہشت میں آ گئے ہیں۔

ایک چشمے کے کنارے لمبے لمبے سایہ دار درخت کھڑے تھے دوپہر ہو چکی تھی۔ پہاڑ پہ چلنے سے بھوک بہت لگتی ہے مسٹر رام ناتھ بھی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھے بھلا پہاڑوں پر ایسی جگہوں کی کیا کمی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر اور صاف پتھر پہ بیٹھ کر پہاڑی منظر کا استقبال کرنے لگے۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ان کے کانوں میں ایک میٹھی اور رسیلی تان کی آواز آئی۔ غور سے سننے پر معلوم ہوا آواز نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ اب سریلی آواز کے ساتھ الفاظ بھی کانوں میں آ رہے تھے۔ گویا یوں تھے۔

دھارے دھارے چلنا ہو
من میرا راجی رکھنا ہو
دل میرا راجی رکھنا ہو

رام ناتھ پر یہ سریلی آواز ایک کیف طاری کر چکی تھی۔ وہ آنکھیں

بند کئے ہوتے سُن رہے تھے۔ الفاظ معانی وہ سب کے سب نہ سمجھ سکے۔ اس کی انہوں نے پرواہ بھی نہیں کی۔ وہ آواز پر ہی مست ہو کر جھوم رہے تھے۔ کہ یکایک آواز بند ہو گئی۔ اُدھر آواز بند ہوئی اِدھر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلہ پر ایک لڑکی کندھے پر چھڑی رکھے ان کی جانب حیرانی سے تک رہی ہے۔ اس کے آگے آگے دس پندرہ بھیڑیں اسی چشمے کی طرف آ رہے ہیں۔ لڑکی کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ سڈول، اور چست جسم۔ بھولی صورت۔ جوانی نے اس کے گالوں میں گلابی بھر دی تھی۔ صاف چہرہ۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں شباب کا ہلکا نشہ انگڑائی لے رہا تھا ——— مسٹر رام ناتھ نے حسن و شباب کے بہت سے مجسمے دیکھے تھے مگر اس پہاڑن کے قدرتی اور اچھوتے حسن و شباب میں جو دلکشی تھی۔ وہ کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ وہ خاموش تھی لیکن تعجب سے ایک جنگلی ہرن کی طرح رام ناتھ کو دیکھ رہی تھی۔

"تم گاتے گاتے چپ کیوں ہو گئیں" رام ناتھ نے کہا ——— اس نے شرما کر سر جھکا لیا ——— لیکن اس کو متوجہ کرنے کی غرض سے رام ناتھ نے سوال کیا "یہ جانور کس کے ہیں؟"

"میرے باپ کے" دوشیزہ نے دبی زبان میں شرماتے ہوئے جواب دیا۔

تمہارا باپ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟ رام ناتھ نے بے تکلف ہونے کے لئے ہنس کر کہا۔

"وہ بوڑھا ہے گھر پہ رہتا ہے"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"اس گاؤں میں۔ اس طرف۔ وہ . . ."

"تمہارے گھر اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں"

"اور تمہاری ماں؟"

"مر گئی ہے"

"تمہاری شادی ہو گئی ہے کیا؟" رام نے ہنستے ہوئے ایک انوکھا سوال کیا۔

لڑکی کا چہرہ یہ سوال سنکر نسوانی شرم و حیا سے تمتما اُٹھا۔ وہ آہستہ سے بولی "ابھی نہیں"

"تمہارا گاؤں کتنی دور ہے یہاں سے"

"پاس ہی ہے"

"میں تھک گیا ہوں آرام کروں گا"

"آپ آئے کہاں سے ہیں بابو جی"

"لاہور سے"

اتنے ہی میں پہاڑی قلی ہانپتا ہوا بوجھ اُٹھائے آ پہنچا۔ اس کے پاس کھانے کا سامان۔ رین کوٹ چھتری کیمرہ اور دوربین تھی۔ آتے ہی اس نے بابو کی طرف اس نگاہ سے دیکھا۔ کہ کہیں پیچھے رہ جانے سے بابو ناراض تو نہیں ہو گئے۔

"آج یہاں کے گاؤں میں رہیں گے" رام ناتھ نے قلی کو حاکمانہ انداز میں کہا۔

"بہت اچھا جی" قلی نے جواب دیا۔

"آپ بھی تمبو لگا کر رہیں گے بابو جی" لڑکی نے سوال کیا۔

تمبو تم جانتی ہو تمبو کو۔ تم نے کبھی دیکھا ہے کیا؟ رام ناتھ نے پوچھا۔

"ہاں" لڑکی بولی "ایک صاحب پچھلے سال شکار کرنے آیا تھا وہ تمبو میں رہتا تھا۔

ٹھیک میں تمبو میں نہیں رہوں گا ——— لڑکی رام ناتھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا یہ جاننا چاہتی تھی کہ تمبو نہیں ہے تو کہاں رہو گے۔ رام ناتھ اس کے انداز کو سمجھ گئے۔ اور کہا۔

"گاؤں میں گھر نہیں ہیں کیا؟"

"گھر کیوں نہیں۔ میرا گھر ہے اور گاؤں والوں کے گھر بھی ہیں" لڑکی نے ہنس کر کہا۔

"تو بس تمہارے گھر ہی رہیں گے" رام ناتھ نے کہا۔ "رہنے دو گی نا؟"

لڑکی کو رام ناتھ کی اس بات کا یقین نہ آیا کہ وہ ہمارے گھر رہیگا۔

شکاری صاحب تو کسی کے گھر نہیں جاتا تھا۔ گاؤں سے دور کھیت میں تمبو (خیمہ) لگا کر رہتا تھا۔ اور اس کا نوکر گاؤں والوں سے کہتا "تمہارے گھروں کے آس پاس گندگی بہت ہوتی ہے۔ صاحب لوگ جب ابھی راستہ شکار کے لئے جاتے۔ تو ناک پر رومال رکھ لیتے" بھلا یہ ہمارے گھر کیسے رہے گا؟"

"تم چپ ہو گئیں۔ اپنے گھر نہ رہنے دو گی؟" مسکراتے ہوئے رام ناتھ نے پوچھا۔

"کیوں نہ رہو۔ پر ہمارا گھر تم کو پسند نہیں آئے گا۔"

"میں خوشی سے رہوں گا تمہارے گھر۔"

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام پھول دئی ہے۔" لڑکی نے شرما کر کہا۔

"پھول دئی" بالکل ٹھیک نام ہے۔ تم ہو بھی پھول کی طرح۔ لڑکی اور شرمائی لیکن اسے خوشی بھی ہوئی۔ عورت فطرتاً اپنی تعریف پسند کرتی ہے خواہ پہاڑن ہو یا کوئی اور۔ وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر گاؤں کی طرف چلنے لگی۔

رام ناتھ آج اسی گاؤں میں ٹھہرے۔ پھول کے بوڑھے باپ نے پردیسی بابو کو اپنے مکان میں رہنے کی بخوشی اجازت دے دی پہاڑی دہقان میزبان بن کر پر تکلف دعوت نہیں کھلا سکتا۔ اور نہ مہمان کی نیت پر کسی قسم کا شک ہی کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں مہمان کے لئے عزت اور عقیدت ہوتی ہے۔

آفتاب ایک اونچی برف آلود پہاڑی کی اوٹ میں سو رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ گاؤں کے بچے جوان لڑکیاں۔ لڑکے سب بوڑھے کے مکان پر ٹھہرے ہوئے بابو کو دیکھ رہے تھے۔ مہمان کی ہر چیز ان کے لئے تماشہ تھی جلتا ہوا سٹوو صاف بستر چینی کے جگ اور برتن ان لوگوں کے لئے عجوبہ تھے۔ مسٹر رام ناتھ بچوں کو میٹھے بسکٹ اور گاؤں کے آدمیوں کو سگریٹ تقسیم کر رہے تھے۔ سب خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں پھول آئی اور ہنستی ہوئی ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اور ان چیزوں کو دیکھنے لگی۔

"تم بہت خوبصورت ہو لکھو تو تمہاری تصویر کھینچ دوں" رام ناتھ نے پھول کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"کیسی تصویر بابوجی؟" شرماتی ہوئی پھول بولی۔

رام ناتھ نے اپنی تصویر نکال کر دکھلائی اور کہا "دیکھو جیسی یہ میری تصویر ہے۔ ویسی ہی تمہاری تصویر بھی کھنچ جائے گی۔"

سچ بابوجی۔ میری بھی ایسی ہی تصویر بنا دو گے؟" پھول بہت خوش ہو کر بولی۔

"ہاں ہاں اس سے بھی اچھی۔"

رام ناتھ نے کیمرہ نکالا اور پہاڑی دوشیزہ سے کہا "سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔

لڑکی نیچی نظر کئے سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دوسرے دیکھنے والے للچائی ہوئی نگاہ سے خوش ہو کر دیکھنے لگے — تاکہ بابوجی ہماری بھی ایک ایک تصویر کھینچ دیں

"اس طرح کھڑے ہونے سے اچھی تصویر نہ بنے گی۔ رام ناتھ نے کہا۔

"پھر کیسے بابوجی"؟ بھولی بھالی لڑکی بولی۔

"خوب تن کر کھڑی ہو جاؤ۔" رام ناتھ نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ کہنے کے مطابق کھڑی ہو گئی۔

"جس طرح میں تمہاری طرف دیکھتا ہوں۔ تم میری طرف دیکھو" رام ناتھ نے کہا۔

رام ناتھ لڑکی کی جانب للچائی ہوئی اور پیار کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لڑکی نے بھی ویسے ہی دیکھنا شروع کیا — میں جس طرح مسکراتا ہوں تم بھی مسکراؤ۔

لڑکی نے مسکرا کر کہا "کیوں؟ اس طرح بابوجی"۔

بالکل ٹھیک ——— تصویر لے لی گئی۔ دوشیزہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ اس کے بدن میں بجلی دوڑ رہی ہے۔ کچھ اندھیرا ہوئے پھول اپنے مہمان کو دودھ دینے کے لئے گئی۔ دودھ پیتے ہوئے رام ناتھ نے ارادتاً اس کے ہاتھوں کو چھو لیا۔ دوشیزہ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ وہ بے اختیار رام ناتھ

پر جھک گئی اور رام ناتھ نے اسے آغوش میں لے لیا۔

سیدھی سادھی دیہاتی لڑکی رام ناتھ کی خواہشات کے دام فریب میں پھنس گئی۔ اس کا دل چاہنے لگا۔ کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں۔ اور کبھی جدا نہ ہوں۔

"کب تک رہو گے بابو جی"؟

"جب تک تم کہو گی"

"سچ"؟

"ہاں سچ"

سامنے پہاڑ کی چوٹی پر چاند چمک رہا تھا۔ اور چاندنی پہاڑ کی چوٹی پر پڑی سفید برف پر پڑ رہی تھی۔ ایک پسندیدہ نظارہ تھا۔ ادھر گاؤں سے پرے جو اسی پہاڑی کے دامن میں آباد تھا۔ ایک عورت اور ایک مرد اسی دلفریب منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اور عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ بھولی بھالی پہاڑی لڑکی کو کیا معلوم تھا۔ کہ محبت جو اس کے دل میں ہے۔ اس کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔

"تم میرے ساتھ ہمیشہ رہنا پسند کرو گے"؟ پھول نے پوچھا

"تم بار بار کیوں پوچھتی ہو پھول؟ کہہ جو دیا کہ ہاں"، رام ناتھ نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم یہاں میرے ساتھ رہو گے یا مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے"؟

"جیسے تم چاہو"

پھول رام ناتھ پر بچھا ورتھی۔ اسے رام ناتھ کے وعدوں پر پورا الیقین تھا پھول اس لئے خوش تھی کہ وہ رام ناتھ کے ساتھ جا کر ساری زندگی عیش و آرام کے ساتھ گذارے گی دو ہفتہ تک رام ناتھ اسی گاؤں میں رہا سیر و تفریح کے علاوہ دیہاتیوں سینریوں کے فوٹو لینا۔ اور پھول کے ساتھ رہنا دن رات کا مشغلہ تھا۔

ایک دن رام ناتھ نے بتایا۔ کہ وہ اب واپس پنجاب چلا جائیگا

پھول نے پوچھا "کیا اکیلے"؟

"ہاں ابھی پھر آ کر لے جاؤں گا۔ ابھی تمہارے لئے زیور بھی بنوانا ہے"

رام ناتھ کے وعدوں پر یقین کر کے بھولی بھالی پہاڑن لڑکی نے آنسوؤں اور ٹھنڈی آہوں کے ساتھ رام ناتھ کو الوداع کہی اور خود اس انتظار میں بیٹھی۔ کہ اب آکر اسے رام ناتھ لے جائیگے سہیلیوں نے سمجھایا کہ پردیسی کا کیا بھروسہ؟ لیکن پھول کو ان کی بات پسند نہ آئی۔ وہ اب بھی پردیسی پریتم کا منتظر ہے۔ اور جانے کب تک رہے؟

درسا جاودانی

نور و نار

عشق اک آزار بن کر رہ گیا　　نور یکسر نار بن کر رہ گیا

بے زبانی کی زباں پر حالِ دل　　بے اثر گفتار بن کر رہ گیا

ہائے اس قطرے کی ناکامی نہ پوچھ　　جو دُرِ شہوار بن کر رہ گیا

اشکباری آنکھ کی تھمتی نہیں　　ابرِ باراں بار بن کر رہ گیا

خود مصور دیکھ کر تیرا جمال　　نقش بر دیوار بن کر رہ گیا

رہرو راہ محبت تھا درسا
خاک کوئے یار بن کر رہ گیا

بشیر

غزل کی تدریجی ترقی

غزل اردو شاعری کا جزوِ لاینفک ہے۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو اردو شاعری تغزل کے مترادف ہے۔ شاعری کی ابتدا سے انتہا تک نظر کریں غزل ہر عہد میں آپ کو موجود نظر آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں مرد اور عورت برابر کے ساتھی ہیں۔ ان دونوں کا وجود ہی دنیا کے قیام اور بقا کا پیش خیمہ ہے علاوہ ازیں حسن و عشق کے لطیف جذبات قلوب انسانی پر ہمیشہ سے مسلط رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے، اس لئے ہر ایک لٹریچر میں تغزل کا ہونا لازمی ہے۔

ہمارے یہاں اردو میں خاص طور پر غزل کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ امتدادِ زمانہ سے جہاں اور چیزوں میں انقلاب آیا وہاں ہمارا رنگِ تغزل بھی مختلف وقتوں میں مختلف رہا ہے موجودہ تحقیقات کا جہاں تک تعلق ہے اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اگرچہ اس کا ظہور مذہبی رنگ میں ہوا اور نعت و منقبت کی طرف شعرا کی توجہ زیادہ رہی۔ لیکن غزل کو ثانوی حیثیت ضرور حاصل رہی چنانچہ دکن کے بعض بادشاہوں اور ان کے درباری شعرا کے دواوین اس کے شاہد ہیں۔ خود سلطان قلی قطب شاہ کا دیوان بھی چھپ چکا ہے ان کی اور ان کے ہمعصر شعرا کی غزلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں غزل پر دکنی رنگ غالب رہا ہے۔ ہندی کی تقلید میں عاشق عورت اور معشوق مرد ہے۔ جذبات پاکیزہ اور واقعیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اگرچہ بانکپن نہیں۔ لیکن حسن و عشق کے نیچرل جذبات بلاشبہ ان کے یہاں موجود ہیں۔

دکنی عہد کے بعد شاعری کا مرکز دلی ٹھہرا۔ شمس الدین ولی دکن سے دلی تشریف لائے انہوں نے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ فارسی کی تقلید میں دکنی رنگ کو ایک طرف چھوڑا اور ایک جدید رنگ پیش کیا۔ تشبیہات اور استعارات سے کلام کو سجایا۔ عاشق و معشوق دونوں کے لئے صیغۂ تذکیر قرار پایا۔ ولی بقول مولانا آزاد اردو شاعری کے باوا آدم ہیں جب یہ دلی پہنچے تو اس وقت مدت کی بدامنیوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد حکومت میں امن و چین کا ظہور ہوا تھا۔ ہر طرف تمول، مسرت اور شادمانی کا دور دورہ ہوا۔ شعر و شاعری کے چرچے جو زمانہ امن کا لازمہ ہیں ہونے لگے۔ چنانچہ ابتدائی عہد میں ولی، مضمون اور آبرو ایسے بزرگوں کے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ تصوف کا سمجھا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں تصنع کا نام نہیں۔ اپنے جذبات کو سادہ اور دلنشیں پیرایہ میں ادا کر دیتے ہیں حسن و عشق کے معاملات کو جس خوبی اور عمدگی سے ان بزرگوں نے پیش کیا۔ وہ قابل ستائش ہے تشبیہ اور استعارے جو شاعری اور انشا پردازی کے زیورات ہیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ذہن کو کسی قسم کی کاوش نہیں کرنی پڑتی سلیس، سادہ اور قریب الفہم ہیں کہ خود بخود مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ ایک بات ان بزرگوں کے کلام میں یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ انہوں نے صنعت ایہام کا استعمال خوب کیا اور غالباً یہ چیز ہندی کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندی دوہروں کی بنیاد ذو معنی الفاظ پر ہوا کرتی تھی۔

ان بزرگوں کے بعد کچھ عرصہ تک دلی میں انہی کا رنگ غالب رہا۔ لیکن شاہ حاتم اور مرزا جان جاناں مظہر کی غزلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صنعت ایہام کو ترک کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ ساتھ عارفانہ مضامین ان کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ غزل کی زبان کو پاک و صاف کرنے

میں شاہ حاتم اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدت سے ثقیل الفاظ خارج کئے۔ ان کی جگہ سلیس اور شیریں الفاظ کا اضافہ کیا۔ مرزا جان جاناں مظہر بھی اس معاملہ میں ان سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کی غزلوں میں تصوف کے حقائق و معارف کے ساتھ ساتھ پیار و محبت کی باتیں بھی ہم موجود پاتے ہیں۔ غزل کی زبان کو سادہ اور دلنشین بنانے میں انہوں نے بھی بہت کوشش کی ہے۔ دونو حضرات گوشہ نشین ہونے کی وجہ سے مطالعہ نفس میں مشغول رہے اس لئے ان کا رنگ تغزل پاکیزہ ہے۔

ولی کی تمام تر شاعری میں میر و سودا کا زمانہ اردو شاعری کی ارتقاء کے لحاظ سے سنہری زمانہ تصور کیا جاتا ہے اور پھر غزل تو ان کے عہد میں اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں دنیائے تغزل میر کی ہر مرہون منت ہے جنہوں نے اپنی بے مثال شخصیت اور نرالی طرز سے اس میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ میر کو غزل گوئی میں کمال حاصل ہے وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ ان کا رنگ تغزل مابعد کے شعراء کے لئے مشعل راہ ہے۔ اکثر و بیشتر اساتذہ نے ان کا اتباع کیا اور انہی کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھا لیکن بالآخر اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے اپنی طرف سے سب حد کوشش کی مگر وہ انداز نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ زبان پاکیزہ جذبات اور سوز و گداز جو لوازمۂ تغزل ہیں میر کے یہاں ان چیزوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر اشعار تاثیر میں ڈوبے ہوتے ہیں اور اسی بنا پر قلوب انسانی پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ ان کے جذبات اصلیت اور واقعیت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کی تمام تر زندگی مصائب و آلام اور تنہا نشینی میں بسر ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی شاعری سچی اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دوسروں کی ترجمانی کرنے کے بجائے وہ اپنی غزلوں میں اپنی ہی داستان سناتے ہیں۔

میر کے معاصرین میں سے سودا، درد اور سوز نے بھی تغزل کا ایک صالح مذاق پیش کیا۔ خصوصاً درد کو اس معاملہ میں سب پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کی غزلیں روحانیت اور حسن و عشق کے پاکیزہ جذبات سے بھرپور ہیں۔ ان کا مذاق تصوف بہت بلند اور انوکھا ہے۔ اردو شاعری میں اگرچہ تصوف ابتداء سے لے کر اب تک بدستور موجود ہے۔ لیکن میر درد نے جیسا تصوف اپنی غزلوں میں پیش کیا اردو لٹریچر میں اس کا جواب نہیں۔ غرض کہ درد کی غزلیت اپنے اندر ایک عجیب سج دھج رکھتی ہے۔ سوز کی غزلیں اپنے تمام معاصرین سے سادگی اور صفائی میں ایک علیحدہ شان رکھتی ہیں۔ اگرچہ مضامین کے لحاظ سے وہ چنداں وسیع نہیں۔ غرضیکہ دلی میں غزل پر یہ کیفیت طاری تھی کہ حسن و عشق کے پاکیزہ جذبات کے ساتھ ساتھ تصوف کا سلجھا ہوا مذاق بھی اس میں موجود تھا۔ شعراء مختصر غزلیں کہتے تھے اور ان کی غزلوں میں فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ سب سے بڑی بات جو ہمیں اس عہد کی غزل میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ شعراء نے صنعت ایہام کو کم و بیش ترک کر دیا

دلی کی تباہی و بربادی نے شعراء کو تتر بتر کر دیا اور ان کے اکثر و بیشتر حصہ نے لکھنؤ کی راہ لی اور اس طرح ایک تیسرے مرکز کی بنیاد پڑی۔ اگرچہ دلی میں بھی درباری اثر نے شاعری کو متاثر کیا۔ لیکن شعراء کا معتدبہ حصہ تنہا نشینی اور مطالعہ نفس میں مشغول رہا جس کی وجہ سے دلی والوں کا رنگ تغزل پاکیزہ اور ان کی غزل اعلیٰ و ارفع جذبات کی آئینہ دار رہی۔ اس میں آمد زیادہ اور آورد کا عمل دخل محدود رہا۔ انہوں نے واقعیت اور اصلیت کو حتی المقدور نہ چھوڑا۔ بخلاف اس کے لکھنؤ پہنچ کر شعراء کا مطمع نظر تقرب شاہی ہوا اور رؤسا و امراء کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچانا ان کا نصب العین ٹھہرا۔

اس وقت لکھنؤ کی سوسائٹی لہو و لعب میں بے طرح الجھ رہی تھی اور حسن و عشق کا عامیانہ مذاق اس پر مسلط تھا چنانچہ اردو غزل سوسائٹی کے اسی رنگ میں رنگی جانے لگی۔ اپنے مربی اور آقاؤں کی خوشنودی اور ان کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کے لئے شعراء نے باہم رقابت اختیار کی حسد و بغض پیدا ہوا۔ مقابلے ہوتے تھے کہ کشت و خون سے دریغ نہ رہا۔ اگر ایک شاعر ایک غزل کہتا تو دوسرا اسی زمین میں تین چار غزلیں کہہ ڈالتا۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ شاعر خود ہی ایک زمین میں دو غزلہ، سہ غزلہ اور چو غزلہ تک

نوبت پہنچا دیتا۔ اس سے ایک فائدہ تو ضرور ہوا کہ فنِ شاعری کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اور باہمی مناکشات نے شعراء کی فنی خوبیاں کو جلا دی لیکن مقابلتاً نقصان یہ ہوا کہ تاثیر اور پاکیزگی کا عنصر مفقود ہو گیا۔ کلام میں ابتذال اور بازاری پن پیدا ہوا۔ حسن و عشق کے پاکیزہ جذبات جو شعرائے دلی کی غزلوں میں پائے جاتے تھے۔ ان کا معیار گر گیا اور اب معشوق بازاری قرار پایا۔ غزل میں بھرتی کے اشعار کی فراوانی نظر آنے لگی۔ علاوہ ازیں ایک اور نمایاں وصف جو اس عہد کی خاص یادگار سمجھا جاتا ہے وہ رعایتِ لفظی ہے یعنی صنعتِ مرآۃ النظیر کا استعمال شعرائے لکھنؤ نے بری طرح کیا۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسی چیز کو اپنی شاعری کا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا تھا۔

شعرائے لکھنؤ کے تغزل کی تمام تر دوڑ دھوپ معشوق کے ظاہری خط و خال، زلف و گیسو، کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی تک محدود ہو کر رہ گئی بلکہ شیخ ناسخ اور ان کے شاگردوں نے تو ان خصوصیات کا استعمال یہاں تک کیا کہ ان کے اشعار سے معشوق کے تمام اعضا، لباس اور زیورات کی اچھی خاصی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ ان کی غزلوں میں آمد کم اور آورد زیادہ ہے ان کا تخیل ہرجائی اور بازاری ہے جس کی وجہ سے ان کا مذاقِ تغزل بھی بھونڈا نظر آنے لگتا ہے۔ تصوف جو شعرائے دلی کے کلام میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ وہ یا تو لکھنؤ میں آ کر بالکل نہ رہا یا اگر کہیں اس کی معمولی جھلک دیکھی بھی پائیں تو وہ مستثنیات میں شمار ہوتی ہے۔ شیخ ناسخ کے عہد میں غزل کی زبان قصیدہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی بندشیں بھدی اور زبان ثقیل ہے۔ اور یہی حال ان کے شاگردوں کا معلوم ہوتا ہے۔ اس عہد کے تغزل میں بہت کم اشعار ایسے ملیں گے جن پہ دل پھڑک جائیں۔ البتہ خواجہ حیدر علی آتش نے تصویر کے دونوں رخ پیش کئے ہیں۔ ان کے کلام میں اگرچہ وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا تانا بانا ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ تغزل کا بہترین مذاق بھی ان کے یہاں موجود ہے ان کی تراکیب چست، زبان سادہ اور سلیس ...

سچے، بلند اور پاکیزہ عاشقانہ خیالات کو پیش کرتے ہیں چونکہ وہ ایک تنہا نشین بزرگ تھے اور مطالعۂ نفس کے بہترین مواقع میسر تھے۔ اس لئے کلام میں سنجیدگی اور روحانیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں سوز و گداز جو تغزل کی جان ہے خواجہ صاحب کے کلام میں اس کا معتد بہ حصہ موجود ہے دنیا کی بے ثباتی، فقر و فاقہ اور توکل و قناعت کی منازل کو جس عمدگی سے خواجہ صاحب پیش کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔

ہمارے تغزل میں لکھنوی طرز کا زوال دربار رام پور کی بدولت معرض وجود میں آیا۔ شعرائے دلی غالب، مومن اور داغ کی دربار رام پور سے وابستگی اس کا خاص سبب ہے۔ شاہانِ رام پور خود بھی شاعر اور شعراء نواز تھے۔ ان کے درباروں میں شعر و سخن کے چرچے خوب زوروں پر تھے چنانچہ دلی اور لکھنؤ کے شاعروں کا اتصال اسی دربار میں ہوا۔ جس کی وجہ سے امیر، جلال اور تسلیم لکھنوی کی غزلوں میں دلی کے رنگِ تغزل کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس عہد میں مرزا غالب نے نئے تغزل میں خاص مقام حاصل کیا۔ ان کی ہر بات میں جدت ہی جدت پائی جاتی ہے۔ ان کے مضامین انوکھے اور جذبات تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مضامین کی جابجا بوقلمونی ہے اور بقول شخصے ان کا کلام جامِ جہاں نما ہے جس میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے۔ علاوہ ازیں فطرتِ انسانی کے متعلق مرزا غالب کا مطالعہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ان کی غزلوں میں ظرافت کے پھول بھی اپنی مہک سے دماغ کو تر و تازہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا راستہ سب سے الگ نکالا ہے اور اس معاملہ میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔

غدر ۱۸۵۷ء اور انتزاعِ سلطنتِ اودھ نے ہماری تہذیب و تمدن کا تہس نہس کر دیا جیسا ہمارا سب کچھ بدلا ویسا ہماری شاعری بھی اس انقلاب سے نہ بچ سکی۔ انگریزی عملداری اور انگریزی لٹریچر نے ہمارے علم و ادب کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ چنانچہ ہمارا رنگِ تغزل بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جونہی انگریزی ادب کا پرتو اس پر پڑا اس کے ساتھ ہی ایک علیحدہ طرز کا ظہور ہوا۔ جسے آئندہ اشاعت میں اربابِ ذوق کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ (باقی باقی)

غالب کاشمیری

اُٹھ اَب ہو بیدار

سوز ہستی کے حامل اے ہمت کے سردار
کب سے ہیں جوہر کے تیرے طالب سب غمخوار
تازہ روح کا سائل ہے پھر گیتی کا گلزار
آیا ہے نوروز مبارک اٹھ اب ہو بیدار

اٹھ اب ہو بیدار خدارا اُٹھ اب ہو بیدار!

مطلع تاباں صبح وطن کا کب سے ہے مستور
مدت سے ہے دل ویران اور آنکھیں ہیں بے نور
کیوں اے غفلت کے ماتے تجھ کو یہ منظور!
آخر کب تک رکھے گا تو یوں ہی یہ رفتار

اُٹھ اَب ہو ہشیار خدارا اُٹھ اب ہو ہشیار

آزادی کا شوق نہیں ہے ہرگز تیرا خام
بیداری کا نغمہ بھی ہے تازہ اک پیغام
حیف ہے اس ماحول میں ہو تو مایوس و ناکام
مایوسی و ناکامی ہیں مٹنے کے آثار!!

اُٹھ اب ہو بیدار خدارا اٹھ اب ہو بیدار

ہلچل کا طوفان ہے عالم اور تو ہے خاموش
مردہ قوموں کی رگ رگ میں اُٹھا ہے اک جوش
دنیا جاگی تو ہے اب تک غفلت سے مدہوش
غفلت سے مدہوش ہے تو اے بیخود اے میخوار

اُٹھ اب ہو بیدار خدارا اُٹھ اب ہو بیدار

سورج نکلا، دھوپ چڑھی اور تو ہے محوِ خواب
اوس سے جیسے افسردہ ہو گلزارِ شاداب
اُٹھ کر اپنے سازِ عمل پر مار بھی دے مضراب
نغمۂ نوروز کا تیرے سوز کو ہے درکار!

اُٹھ اب ہو بیدار خدارا اُٹھ اب ہو بیدار

ایم۔ اے۔ عزیز

نوشتۂ تقدیر

افرادِ ڈرامہ

باقر علی۔ امجد کا باپ — زبیدہ۔ امجد کی ماں
بڑی اماں۔ زبیدہ کی ماں — اصغر۔ امجد کا بڑا بھائی
امجد۔ باقر علی کا دوسرا بیٹا — اسد اللہ۔ امجد کا چچا
انور۔ امجد کا ماموں (بڑی اماں کا بھتیجا) — زہرہ۔ انور کی بہن
محمودہ۔ زہرہ کی بیٹی — صادقہ۔ محمودہ کی سہیلی۔
خادمہ

پہلا سین

باقر علی کے وسیع مکان کی آراستہ نشست گاہ میں دو صوفے پڑے ہیں۔ چٹائی پر گل دان دھرا ہے۔ ایک طرف نماز کے لئے تخت لگا ہے جس پر چھوٹا سا قالین بچھا ہے۔ باقر علی ایک صوفہ پر بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے ہیں چہرے سے جلال ٹپکتا ہے۔ آنکھوں میں ایک سنجیدہ چمک ہے۔ زندگی کی ۵۰ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ لڑکے پڑھائی سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ایک آئی سی ایس ہے جو کلکتہ میں رجسٹرار ہے باقی بھی اپنی اپنی جگہوں پر مطمئن ہیں۔ صرف ایک لڑکے امجد کی فکر دامنگیر ہے۔ وہ کچھ زیادہ لکھ پڑھ نہیں سکا۔ اس کے کاروبار اور شادی کی فکر لگی رہتی ہے لیکن کچھ بن نہیں پڑتا۔ پاس ہی ان کی بیوی بیٹھے کچھ سوچ رہی ہے۔

باقر علی:- اصغر اور اسد اللہ ابھی سیر سے واپس نہیں آئے؟

زبیدہ:- آجائیں گے ابھی کچھ زیادہ دیر تو ہوئی نہیں۔

باقر علی:- تم تو دیور اور بیٹے کی طرفداری اپنا فرض سمجھتی ہو۔

زبیدہ:- شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن گھنٹہ بھر تو سیر کے لئے چاہئے نا۔

باقر علی:- اب تو ڈیڑھ گھنٹہ ہو آچاہتا ہے۔ میں نے اصغر کو کلکتہ سے اس لئے نہیں بلایا کہ سیر میں وقت ضائع کرے۔ مجھے تو تمہارے نالائق بیٹے امجد کی شادی کی فکر ہے اسی مشورہ

کے لئے . . .

زبیدہ:- (بات کاٹ کر) اسے بھی دوسروں کی طرح ایم۔ اے پاس کرایا ہوتا۔ اس کا دماغ کیا کسی سے کم ہے؟

باقر علی:- ہاں پچھلے سال پاگل جو ہو گیا تھا۔ پاگل کا دماغ کس سے کم ہوتا ہے۔

زبیدہ:- آپ کو تو ہمیشہ میرے بچوں میں عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ ان کی کوئی خوبی تو دکھائی ہی نہیں دیتی۔ دیکھئے اصغر نے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں ہندوستان بھر میں اول رہا۔ اب رجسٹرار کی حیثیت میں ایسا اچھا کام کر رہا ہے کہ حکومت بنگال اسے پنجاب میں بھیجنا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ ہیں کہ اسے بھی بات بات پر ٹوکتے ہیں۔

باقر علی:- تم اسے کیا سمجھو۔ اگر انہیں شتر بے مہار کی طرح کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تو ان کا دماغ بگڑ جائے گا۔ اور کسی کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔

(اصغر اور اسد اللہ کمرہ میں داخل ہوتے اور آداب عرض کرتے ہیں)

باقر علی:- آداب عرض کا جواب ذرا تمکنت سے دے کر (بڑی

دیر لگائی۔

اصغر:۔ راستے میں چچا جان نے کئی لوگوں سے تعارف کرانا شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ سیر کا وقت تعارف کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ لوگ تھوڑا سا وقت نکال کر رسم و رواج کی دنیا سے نجات کی راہ ڈھونڈتے ہیں۔ اگر اس وقت بھی انہیں تعارف کے تمام مراحل طے کرنے پڑیں تو سیر سے گھر بیٹھنا بھلا۔

باقر علی:۔ اسداللہ تو وقت کی قدر جانتے ہی نہیں۔ انہیں تو بس میل ملاقات سے کام ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان خواہ مخواہ کی واقفیت پیدا کرنا راہ چلتے دوسروں کے گلے کا ہار بن جانا، وقت بے وقت لوگوں کو ملنے جانا ان کا شغل بن چکا ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنے دفتر کے وقت میں بھی اس قسم کی بیکار ملاقاتوں کا ناغہ نہیں کرتے۔

اسداللہ:۔ ٹھیک ہے بھائی جان دنیا میں میل ملاقات کے بغیر رہا ہی کیا ہے۔

باقر علی:۔ دیکھو! اسداللہ میاں میں نے تم دونوں کو ایک ضروری مشورہ کے لئے بلایا ہے۔ امجد اب جوان ہے اس کی شادی کی فکر کرنا ضروری ہے۔ اصغر سے وہ صرف دو سال چھوٹا ہے اس کی شادی کے بعد اصولاً اس کا بندوبست لازم آتا ہے۔ ورنہ برادری میں ناک کٹے گی کہ ایک نالائق لڑکا تھا جسے کسی نے لڑکی دینا گوارا نہ کیا۔

اسداللہ:۔ بھائی جان! امجد کے لئے میں نے تو کئی جگہ پیغام بھی بھیج کے دیکھ لیا ہر جگہ سے ٹکا سا جواب ملا ہے۔ سب یہی کہتے ہیں باقی تعلیم یافتہ بچوں کے لئے کیوں نہیں پوچھتے۔ اس پاگل کو کون اپنی لڑکی دے۔

اصغر:۔ ابا جان فکر تو مجھے بھی بہت ہے مگر کیا کریں۔ نہ اس میں سمجھ بوجھ نہ تعلیم، نہ کاروبار کا سلیقہ اور نہ اتنی عقل کہ دوسروں کو اپنا بنا سکے۔ اب کوئی لڑکی دے تو کس لالچ سے؟

زبیدہ:۔ نہ بھئی، کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ اماں جان تو اسی فکر میں رو رو کر بینائی بھی کھو چکی ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ میں نے امجد کو بیٹا کیا بنایا ایک مصیبت مول لے لی۔

اصغر:۔ ہاں ان کے بڑھاپے کا یہی ایک سہارا ہے۔

باقر علی:۔ تو میاں پھر اس کا کوئی حل سوچو۔ باتوں سے تو کچھ بننے کا نہیں۔

(سب گردنیں جھکائے ایک گہری سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ کمرے میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی مکھی کی گوں گوں بیرونی دنیا کی گہما گہمی کا پتہ دیتی ہے)

اسداللہ:۔ (خاموشی کو توڑتے ہوئے) کوئی گھر نظر نہیں آتا جہاں سے کورا جواب نہ مل چکا ہو۔

زبیدہ:۔ اصغر تمہارے ماموں انور سے پوچھا تھا۔ وہ بھی صاف ٹال چکے ہیں۔

اصغر:۔ محمودہ کے بارے میں؟

زبیدہ:۔ ہاں محمودہ کے لئے۔ زہرہ کو ان کی قسم نہیں کھاتی۔ اگر وہ چاہیں تو بہن کو آسانی کے ساتھ اس رشتہ پر رضامند کر سکتے ہیں۔

اسداللہ:۔ رشتہ تو واقعی بہترین ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے شکل صورت ایسی پائی ہے کہ پاگلوں کا دماغ بھی درست کر دے۔ سلیقہ ایسا ہے کہ جو اس سے ملتا ہے بس اسی کا ہو رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر رشتہ ملنا مشکل ہے۔

اصغر:۔ ابا جان۔ بس پھر میری بھی یہی صلاح ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے محمودہ کے رشتہ کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مناسب یہ ہے کہ پہلے آپ ماموں جی کو ایک خط لکھ دیں۔

باقر علی:۔ خط تو میں نے لکھا تھا۔ انہوں نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ لکھا ہے۔ زہرہ بہن بے کس سہی بیوہ سہی۔ لیکن وہ اپنی اکلوتی بیٹی محمودہ کو ایک پاگل کے سپرد کسی طرح نہیں کر سکتی۔

اسداللہ:۔ ہاں! آخر وہ بھی تو سمجھدار ہیں۔ ان کی دجہ سے محمودہ کے لئے اچھے اچھے رشتے ملتے ہوں گے۔

زبیدہ:۔ یہ سچ ہے لیکن ہمارے بھی تو قریبی ہیں آپ ان سے اماں جان کی حالت زار بیان کریں اور ایک بار پھر لکھیں کہ آپ کی بھیج جائی

کی زندگی بچنے کی فقط ایک سبیل ہے کہ وہ محمود اور امجد کی نسبت پر راضی ہو جائیں۔

باقر علی:۔ اچھا کل دوبارہ خط لکھوں گا۔

زبیدہ:۔ نہیں آپ نہ لکھئے اب کی بار اماں جان سے خط لکھوائیے انور کی سب عزت کرتے ہیں۔

باقر علی:۔ بہت اچھا۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

(زہرہ اپنے کمرے میں اپنی بیٹی محمودہ کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہے کبھی خانہ داری کا ذکر ہے کبھی جنگ کے جلد ختم ہونے کی امید افزا گفتگو اور ہمسایوں سے میل ملاپ پر بحث ہے۔ خادمہ جو اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہے کبھی کبھی برتنوں کی جھنکار سے ایک سُر پیدا کر دیتی ہے۔ کمرے کا سامان مختصر ہے لیکن ہر چیز نہایت قرینے سے دھری ہے)

زہرہ:۔ اب تو تم خانہ داری سے خوب واقف ہو چکی۔

محمودہ:۔ (قہقہہ لگا کر) کیوں نہ ہو ایک سلیقہ شعار اماں کی بیٹی جو ہوں گا۔

زہرہ:۔ تمہیں تو مذاق ہی سوجھتا ہے۔

محمودہ:۔ آپ سے مذاق نہ کروں تو اور کس سے۔ آخر میں کسی اور سے ملتی بھی تو نہیں بس ایک سہیلی صادقہ ہے اس کا بھی بیاہ ہوا چاہتا ہے۔

زہرہ:۔ وہ کس سے؟

محمودہ:۔ ایک بیرسٹر ہیں۔ انتسر کے رہنے والے۔ جنگ سے ایک سال پیشتر ولایت سے واپس آئے تھے۔ اب اچھی خاصی پریکٹس ہے۔

زہرہ:۔ تمہاری سہیلی تو بڑی خوش قسمت ہے۔

محمودہ:۔ یہ تو شادی کے بعد پتہ چلے گا۔

زہرہ:۔ کیوں۔

محمودہ:۔ خوش بختی دولت پر منحصر نہیں۔ یہ تو مرد کے سلوک پر موقوف ہے۔

زہرہ:۔ تم ابھی جوان ہو مگر بوڑھوں جیسی پختہ باتیں کرتی ہو۔

محمودہ:۔ مصیبتیں پختہ کار بنا دیتی ہیں۔

(انور ہاتھ میں خط لئے کمرے میں داخل ہوتا ہے)

انور:۔ آداب عرض۔

زہرہ:۔ آداب عرض۔

(محمودہ ماموں کو تسلیم کہہ کر کمرے سے باہر چلی جاتی ہے)

انور:۔ مزاج کیسے ہیں؟

زہرہ:۔ شکریہ۔ تمہیں دیکھ کر خوش ہوں۔

انور:۔ میں نے تو تمام رات آنکھوں میں گزار دی۔ کل پھپھی جان کا خط آیا۔ خط کیا تھا غم کا سمندر تھا۔ بے چین ہو گیا۔ تو آپ کے پاس پہنچا۔

زہرہ:۔ بات کیا ہے؟

انور:۔ کچھ ایسی بات ہے کہ کہتے نہ بنے۔

زہرہ:۔ کچھ کہو بھی، میں ہمہ تن گوش ہوں۔

انور:۔ آپ جانتی ہیں۔ کہ پھپھی جان اتنے بڑے گھرانے میں صرف ایک بزرگ رہ گئی ہیں ہمارے والد ان کے ہاتھوں میں پلے ہمارے چچا کا رونا بھی انہیں کے نصیب ہوا۔ اپنے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ ان کی اکلوتی بیٹی زبیدہ کے ہاں لڑکے بالے ہوئے سب لائق فائق ہو گئے۔ لیکن پھپھی جان نے جس نواسے کو اپنا لڑکا بنایا اُسے اتنا لاڈ رکھا کہ وہ کچھ زیادہ نہ پڑھ سکا۔ اب وہ جوان ہو گیا۔ پھپھی جان گھر میں بہو دیکھنا چاہتی ہیں۔ کہیں اچھا رشتہ نہیں ملتا۔ انہوں نے ایک نہایت دردناک اپیل کی ہے جو مجھے سارا رات رلاتی رہی ہے۔

زہرہ:۔ آپ تو سچ مچ گھبرا گئے ہیں ایسی کئی اپیلیں خارج کی ہوں گی۔

انور:۔ نہیں یہ مذاق کی بات نہیں۔

زہرہ:۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ یہ میری محمودہ پر ہی حملہ ہو گا۔

انور:۔ یہ خط لیجئے۔

بہام نگر
۲۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء

عزیز انور سلامت رہو

تم نے باقر علی کے خط کا جواب نہایت تحمل سے دیا ہے۔

مجھے توقع نہ تھی۔ میرے لڑکے دو اسد کے بارے میں اس قدر سختی ذرا غور کرو اگر اس وقت میرے بھائی یعنی تمہارے والد زندہ ہوتے تو کیا میرے لئے اس کی نواسی محمودہ کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر لے آنا مشکل تھا۔ میرے بڑھاپے، میری جدائی، میرے دکھوں پر رحم کرو۔ تم سے یہ میری آخری درخواست ہے۔

دکھیا

تمہاری پھپھی

(زہرہ آبدیدہ کھڑی تھی۔ بھائی کو آبدیدہ دیکھ کر مخالفت کے بادل چھٹ گئے اور آن کی آن میں مطلع صاف ہو گیا)

زہرہ:۔ (خاموشی کو توڑتے ہوئے) مجھ سے تو پھپھی جان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

انور:۔ مجھے بھی تو تمام رات یہی رونا رہا۔

زہرہ:۔ پھر کیا تجویز ہے؟

انور:۔ میری سمجھ تو کچھ کام نہیں دیتی۔ میں تو ایک دفعہ آپ سے ٹکے سا جواب لے چکا ہوں۔ دوبارہ کس منہ سے درخواست کروں۔ پھپھی جان کی یہ حالت تو مجھ سے بھی دیکھی نہیں جاتی۔ اگر میری لڑکی ہوتی تو ضرور امجد سے بیاہ دیتا۔

زہرہ:۔ مجھے ہول ہے۔ وہ پچھلے سال پاگل ہو گیا تھا۔ اور یہ مرض پھر عود کر آتا ہے۔ اگر وہ پھر پاگل ہو گیا تو میری اکلوتی بیٹی برباد ہو جائے گی۔ میرا تو یہی سہارا ہے۔

انور:۔ نہیں اب تو وہ بالکل تندرست ہے۔

زہرہ:۔ مگر کچھ کاروبار بھی شروع کیا ہے کہ نہیں؟

انور:۔ کچھ سرمائے سے اس نے دکان تو کر لی ہے۔ لیکن کاروبار کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں۔

زہرہ:۔ اس کے بھائی اصغر بھی تو مدد دیتے ہوں گے نا۔

انور:۔ نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ ان کے اپنے اخراجات انہیں دم نہیں لینے دیتے۔ البتہ باقر علی خود مالدار ہیں۔ خوب جائداد پیدا کر لی ہے۔ سال ڈیڑھ سال میں ریٹائرڈ ہونے والے ہیں امجد کو کمی کس بات کی ہے البتہ طبیعت کے سخت واقع ہوئے ہیں۔

زہرہ:۔ تم تو رشتہ کے لئے مجھے منانے آئے ہو۔ مگر ساتھ مخالفت بھی کر رہے ہو۔

انور:۔ مخالفت کیسی۔ اصل واقعات بھی آپ سے چھپاؤں؟

زہرہ:۔ لیکن میری ڈھارس بندھانے کے لئے کچھ تو کہو۔

انور:۔ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے بھائی بند ہیں۔ باقر علی جیسے معزز، خدا ترس، انصاف پسند اور با اصول آدمی ہیں۔ ان کی بیوی زبیدہ فرشتہ سیرت ہے۔ البتہ اسد اللہ اور امجد طبیعت کے سخت اور خود پسند ہیں لیکن باقر علی کے سامنے ان کی دال نہیں گلتی۔ پھپھی جان مظلوم اور ستم رسیدہ ہیں۔ مگر یہ سب باتیں تو آپ خود جانتی ہیں۔ یہاں تو صرف ہاں یا نہ کا سوال ہے۔

زہرہ:۔ مگر محمودہ سے تو ابھی مجھے دریافت کرنا ہے۔

انور:۔ وہ تو کبھی ماننے کی نہیں۔

زہرہ:۔ تو پھر میں اکلوتی بیٹی کو کس طرح ایک پاگل کے سپرد کر سکتی ہوں۔ یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اس کے سکھ سے میں سکھی۔ اس کا دکھ میرے لئے پیام موت ہے۔

انور:۔ تو میں انکار کر دوں۔

زہرہ۔ میں انکار نہیں کر سکتی۔ نہیں نہیں مجھ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ساری رات جب تم چارپائی پہ لیٹے تڑپ رہے تھے تو میں بھی سخت بے چین تھی۔ میں نے رات خواب میں والد محترم کو دیکھا۔ سبز عمامہ، نورانی چہرہ، روشن آنکھیں، لیکن نہایت ہی غمناک لہجہ میں میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر فرمایا "بیٹی، امجد اور محمودہ کی نسبت کی مخالفت نہ کرو۔ قدرت کو یہی منظور ہے" میں چونک اٹھی۔ پھر آنکھوں میں رات گذار دی (آبدیدہ ہو کر) یہی وجہ ہے کہ میں جو اس رشتہ کے اس قدر خلاف تھی آج کچھ نہیں کہہ سکتی۔

انور:۔ تو گویا یہ نوشتہ تقدیر ہے۔

زہرہ:۔ شاید لوگ کہتے ہیں خواب خیال ہے۔ مگر مجھے ایسا خیال

کیوں ستاتا۔ جب شروع سے ہی میں اس کی سخت مخالف ہوں۔

انور:۔ تو پھر

زہرہ:۔ راضی بہ رضا ہوں۔ لیکن جواب ایک ہفتہ تک دیں میں ذرا محمودہ سے بھی دریافت کرلوں۔

(انور سلام کرکے باہر چلے جاتے ہیں۔ زہرہ بغلی دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے۔ تو محمودہ کو کھڑے دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے)

زہرہ:۔ تم یہاں کیا کررہی ہو؟

محمودہ:۔ بس آپ کی باتیں سن رہی تھی۔

زہرہ:۔ وہ کس لئے؟

محمودہ:۔ آخر میری ہی بربادیوں کے مشورے تھے نا۔

(زہرہ ندامت سے سر جھکا لیتی ہے)

پردہ گرتا ہے

تیسرا سین

(محمودہ کی سہیلی صادقہ اُسے ملنے آئی۔ اور دونوں محمودہ کے کمرے میں بیٹھی باتیں کررہی ہیں)

محمودہ:۔ بہن تم بہت خوش قسمت ہو۔ اچھا ساتھی مل جائے گا

صادقہ:۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ خدا اچھا ہی کرے۔

محمودہ:۔ تو اس کے اچھا ہونے میں شک کیا ہے؟

صادقہ:۔ بہن یہ جو ولایت سے ہو آتے ہیں یہ کسی کام کے نہیں رہتے۔ ان کا دماغ بگڑ جاتا ہے۔

محمودہ:۔ آخر پاگل تو نہیں ہوتے۔

صادقہ:۔ نہیں پاگل تو میں بھی نہیں کہتی۔ مگر ان کا دماغ عرش معلّٰی پر ہوتا ہے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

محمودہ:۔ بہن اگر تمہارا رشتہ کسی پاگل سے ہوجاتا تو۔

صادقہ:۔ تو میں خودکشی کرلیتی۔

محمودہ:۔ اگر تمہاری خودکشی سے تمہاری والدہ کی موت یقینی ہو تو

صادقہ:۔ تو میں اسے بھی مرنے دیتی۔

محمودہ:۔ بہن مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا۔

صادقہ:۔ بہن یہ کیا بات ہے۔ بچھا زنوں میں کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔ آج تمہارے چہرے پر اداسی کیوں چھائی ہے۔ اتنی لاغر کیوں ہو گئی ہو۔

محمودہ:۔ نہیں ایسا کچھ نہیں۔

صادقہ:۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

محمودہ:۔ ذرا رات نیند نہیں آئی۔ اس لئے کچھ طبیعت خراب ہے۔

صادقہ:۔ ان حیلے بہانوں سے کام بننے کا نہیں۔ مجھے تم خوب جانتی ہو۔

محمودہ:۔ والدہ میرا رشتہ ایک پاگل سے کرنا چاہتی ہیں۔

صادقہ:۔ کیوں! وہ خود تو پاگل نہیں ہوگئیں۔

محمودہ:۔ نہیں صادقہ! ایسا مت کہو۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں سن سکتی۔

صادقہ:۔ معافی چاہتی ہوں۔ مگر تم ایسی حسین، قابل اور سلیقہ شعار لڑکی کے لئے بڑے اچھے رشتے موجود ہیں۔

محمودہ:۔ رشتے تو بڑے اچھے اچھے ملتے تھے۔ مگر والدہ مجبور ہیں

صادقہ:۔ ایسی مجبوری کیا ہے کہ پاگل کو سونپ دی جاؤ۔

محمودہ:۔ نہیں وہ پاگل تو نہیں۔ البتہ پچھلے سال پاگل رہ چکے ہیں۔

صادقہ:۔ پھر بھی طبیعت میں سختی بہت رہتی ہے۔ اماں کو سمجھاؤ نا۔

محمودہ:۔ وہ میری قربانی سے اپنی بھتیجی جان کو خوش کرنا چاہتی ہیں۔

صادقہ:۔ تو صاف انکار کردو۔

محمودہ:۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ میں والدہ کو کسی قیمت پر ناراض نہیں کرسکتی۔

صادقہ:۔ وہ دن ہوا ہوئے جب لڑکیاں ماں باپ کی بے دام غلام تھیں۔ اب آزادی کا زمانہ ہے تم اس قدر تعلیم یافتہ ہو کر ایسے پرانے فیشن کے خیالات کو دل میں جگہ دیتی ہو۔

محمودہ:۔ پرانے نئے کا تو سوال ہی نہیں۔ میں تو والدہ کی فرمانبرداری اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ان کو خوش کرنا میری زندگی کا مقصد اولین ہے۔

صادقہ:۔ آجکل کے زمانہ میں تو کوئی شخص ایسا نظر آتا ہے جو ماں کی خوشی

کے لئے اپنی زندگی برباد کر دے۔

محمودہ: سلم محسوس نہیں کر سکتی کہ انہوں نے میرے لئے کس قدر زحمت اٹھائی ہے۔ شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئیں۔ اٹھارہ سال سے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھتی ہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کے مجروح دل پر نمک پاشی کروں۔ انہوں نے یہ سب قربانی میری خاطر کی۔ میں احسان فراموش نہیں۔ جس نے اپنی جوانی مجھ پر قربان کی ہو، اس پر اپنی زندگی نچھاور کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

صادقہ۔ یہاں میرے مشورے کی گنجائش نہیں۔

(صادقہ اجازت چاہتی ہے۔ اور سلام کر کے چلی جاتی ہے۔

زہرہ داخل ہوتی ہے۔ محمودہ اٹھ کر تعظیم بجا لاتی ہے)

زہرہ: تعظیم بجا لانے سے کیا فائدہ۔ دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔ آخر فاقہ کشی سے کیا حاصل۔ میں ہرگز ناراض نہیں۔ رشتہ کے انتخاب میں تمہیں کلی اختیار ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مجبور نہیں کر سکتی کہ تمہارا رشتہ تمہاری مرضی کے خلاف کروں۔ ہاں قدرت کا مقابلہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں فاقہ کرتے نہیں دیکھ سکتی۔

محمودہ: میں نے فاقہ کسی ناراضی سے نہیں کیا۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ دماغ سوچنے کے قابل ہو جائے۔

زہرہ: میں مجبور کب کرتی ہوں۔ تم نے خود ہی سن پایا اور خود ہی اس پر سوچ رہی ہو۔

محمودہ: یہی تو مصیبت ہے۔ میں نے وہ تمام باتیں سن لیں جو شاید آپ ترغیب دینے کے لئے بھی مجھے نہ سناتے۔

زہرہ: یہ تو درست ہے۔

محمودہ: میں دوگونا عذاب میں مبتلا ہوں۔ انکار کروں تو مجرم، منظور کروں تو برباد۔

زہرہ: بربادی اور آبادی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

محمودہ: درست۔ مگر خدا نے انسان کو عقل بھی تو سوچنے کیلئے دے رکھی ہے۔ یہی انسان کی طرہ امتیاز ہے۔ اگر انسان عقل کو کام میں نہ لائے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے۔ تقدیر کی اندھا دھند تقلید کے کیا معنی؟

زہرہ: کچھ نہیں۔

محمودہ: نہیں آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ گویا مجھے ایک پاگل کے سپرد کرنے پر تلی ہوئی ہیں جو بالکل نکھٹو ہے۔ جسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ جو کام کرنا نہیں جانتا۔ اگر وہاں رشتہ کرنا ہے تو ان کے اور بھی لائق فائق لڑکے ہیں۔ جنہیں نے تم کس سے کم ہوں کہ میرے لئے نظر انتخاب ایک پاگل پر پڑی ہے۔ میری امید و بربادی میں پہلے ہی میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ میں ماموں کی پالی پوسی۔ بنی سے پہلے ہی مر جا چکی ہیں۔ لیکن اماں میں تمہیں نہ ستاؤں گی۔ نہیں دیکھ سکتی کہ آپ حکم عدولی کی نہیں آئندہ کر سکتی ہوں۔ جہاں تم پسند کرو، میں خوشی سے جانے کیلئے تیار ہوں۔ اگر تم کو گوارا ہو تو جان تک دینے کیلئے تیار ہوں۔ اماں جان میں راضی ہوں —— زہرہ فرط محبت سے محمودہ کو گلے لگا لیتی ہے۔

(پردہ گرتا ہے) (باقی آئندہ)

بیزاری

اس دہر میں کسی کا وفادار کون ہے
ہم بیکسوں کا بیکسی میں یار کون ہے

اے جانِ حسن تیرا طلبگار کون ہے
راحت و انبساط سے بیزار کون ہے

اللہ رے جنونِ محبت کی رونقیں
اک درد کے سوا میرا غمخوار کون ہے

خندہ لبی سے کس کی ہے پیدا نمو میں جوش
صحنِ چمن میں باعثِ گلبار کون ہے

راحت طلب ہے درد کی لذت سے دور دور
نزدیک تر ہے جو وہ سزاوار کون ہے

کس کو پسند ہیں تیری ایذا رسانیاں!
تیرے بغیر زیست سے ناچار کون ہے

ہے سہل کس کو ورنہ پھر دن گزارنے
اس زندگی کا شوق سے خوددار کون ہے

اس دل میں ہے بشارت اک طوفانِ اضطراب
جانے ستم شعار کو آزار کون ہے!

بشارت فارانی

عبدالعزیز علائی

طوطیا بیگم

موضع فتح پور کو طوطیا بیگم جسے عرفِ عام میں رانی طوطی کہا جاتا ہے کے محل کے باعث تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ گاؤں راجوری سے تین میل شمال کی جانب ہے اور یہ تاریخی عمارت ایک خوشنما پہاڑی پر خصوصیت کے ساتھ زمانہ کے ہاتھوں محفوظ ہے۔

جس طرح اس محل کی مالکہ اس زمانہ میں اپنے حسن و جمال کا جواب نہ رکھتی تھی اسی طرح اس کا محل بھی اپنے زمانہ کی بہترین عمارات میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن زمانہ کی ناقدری نے آج اسے ایک اجڑے ہوئے کھنڈر کی صورت میں صرف نشان کے طور باقی رہنے دیا ہے۔ اس کی تعمیری شوکتیں حرفِ غلط کی طرح مٹادی ہیں۔ اس محل میں اس کی مالکہ نے چار سال تک خواب نوشین کے مزے لئے۔ اور بقیہ زیست کے تیس سال موت کی راہ تکتے تکتے گذار دیئے۔ محل کی جنوبی دیوار کے پاس طوطیا بیگم کا مزار اور اس کی تین مظلوم بچیوں کی تربتیں تھیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک ان کا نشان موجود رہا ہے۔ اس کے بعد یہ تربتیں خاک کے ایک تودہ کی شکل میں تبدیل ہوئیں۔ اور پھر زمین کی سطح سے مل گئیں۔ رانی طوطی کی داستانِ حیات سے رنج و حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اس پر غور کیا جائے تو اس کے اپنے زمانہ کی معاشرت کا تاریک ترین پہلو عبرت کا سامان بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی جیتے جی زمین میں گاڑ دینا، راجپوت کہلانے والوں کی امتیازی شان میں داخل تھا۔ اور حق تو یہ ہے۔ کہ نومسلم راجپوتوں کا ایمان بھی اس معصیت کو معصیت تسلیم کرنے کیلئے ابھی بیباک واقع نہیں ہوا تھا۔ رانی طوطی بھی منحوس زمانہ پایا تھا۔ لیکن یہ خدا ترس اور رقیق القلب ملکہ اس زمانہ میں پیدا ہونے کے لائق نہ تھی۔

خزاں کا موسم تھا اور زمین سبزہ و گل کی رنگینیوں سے یکسر خالی تھی۔ یہ سال اس حسین ترین ملکہ کی زندگی کا آخری سال تھا جب اسے دردِ زہ پیدا ہوا۔ اور پورے دو گھنٹہ کی جانکاہی کے بعد اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نہایت حسین، یہی دکھائی دیتا تھا۔ کہ آسمان سے پورا چاند ملکہ کی گود میں اتر آیا ہے۔ نازک اندام ملکہ اس وقت درد و کرب کے جس مرحلہ سے گذر رہی تھی۔ اگر اس کے لڑکا پیدا ہوا ہوتا۔ تو اس کی مخدوش حالت اسے گھنٹوں تک لختِ جگر سے پیار کرنے کو نہ اکساتی۔ لیکن لڑکی کا نام سنتے ہی ملکہ اس سے لپٹ گئی۔ اور اس قدر روئی کہ اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ آنکھوں سے موت کی سی وحشت برسنے لگی لمحہ بھر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک خادمہ اندر آئی۔ دایہ نے معصوم بچی کو سرخ ریشم کی چادر کے ٹکڑے میں لپیٹ کر اس کے حوالہ کیا۔ خادمہ کے دروازہ پر پہنچنے تک رانی نے اپنی ننھی بچی کو حسرت و ارمان کی نگاہوں سے دیکھا اور جب وہ کمرہ سے باہر ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو ملکہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور کہا "آہ یہ تیسری تھی" اور پھر اس کو غش آگیا۔

اڑتالیس گھنٹہ تک ملکہ اپنے کمرے میں بے حس و حرکت پڑی رہی تیسرے روز شام کے اندھیرے میں اسے قدرے افاقہ ہوا۔ اس نے غسل کیا۔ نئے کپڑے بدلے اور دایہ ساتھ لے کر باہر نکل گئی لمبی پگڈنڈی سے گذر کر اس سطح میدان میں پہنچی جس کا سبزہ شاداب خزاں کے اثر سے　ملکہ کے حسنِ ذوق کی داد دے رہا تھا۔ یہ میدان پہلے ملکہ کی تفریح گاہ کا کام دیتا تھا۔ پھر اس کی اولاد کی آخری آرام گاہ رہا۔ تین ننھی ننھی تربتیں ایک سبزہ میں بنی ہوئی تھیں دو قبروں کی ساخت پر کچھ زمانہ گذر چکا تھا۔ نرگس کے خوشرنگ پھولوں نے انہیں ڈھانپ رکھا تھا۔ تیسری تربت نئی کھدی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور سبزہ سے خالی تھی۔ چنبیلی کی جھکی ہوئی شاخوں سے نقرئی پھول رونے والے کے آنسوؤں کی طرح اس پر ٹپک رہے

تھے۔ اسے دیکھتے ہی ملکہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "آہ یہ تیری تھی" وہ زمین پہ بیٹھ گئی، پھوٹ پھوٹ کر روئی پھر ایک قبر سے لپٹی۔ پھر اپنا آنچل تینوں تربتوں پہ ڈال کر بولی سوتی رہو میری معصوم بچیو۔ حشر تک سوتی رہو۔ اس دن تک سوتی رہو۔ جب کہ تمہارے بے گناہ خون کے لیے تمہاری مظلوم ماں گواہی دیگی"۔

یہ کہتے کہتے ملکہ کو غش آ گیا۔ تھوڑا سا تڑپی۔ ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس کا مزار بھی وہیں بنا۔ یہ ہے سترھویں صدی کی مقامی معاشرت کا ہولناک پہلو۔ یا اندوہناک افسانہ جسے تاریخ میں جگہ نہیں ملی۔

طوطیا بیگم سترھویں صدی کے اواخر میں ایک ممتاز شخصیت ہو گذری ہے۔ بیسیوں قسمت آزماؤں میں سے جس آدمی کو اس کا شوہر ہونے کی مسرت حاصل ہوئی۔ وہ راجوری کی ننھی سی ریاست کا رئیس تھا۔ یہ شخص اس کے ہاتھوں بکا ہوا تھا۔ اور ملکہ کو اس کے دل و دماغ پر پورا قابو حاصل تھا۔ بڑی دانش مند اور سگھڑ بیگم تھی۔ اچھی اچھی سلیقہ شعار خواتین اس کے کمال خانہ داری کا لوہا مانتی تھیں۔ جب کشمیر میں قحط پڑا تو سینکڑوں بے خانماں اس کے پھیلائے ہوئے خوانِ کرم پر پرورش پاتے رہے۔

دیہاتی عشق

سن ری گھاس کا گٹھا اٹھائے جانے والی خوب صورت محبوبہ۔ میں کتنی دیر سے تمہاری راہ تک رہا ہوں ــــــ کہ تو آتی ہو گی ــــــ پھر تمہیں کیا کہوں ــــــ سنتی ہی نہیں کچھ ــــــ اُف ظالم ہے کہ چلی ہی جا رہی ہے بات کرنا بھی تمہیں دوبھر معلوم ہوتا ہے ہ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کس دشمن نے تمہیں یہ پٹی پڑھا رکھی ہے۔ کہ چاہنے والوں کو اس کی خواہشوں ارمانوں اور حسرتوں سمیت اپنی خشمگیں نگاہوں اور بس بھری خاموشی سے روندتے چلی جاؤ۔ یاد ہے۔ آخر میں بھی کچھ ہوں۔ میرا باپ گاؤں کا نمبردار ہے نمبردار۔ تمہیں اپنے اس بڈھے کھوسٹ پتی پر ناز ہو گا۔ سچ پوچھو وہ تو تمہاری خوبصورتی کی توہین ہے توہین اور تمہارے چاند جیسے چہرے پر گرہن۔ یہ تمہارے جوانی کے دن۔ جوبن کی بہار اور خراب ہو رہی ہے ایک بھونڈی صورت والے نیم مرد کے ہاں۔

در اصل تو پاگل ہے۔ اور اسی پاگل پن میں اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ دیکھتی نہیں کہ کیسے ایسے خوبصورت جوان تمہارے عشق میں تڑپ رہے ہیں۔ اور بے دام غلاموں کی مانند تمہاری راہ میں اشک آلود آنکھوں کو فرش بنائے ہیں۔ اور تو ہے کہ اپنے ہی حال میں مست ــــ

سچ جاننا تمہاری اس نت کی بے رخی سے تنگ آ گیا ہوں۔ اور اگر کہیں میری اس بربادی کا باپو کو پتہ لگ گیا۔ تو وہ تمہارے پتی کے ساتھ ساتھ تمہارے ماں باپ کو بھی مصیبت میں جھونک دے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ تمہارا نیدار میرے باپ کا بڑا دوست ہے آجکل۔ پھر بیٹھیگی۔ روئے گی اور پچھتائے گی۔ کہ میں نے کیوں ایسا برتاؤ کیا گاؤں کے ایک نہایت ہی خوبصورت طاقتور اور بارسوخ نوجوان سے۔ ابھی وقت ہے۔ بھول نہ دو روزہ جوانی پہ۔ یہ روز روز کی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ ٹھہر بھی۔ چھوڑ دے گھاس کا گٹھا۔ اور آج جی بھر کر باتیں کر لیں۔

ج

اسما محجوبہ

اُلفتِ رفتہ

نازلی آج خلاف معمول پریشان اور کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ اور شگفتگی کی جگہ سنجیدگی اور اداسی نے اختیار کر لی تھی۔ اس کے سدا ہنسنے والے چہرہ پر پژمردگی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس کی پرنم آنکھوں سے کسی دردناک ڈرامے کا ایک پہلو نمایاں تھا۔ اس کے پریشان گیسو، دلدوز نالے، تیز تنفس جو دلخراش آہ کی سختی سے اکھڑ رہا تھا۔ مل ملا کر کسی پرعقیدت جذبے کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دل ڈگمگایا جا رہا تھا۔ سانو کسی کے جذبات کو کچل کر کسی نے بے لوث تمناؤں کا خون کر دیا ہو۔ وہ اپنی ناکامی پر اداس، اور اپنے کئے پر نادم تھی۔ تاہم وہ کسی ہستی کے خیال میں خود کو فراموش کر چکی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پر آشوب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آہستہ سے الماری کھولی اور ایک خوبصورت تصویر نکالی۔

اب وہ قدرے مطمئن تھی۔ اسے پا کر اس کی بے قرار روح کو چند ے تسکین ہوئی اور نہایت شوق و انہماک سے دیکھ دیکھ کر ہولے ہولے یہ الفاظ گنگنانے لگی۔

"کوئی جئے یا مرے تو یوں ہی مسکرائے جا"

شاید اس کے دل کا مرکز! ——— اس کے دل کی دنیا۔ اس کا سرمایۂ حیات اس کے محبوب کی تصویر تھی جسے وہ تنہا لمحوں میں حسرت بھری نگاہ سے گھنٹوں دیکھتی اور اپنے دل کے رجحانات کو اس وقت کے واقعات سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے دیتی غرضیکہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر اس کی انتہاء گہرائیوں میں گم ہو جاتی۔ یہی شغل گوشۂ تنہائی میں اس کے لئے امن و سکون تھا۔ آج بھی وہ حسب معمول اس کی رعنائیوں اور جاذبیتوں میں محو تھی کہ اس کے بچپن کی سہیلی ستارہ دور کھڑی اس کی وارفتگی سے متاثر ہو کر زیر لب مسکرا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ بولی "آخر یہ خود فراموشی کب تک رہے گی؟"

نازلی نے تصویر کو چھپانے کی کوشش نہ کی اور کہا "ستارہ معاف کرنا میں کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔"

"نازلی جانتی ہوں اور اچھی طرح سے" ستارہ نے ایک خاص ادا سے کہا۔ "شاید میرا آنا بھی اس وقت کے شغل میں حارج ہوا ہوگا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سے بہتر میرا اور کون ہمدرد ہے" نازلی نے کھسیانی ہو کر کہا۔

"وہی" تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ستارہ نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا "میں حیران ہوں کہ تم کیوں اس بے وفا مردوے پر مر رہی ہو۔ جبکہ اسے احساس تک نہیں ہے وہ تمہاری ہر بات کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اور تم ہو کہ اس کی یاد میں خود کو بھی بھلائے بیٹھی ہو۔ مزا تو جب ہے کہ وہ بھی تمہیں اپنائے۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ وہ مجھے ضرور اپنائیں مگر ———" نازلی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم یوں ہی بے موت مرتی جاؤ" ستارہ نے تنک کر کہا۔ "اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہے۔ تو اس کا نام تک نہ لو۔ میں تمہاری ان باتوں سے بیزار ہوں تم خواہ مخواہ اپنے تئیں نہ جانے کیوں خراب کر رہی ہو۔ جبکہ اسے خبر تک ہی نہیں۔"

نازلی نے ایک دلخراش آہ بھر کر کہا۔

یہ ہی آہیں، میرے نالے میرے ارماں
تجھے اے بھولنے والے ہمیشہ یاد کرتے ہیں

"ستارہ بہن اگر میرے بس کی بات ہوتی تو شاید بھول جاتی

لیکن اب تو جب تک جہان میں جان ہے میں ان کا نام ہی لیتی رہوں گی۔"

"تو پھر مجھ سے ان کی وفاؤں کا گلہ نہ کرنا" ستارہ نے مچل کر کہا۔ "ہاں تو کب اس دن ملاقات ہوئی تھی۔ یا یوں ہی بس جھڑکیاں ہی؟"

کسی نامعلوم صدمہ سے نازلی بے قرار سی ہو گئی۔ اس کے تمام بدن میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ حسرت بھری آنکھوں سے اشک رواں ہو کر اس کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ وہ کسی روحانی اذیت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ستارہ ضبط نہ کر سکی۔ نازلی کی یہ حالت وہ دیکھ نہ سکتی تھی۔ بے اختیار آنسوؤں کے چند قطرے اس کی آنکھوں سے بھی ڈھلک گئے۔

"ملی تھی مگر ——" نازلی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

"تو کیا ناراض ہوئے"؟

"خوش بھی تو نہ تھے"

"تو گویا تمہارا ملنا گوارا نہ ہوا"

"شاید"

"پھر ملنے کو کہا ہوگا"؟

"نہیں"

"نہ ملنے کی وجہ پوچھی"؟

"نہیں"

"خط کا جواب دینے کے متعلق کیا کہا"؟

"وہی پس پردہ جواب"

"جواب"؟

"ہاں جواب ہی سمجھ لو"

"وجہ"؟

"لکھنا نہیں آتا —— ایک لطیف بہانہ"

"تو صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ہاں جھمالہ عذر لنگ —————— عین ہتک آمیز جو میرے جگر میں شگاف کرنے کے لئے صرف اسی پہ اکتفا کیا گیا"

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں کہ انہیں تمہاری مطلقاً پرواہ نہیں۔ بلکہ نفرت ہے۔ تم ایسی بے وقوف دنیا میں کوئی نہ ہوگی بھلا جو دو لفظ لکھنے گوارا نہ کرے۔ اسے تمہاری چاہت کیونکر ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے تم اسی طرح گھل گھل کر مر جاؤ گی۔ مگر —— بے فائدہ مجھ سے تمہاری یہ خستہ حالی دیکھی نہیں جاتی۔ تمہاری یہ آہیں مجھے بھی پریشان کئے دیتی ہیں۔ مجھے قلق ہوتا ہے کہ جب بھی تمہارے پاس آتی ہوں تمہیں اسی خیال میں غلطاں پاتی ہوں۔"

"ہاں تم سچ کہتی ہو۔ میں خوب جانتی ہوں۔ کہ ان کو مجھ سے نفرت ہے۔ جب نفرت ہو تو محبت کو کیا دخل۔ اور احساس کا کیا خیال؟ آہ —— مجھے ان سے کوئی لالچ تو نہ تھا۔ اور نہ ہی ان کی دولت سے کچھ سروکار۔ میری تو یہی تمنا تھی کہ مجھ سے محبت کریں۔ میری محبت عام قسم کی دوستی کے معیار سے بالاتر تھی۔ میری متجسس نگاہیں صرف سچی اور بے لوث محبت کی متلاشی تھیں۔ مگر آہ —— انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ ان کی لاابالی طبیعت نے میرے دل کو پاش پاش کر دیا۔ اور میری پاکیزہ محبت کی قدر نہ کی۔ بھلا کیوں کرتے۔ انہیں دنیا کی ہر مسرت جو حاصل ہے ان کی نخوت اور جاہ و حشمت نے انہیں اجازت ہی نہ دی تھی۔ میں ان کے قابل نہ تھی۔ مگر ——

خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک"

ستارہ چلی گئی۔ نازلی گھنٹوں سر جھکائے اپنی حالت پر غور کرتی رہی۔ لیکن مستقبل کے لئے کوئی خاص بات اس کے فہم و ادراک میں نہ آ سکی۔ وہ کشمکش کی حالت میں اٹھی۔ اور ایک موہوم سی امید لے کر چل پڑی۔ اس کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ نہ جانے کہاں جانا چاہتی تھی۔ تاہم وہ جا رہی تھی وہ حسرت و یاس کا مجسمہ تھی۔ واپس نہ آنا چاہتی تھی۔ خوش تھی کہ اسے آخری منزل کا اعزاز حاصل ہوگا۔ اس کے جذبات کا ہنگامہ خیز تلاطم اسے کشاں کشاں کہیں جانے پر اکسا رہا تھا۔ وہ افسردہ حیات اب نہیں احساس کرنے جا رہی تھی۔ اور خیالات کی رو میں بہہ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی —— ناگاہ موٹر کے ہارن نے اسے

چونکا دیا۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں بھاگی لیکن اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ سنبھلنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے وہ گر پڑی ۔۔۔ موٹر اوپر سے گزر گئی۔ اور کچھ فاصلہ پر کھڑی ہو گئی۔ ایک جنٹلمین پڑی کلفت سے نکلا اور بدحواسی کی حالت میں دوڑا۔

ایک انسانی ڈھانچہ خون سے لت پت کس مپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے زخم آئے تھے۔

نوجوان نے قریب جا کر دیکھا تو بے ساختہ اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ اس پر جھک گیا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھا ۔۔۔ "نازلی" وہ دیوانہ وار بولا ۔۔۔ نازلی بے ہوش پڑی تھی۔ نوجوان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے نازلی کے چہرہ پر ٹپک گئے۔

"نازلی! نازلی" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ کچھ عرصہ کے بعد جب نازلی کو کچھ ہوش آیا تو اس کا سر اس کے اپنے محبوب کے زانوؤں پر تھا ۔۔۔ فرط مسرت سے نازلی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنی تکلیف کو چند لمحوں کے لئے بالکل بھول گئی۔ شاید وہ ایک سہانا خواب دیکھ رہی تھی۔

"نازلی! تم یہاں کیسے آئیں؟" اس کے محبوب نے اس کا ہاتھ سنبھالتے ہوئے کہا۔

اسے اب یقین آیا کہ حقیقت میں اس کا محبوب اس کے قریب تر ہے جس کی شیریں آواز اس کی روح کو گرما رہی ہے اس کا پژمردہ چہرہ وفور جذبات سے جگمگا اٹھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کی حسرت نصیب آنکھیں جو حقیقت کی متلاشی رہا کرتی تھیں گوہر مقصود پا کر سکون پذیر ہو گئیں۔

"کسی گم گشتہ چیز کی جستجو میں" - نازلی محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مل گئی؟" اس کے محبوب نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا

"ہاں مل چکی ہے" نازلی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ اور مسکرا دی گویا اسے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی تھی۔ وہ اپنی کامیابی پر نہایت خوش تھی۔ کیونکہ آج اس نے مدت کے بعد ایک بار پھر اپنے محبوب کی آنکھوں میں سچی اور گرمجوش محبت کی جھلک دیکھی تھی۔ جس کی دھن میں آج وہ اپنی جان تک دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"تمہیں ہسپتال چلنا چاہیئے۔ تم زخمی ہو۔ تاکہ دوائی وغیرہ۔"

"محبوب چارہ گر پاس ہو تو دوائی کی کیا ضرورت ہے؟" نازلی نے اپنے محبوب کے زانو پر ایک لذت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور دونوں بازو نازلی کے گلے میں حمائل کر دیئے۔

"کیا آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے" نازلی نے معصومانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے دریافت کیا۔

"نازلی! میں تمہارا ہمیشہ پرستار رہوں گا" یہ کہہ کر نوجوان نے نازلی کی جبین کو چوم لیا۔

نازلی کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے محبوب کی طرف دیکھا اور کہا۔ میرے محبوب۔ پھولوں کی گولائی میں سما کر تمہارے گلے کا ہار بنا کروں گی اور پپیہے کی پی کہاں بن کر تمہیں پکارا کروں گی۔

اتنا کہنے کے بعد نازلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے۔ اور ایک ہچکی نے اس کو ابدی نیند سلا دیا۔

لعل یا الماس ہے۔ دُرِ ثمیں ہے یا گہر

نور ہے یا چاندنی سورج ہے یا نجم سحر

کہکشاں ہے یا ثریا۔ کچھ سمجھ آتی نہیں!

اخترِ برجِ فلک، یا چاند ہے یا قمر

جریدہ چاند کی تاریخ سنہ ۱۹۹۶ بکرمی

عزیز کاشی

دھڑکنیں

میری شاہدہ —— لرزتا ہوا آخری سلام۔

تمہارے طویل سکوتِ جگر پاش نے جو تیر میرے دل پر چھوڑے ہیں۔ ان کی کلفت و اذیت میرے بیان سے باہر ہے۔ اکثر رات کو جب تمام دنیا میٹھی نیند کے مزے لیا کرتی ہے۔ تو اس وقت میں تمہاری یاد میں پہروں رویا کرتا ہوں۔ گھنٹوں کھڑکی میں کھڑا تمہاری صورت کو ترستا ہوں۔ یہی سوچتا ہوں کہ خدا معلوم میری شاہدہ کو کیا ہو گیا۔ دن میں کئی بار چھت پر جاتا ہوں۔ شاید، شاہدہ بال خشک کرنے کے لئے بالائے بام آئی ہو۔ لیکن وہاں تمہیں نہ پا کر دل تھام لیتا ہوں۔ مختصر میں سارا دن ایک عجیب بےچینی کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جا بجے کے بعد میرے دل کی دھڑکن دو رنوں پر ہو جاتی ہے۔ کہ شاید آج ہی شاہدہ کا کوئی پیغام آئے۔ میری آنکھیں ننھے قاصد کو بار بار ڈھونڈتی ہیں۔ لیکن مایوسی کے سوا چپ و راست کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا —— کبھی ماہے ہسپتال کے دروازے سے دور گلی کی اس نکڑ تک نظر دوڑاتا ہوں کہ شاید دل پسند بینیوں کا رقعہ دکھائی دے۔ لیکن پھر ایک آہ سرد کھینچ کر تمہارے تصور میں کھو جاتا ہوں —— پچھلے ہفتہ جب تمہیں چھت پر دیکھا۔ تو سارے خوشی کے گذشتہ تمام شکوے یکسر بھول گیا۔ لیکن تمہاری طرف سے خاص التفات نہ پا کر دل کو اس قدر صدمہ پہنچا۔ کہ جس کا اندازہ کوئی دلِ حرماں نصیب ہی لگا سکتا ہے۔ گھر پہنچا تو میرا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ کسی کھلی فضا میں چلا جاؤں —— جہاں اپنا اور بیگانہ کوئی نہ ہو۔ اور خوب جی بھر کر رو لوں۔ آج جب ننھے قاصد کو میں نے دور سے دیکھا۔ تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خدا لے کر فوراً اس مقام پر پہنچا۔ جہاں میں تمام دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر تمہارے پُر کیف اور رسیلے خط پڑھا کرتا تھا۔ دوسرے لمحہ مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ جیسے مجھ سے کچھ چھینا جا رہا ہے۔ یا دہ کرنی کی وہ کرنیں جو کسی وقت میرے دل کی اداس تاریکیوں کو دور کیا کرتی تھیں۔ ایک دم غمگین فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔۔ ارباب مسرت کا آخری تار بھی ٹوٹا ہی جا رہا ہے۔ آنسوؤں کے دو گرم قطرے آنکھوں سے نکلے اور گالوں پر سے بہتے ہوئے میرے "دامن تار تار" پہ گر کر جذب ہو گئے —— میں خود اس گہرے خلا میں جذب ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہی سوچا کہ تمہیں تمام محبت کے انجام سے باخبر کون کرتا —— شاہدہ میں ایک پردیسی تھا اس کا شدید احساس مجھے آج ہی ہوا ہے۔ واقعی یہاں میرا اب کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی پہلی فرصت میں تمہارا وطن چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ میں تمہارا بیاہ ہوتے ہوئے دیکھ سکوں گا! اتنا صابر اور غیر حساس دل کہاں سے لاؤں؟ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ خدا کرے۔ تمہارے بیاہ سے پہلے وطن سے دور بہت دور پہنچ سکوں۔ خود ہی انصاف کرو کہ عروسی ڈھولک کی ہوشربا صدا اور میں بھلا میں تمہاری گلی سے گذر سکوں گا۔ ہرگز نہیں برچھیاں میرے سینے میں پیوست ہو جائیں گی۔

معلوم اگر ہوتا انجام محبت کا
نہ دل ہی دیا ہوتا نہ پیار کیا ہوتا

شاہدہ پیاری۔ آہ پیاری کے اس غیر ارادی استعمال نے مجھے خوشیوں کا وہ زمانہ یاد دلا دیا۔ جب ہماری زندگی مسرتوں کا ایک عمیق سمندر تھی کہ جس میں ہم پہروں ڈوبے رہا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک خط ہے کاغذ کا ایک بےجان ٹکڑا۔ جو دل کی دھڑکنوں کا ملاپ نہیں کرا سکتا۔ البتہ ان کا اظہار کر سکتا ہے —— کاش تم میرے پاس ہوتیں۔ اور میں اپنا دل تمہارے سامنے بے نقاب کر دیتا۔ پھر تم دیکھتیں کہ اس کی گہرائیوں میں تمہاری محبت کس اہتمام سے جاگزیں ہے۔ اگرچہ یہ ٹوٹ چکا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ لیکن اس

شکستگی کے باعث میں نے تمہاری پاک محبت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ اس کی لقا میری بقا ہے۔ تم چاہو تو اس میں سما کر دیکھ سکتی ہو۔ لیکن میں بھولا یہ تو تمہارا نشیمن ہے۔ جس پر یورش کرنے کے لئے بجلیاں آپس میں مشورے کر رہی ہیں — تم نے معافی چاہی ہے۔ یہ ایک ایسا چرکہ ہے۔ کہ اب میرے دل میں برداشت کی تاب نہیں رہی۔ تمہاری اس "معافی" کو شاید ساری عمر نہ بھول سکوں میری جان تمہاری یہ معصومیت مجھے ہمیشہ بے کل بنائے رکھے گی تم نے آخر کون سا گناہ کیا ہے کہ جس کی پاداش میں معافی چاہ رہی ہو کوئی بات نہیں۔ دنیا میں اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ادھر شہنائی بج رہی ہے۔ عروسِ جمیل کے ہاتھوں پر حنا جمائی جا رہی ہے اور ادھر کسی کی تمناؤں کا خون ہو رہا ہے۔ حنا کی سرخی اور خون کی لالی کا تعلق دو دھڑکتے دلوں کی محبت کا شاہد ہے میری شاہدہ۔ لیکن سماج کا قانون۔ سوتیلی ماں کی طرح سنگدل ہو کر اس نوخیز محبت کی مطلقاً پرواہ نہیں کرتا۔ اس لئے معافی مانگ کر شرمندہ نہ کرو شاہدہ میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے مجھے وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب تم گرمی کی دوپہروں میں چھت پر مجھے دیکھنے کے لئے تک رہا کرتی تھیں اور سخت سردی میں جب بادلی برس رہا ہوتا تو کانپتی ہوئی میرا انتظار کیا کرتیں پھر میرے گرم آغوش میں تم ایک طرح کی آسودگی اور حرارت پا کر بے ساختہ ہنس پڑتیں اور ہلکے نقرئی قہقہے لگایا کرتیں۔ مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں حسب وعدہ تمہارے پاس نہ پہنچ سکا۔ اور تم نے تمام رات بجلی کے کھمبے کے نیچے میرا انتظار کرتے گذار دی میں تمہاری اس محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا اس لئے معافی مانگ کر مجھے زیادہ تڑپانے کی کوشش نہ کرو — اب تم ایسی دنیا میں جا رہی ہو جہاں تمہیں بڑے چاؤ سے پیار کیا جائے گا۔ تمہارے پاؤں تلے آنکھیں بچھائی جائیں گی۔ ناز برداریاں ہوں گی مجھ پردیسی کے پاس واقعی آہوں اور ٹوٹے ہوئے دل کے چند ٹکڑوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اس لئے بھول جاؤ کہ کوئی پردیسی بھی تھا۔ جس کے سینے پر سر رکھے تم رات کی حسین تنہائیوں میں تارے گنا کرتی تھیں سمجھ لینا کہ اک آوارہ سا کوئی۔ خرابِ عشق بے چارہ سا کوئی یہاں پر ایک ناکارہ سا کوئی۔ رہا تھا مختصر سا زمانہ

میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا"

خدا کرے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔

ایک پردیسی

کشمیری لال ذاکر

قطعات

۱

مری جوانی بہاروں میں بھی اُداس رہی
فضائے زیست تمنّا کو راس آنہ سکی
خوشی افق پہ کھڑی دیکھتی رہی مجھ کو
اُسے بُلا نہ سکا خود وہ پاس آنہ سکی

۲

مری سلگتی جوانی یہ چاندنی راتیں!
خزاں رسیدہ امیدیں بہار کا موسم!
مری حیات، اسے اشک بھی نصیب نہیں
شباب و حسن کی مستی، خمار کا موسم!

۳

فریبِ آگہی ہے اور کیا ہے
مسلسل بے کلی ہے اور کیا ہے
پتہ ہے مجھ کو ذاکرؔ زندگی کا
اجل کی دل لگی ہے اور کیا ہے

اقبال تمنائی

بارگاہِ حسن

میری جان، تمہارے پاس آنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن — آہ! کمبخت ناتوانی مجھے روک رہی ہے۔ اور توانائی — کا چراغ سسکیاں لے رہا ہے کیوں؟ جانتا ہوں کہ یہ تمہارے ہی کرم کا نتیجہ ہے۔ میری جان!—

لیکن تم خاموش ہو جیسے کوئی بت پتھر کی مورت! اپنے پجاری کی صدا سے ناآشنا اور مجھ بے چارے ہاتھوں کی کانپتی ہوئی جنبش، لڑکھڑاتی ہوئی آواز کی لرزش، اور اکھڑی ہوئی سسکیاں تیرے سامنے خاموش ہے — اور کوئی جواب نہ دے — کیا کہہ رہا ہوں! — سنتی ہو — ایک عرصہ سے: — کچھ تو کہہ رہا ہوں تم سے —"

جواب تو دو — کیا دو گی۔ میرے دل کی دھڑکن — میرے دل سے نکلے ہوئے نغمے شاید! تیرے لئے — موزونیت کا سامان پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن کچھ تو کہو — کہ میں یہ اپنا چھیڑا ہوا راگ الاپتا ہوں یا ہمیشہ کے لئے بند کر دوں —

یہ دنیا کی خلش میری حیات کے دروازہ کے سامنے ایک معمہ ہے۔ میں فلاسفر تو نہیں ہوں کہ اس گتھی کو سلجھا سکوں۔

ہاں جانتا ہوں — کہ جدھر دیکھتا ہوں تیری صورت دکھائی دیتی ہے۔

ڈرتا ہوں کہ جیسے یہی حال رہا۔ تو — ! میرے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہوگا۔ دنیا مجھے سودائی نہ کہے کہیں — سمجھتا ہوں کہ میں اب بھی دیوانہ ہوں — اور تو پردہ نشین — یہ بھی ایک معمہ ہے — میں کیونکر آؤں؟ — تیری بارگاہِ حسن تک۔ اور تم کیونکر پہنچو میری دیوانگیٔ عشق تک۔ اب تو کچھ کہو —

آئندہ شمارہ کی جھلک

۱۔ دیا کرشن گردش — ادبی مقالہ
۲۔ نرسنگداس نرگس — وداعِ آخر
۳۔ و۔ا۔ مجروح — کسک
۴۔ پریم ناتھ پردیسی — ترک
۵۔ محمد عمر (نور الٰہی) — داستان گوداری
۶۔ عشرت کاشمیری — تشنۂ تکمیل
۷۔ طالب گورگانی — ہاتفی نالہ
۸۔ حمید نظامی — تحفہ
۹۔ عمر حزیں — ایک مشاہدہ
۱۰۔ گلزار احمد فدا — نوی کے انش پارہ

تیسری غلطی نہ ہو!

یہ ہے ان کی پہلی غلطی ——— جب جوانی سے جلد ہاتھ دھو بیٹھے۔

دوسری غلطی یہ ——— سمجھائے بھی نہ سمجھے

ہزار مرتبہ سمجھایا ایک ہی دوا اور ایک ہی مالش سے ہر قسم کی کمزوری۔ ناطاقتی۔ اندرونی بیرونی۔ رگوں پٹھوں کی خرابیاں وغیرہ کا صحیح مکمل علاج نہیں ہوتا۔

تیسری غلطی ——— اب یہ نہ سمجھیں

ہماری دوائیں بھی عام لوگوں کیطرح ہوں گی کسی غلط خیال کے ماتحت اپنے آپ کو نعمت سے محروم نہ رکھئے یقین جانئے ہماری دوائیں شرطیہ مجرب ہیں کئی حکیم ڈاکٹر بھی اپنے مریضوں پر تجربہ کر چکے ہیں۔

جھوٹے لوگوں سے بچکر آیئے!

اور قیمت بعد آرام دیجئے۔ وی۔ پی منگوانے والوں کے بھی تعریفی خطوط آتے ہی رہتے ہیں

قیمت حسب حیثیت اور مطابق حالات

ملنے کا پتہ:- مینیجر دی ہیرو فارمیسی رجسٹرڈ۔ وزیر آباد (پنجاب)

پیام

فن کار

اثر صہبائی

ا۰ر۰ مجبور	حمیدہ فضل کریم
ذکیہ خاتون	بملا گپت
ایم۰ اے۰ عزیز	عبدالعزیز علائی
عشرت کاشمیری	غلام رسول نازکی
عزیز کاش	موہن یاور

اخگر عسکری

ستمبر
۱۹۴۵

مکتبہ چاند جموں

ایڈیٹرز
گلزار احمد فدا - ادیب فاضل
اقبال تمنائی
چندہ سالانہ:- پانچ روپے

پریم
جموں
ستمبر ۱۹۴۵ء
جلد نمبر ۳ —— شمارہ نمبر ۵

لاہور آفس
گورو ارجن نگر لاہور
مہتمم:- ناگر مل مہاجن
فی پرچہ:- آٹھ آنے

پریم رس

(دیوان گیان چند پرنٹر پبلشر نے دیوانہ پریس جموں سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "پریم" جموں سے شائع کیا)

ادارہ

پریم کہانی

شکر ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوئی۔ اردو ادب اور صحافت کے تدریجی ارتقا پر اگرچہ اس جنگ کا بہت اثر ہوا تاہم صاحبِ ذوق ادارے اپنے انہماک سے مصروفِ عمل رہے اور بقدرِ استطاعت ادب و صحافت کی خدمت کئے چلے۔ مکتبہ چاند جموں بھی جنگ کی کرم فرمائیوں سے متاثر ہوا لیکن اس کی نظر اپنے بلند مقاصد اور اٹل عزائم پر برابر رہی چنانچہ سب سے پہلے "پریم" کا احیا رہا۔ اور خاص باقاعدگی اور دلچسپی کے ساتھ ادبی خدمت کے اہم فریضے کی ادائیگی ہونے لگی۔ اس کے بعد مکتبہ نے شری مولا رام کوٹی کے اٹھارہ دیہاتی افسانوں کا بہترین مجموعہ "دکھیا دلیس" پیش کیا جس کے متعلق زیرِ نظر شمارہ میں خود اڈیٹر کا ایک مضمون "دکھیا دلیس" موجود ہے۔ لیکن ہم کتاب کے متعلق اتنا ضرور کہیں گے کہ زندگی کے بصیرت افروز حقائق و معارف کا یہ ایسا دلپذیر مرقع ہے کہ جس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر مرد و عورت اپنے اخلاق و کردار میں یکساں طور پر ایک طرح کا تعمیری تغیر محسوس کریں گے "دکھیا دلیس" کے بعد مکتبہ "پڑلیپی پریتم" پیش کر رہا ہے جس میں ریاست کشمیر کے ممتاز اور مشہور افسانہ نگاروں کے مختلف شہپارے درج ہوں گے اور اس کتاب کو جناب نرگس نے مرتب کیا ہے۔ جو بہت جلد چھپ کر منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ مکتبہ چاند جموں کی یہ حسین کوششیں کس درجہ لائقِ تحسین ہیں۔ اس کا اندازہ ادبی اور علمی خدمت سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مکتبہ کی کوششوں سے اربابِ ذوق کی علمی و ادبی تشنگی کو مٹا کر رہے گا۔

حمیدہ فضل کریم، ذکیہ خاتون اور غلام رسول نازکی ہمارے نئے پریم نواز ہیں بتدریج افسانہ، مضمون اور نظم پیش کر رہے ہیں۔ حمیدہ کا "پابندِ وفا" دو دھڑکتے دلوں کا ایک دلکش ملاپ ہے جس میں اصلاحی پہلو یہ ہے کہ مردہ روایتوں سے بدکنے والے نوجوانوں کے کان امیٹھے گئے ہیں۔ ذکیہ خاتون کا مضمون "پریم کی شانِ نزول" چونکہ خاصا پریم سے متعلق ہے اسلئے ادارے کا فرض یہ ہے کہ اس کی پرکھ کرے نہ کہ بے محل تعریف مثلاً رسول نازکی کی "مہلت" اندازِ بیان اور طرزِ تخیل کے لحاظ سے ایک دم نئے ادب کی آئینہ دار ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب۔ دولت رام گپت کی "روپی" بڑی بادفا تھی۔ پڑلیپی پرتیم کے تقی الفات میں اس نے زندگی کا صحیح کیف پایا مگر وائے قسمت کہ پرتیم نے محبت کی دیوی کے سامنے سر جھکانے کی بجائے سماج کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ روپی پڑھنے کے بعد ہمارا جذبِ باقی ماتم درد و یاس کی جو ادھوری تصویر کھنچتی ہے اس کو عزیز کاشی کی "زنجیر" اور عبد العزیز علائی کا "طلسم" دونوں مجموعی طور پر مکمل کر دیتے ہیں اور حزن و ملال کا ایک ایسا شاہکار تیار ہو جاتا ہے جس کے چاروں طرف دکھ ہی دکھ ہے اور مسرت کا تصور بھی نہیں۔ چوٹ کھائے ہوئے دل اس دکھ میں خاص لذت پائیں گے۔ عشرت کاشمیری کا "تشنۂ تکمیل" چونکہ موجودہ نمبر میں بھی تشنۂ تکمیل ہے لہٰذا اس کے محاسن کو اجاگر کرنا قبل از وقت کام ہے البتہ "آغاز" سے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ خاصا دلچسپ ہے۔ تقریباً یہی کیفیت ایم اے عزیز کے بہترین اخلاقی ڈرامے "نوشتۂ تقدیر" کی ہے جس کی دروہ اس کی طوالت اور عدم اختصار ہے بہر صورت دونوں چیزیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ مجبور کی "دہلی چنٹی" ایک اداس پرور زندگی کے نشیب و فراز ہیں جس میں آنسو اور قہقہے ایک ساتھ سنائی دیتے ہیں۔ اس بار مجبور کا اسلوبِ نگارش بالکل اچھوتا ہے۔ یعنی ایک عورت سے دو شخص محبت کرتے ہیں اور جانے کب تک ان کی محبت قائم رہے گی بھلا گپت کا "ادھورا سپنا" غالب کے اس شعر کی نازک تفسیر ہے۔

تیرے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

رعنا نظامی کی "یادِ ایام" تڑپا دینے والے حسین ماضی کا ایک جگر پاش تصور ہے جو اتنا گہرا، اتنا لطیف اور اتنا شدید ہے کہ رہ رہ کر یہ شعر ایک طویل آہ کے ساتھ زبان پر آ نکلتا ہے ۔

بسر ہوئی تھی ترے ساتھ زندگی کچھ دن
پھر اس کے بعد مزا زندگی کا آ نہ سکا

(باقی صفحہ ۴ پر دیکھیں)

ذکیہ خاتون

"پریم" کی شانِ نزول

"پریم" جن عزائم کے ساتھ نمودار ہوا ہے ان کو بروئے کار لانے کے لئے وقت درکار ہے۔ روپیہ نہیں "پریم" کی اٹھان یلغاریں نہیں مارے گی بلکہ آہستہ خرامی اس کا شعار ہوگا۔ آپ کو اس وقت جو خامیاں اور کوتاہیاں نظر آ رہی ہیں۔ وہ نرگس کی آنکھ سے پوشیدہ نہیں مگر بچپن سے "عنفوانِ شباب" کی توقع قبل از وقت ہے پریم کے پروان چڑھنے کا ارمان مدح و ستائش نہیں چاہتا بلکہ اسے ([illegible]) (معاندانہ نکتہ چینی) کی ضرورت ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ سوسائٹی کیا چاہتی ہے کیا نہیں چاہتی۔ اس لئے پریم آپ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ آپ اس کے حرف حرف پر حرف گیری کریں اور بتائیں کہ اس کے شایانِ شان کیا ہے؟ پریم کے لائحۂ عمل کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی جاتی ہے جس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ پریم کس اونچی گھاٹی کو سر کرنے کے لئے کندھے تول رہا ہے جو عموماً تمام ہندوستان میں ملیگا اس سلسلہ میں بحیثیت ایک از باشندگان ریاست جموں و کشمیر پر لازم آتا ہے کہ آپ بھی اپنا فرض پہچانیں اور اسے سرانجام دینے کے لئے کل ہی کو بھول جائیں۔

یہ رسالہ نرگس صاحب نے کئی سال کی غور و فکر کے بعد ہاتھ میں لیا ہے۔ نرگس صاحب کو آپ اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ دیوان پریس کے مالک، چاند کے رئیس التحریر، مکتبہ چاند کے بانی، بزمِ ادب جموں کی روح۔ اپنے رنگ کے واحد افسانہ نگار اور کہنہ مشق صحافی ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ دیوان ورسنگھ اس نرگس (نرگس نرسنگھ اس کے حروف کے مجموعہ سے برآمد ہوا ہے) زبانِ اردو کے والہانہ خدمتگزار ہیں اور وہ ہر وقت زبان کی خدمت پر اپنی تاجرانہ مساعی قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ گو یہ کہیے یا دعویٰ اور ممکن ہے کوئی ستم ظریف اسے خبط کے نام سے پکارے یہی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی راجدھانی جموں کو ہماری زبان کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہو۔ اگر یہ لگن، دھن اور خبط نہیں تو نرگس جیسی مصروف ہستی اور یہ بارِ عظیم اپنے کندھوں پر لینا کارے دارد۔ لیکن آپ غور سے دیکھیں گے تو نرگس کا یہ عزم صرف ان کے من کی امنگ یا اپج ثابت نہ ہوگا بلکہ یہ ظاہر ہوگا کہ نرگس نے فقط ایک منجھے ہوئے نباض کا کام کیا اور یہ بھانپ لیا کہ جموں میں اردو کا مرکز بننے کی صلاحیت ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ایک منظم سہارے کی ضرورت ہے۔ جموں پنجاب کے بالکل قریب اور جغرافیائی لحاظ سے اس کا ایک جزو ہے اور آپ سنکر حیران رہ جائینگے کہ ماسوا لاہور کے پنجاب کا کوئی شہر ایسا نہیں جو ادبی خدمات کے تعلق میں جموں سے لگا کھا سکے۔ اس خطہ میں پچاس کے قریب اخبار۔ دس رسالے اور ۲۴ پریس اور کتنے ہی ناشرانِ کتب کے ملتبے مل سکتے ہیں۔ اور جموں میں دو پریس ایسے ہیں جو لاہور کے ناشران کی کتابیں طبع کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی نرگس کا یہ عزم ہے کہ ریاست کے اہلِ قلم کو ایک مرکز پر لایا جائے ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور آہستہ آہستہ وہ زبان کے قابلِ قدر خادم ثابت ہوں۔ پریم کی حیاتِ جدید کے چار نمبر پوری باقاعدگی کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ ان میں جملہ مضامین ریاستی قلم کاری کا ثمر ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ادارہ پریم بیرونِ ریاست ادبا۔ اور اساتذہ سے بغاوت کر رہا ہے۔ ہرگز نہیں اور خدا کرے، ایسا نہ ہو، میرے خیال میں پریم ان کی رہبری و رہنمائی اور اصلاح کا ہر وقت دست نگر ہے۔ اور ان کے صلاح و مشورے کا بہ شکر تمام خیر مقدم کرے گا۔

پریم جن قلموں کے سہارے میدان میں آیا ہے۔ ان میں سے اکثر مثلاً دیا کرشن گرد عش، اثر صہبائی، محمد عمر نور الٰہی، اصغر عسکری، حبیب کیفوی، کشن سمیلپوری، عبد العزیز علائی، طالب گورگانی۔ ا۔ د مجوبہ اور پریم ناتھ پردیسی ہندوستان بھر سے داد حاصل کر چکے

ہیں - اور جن کی امداد کی پریم کو ضرورت ہے۔ مگر ادارہ ان کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ جب وہ پریم کے سہارے کے بغیر چل پھر سکتے ہیں تو پھر ادارہ خواہ مخواہ دستِ تعاون کیوں دراز کرتا پھرے۔ باقی وہ اُٹھتی ہوئی کونپلیں ہیں جن کے منڈھے چڑھنے سے "پریم" کی امیدیں وابستہ ہیں اور یہ وہ سدابہار پھول ہیں جنہیں مہیسر چڑھانے کے لئے ادارہ پریم کی جملہ مساعی وقف رہیں گی اور اسے امید ہے کہ اہلِ ذوق ان بروا کے پتوں کو اور چکنا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

لگتا ہی بات دیدہ کے رشحات جانیں اور وہ سا ادارہ نہ اس میں دخل دیتا ہے نہ اس کے حسن و قبح کا ذمہ دار مگر طلوعِ نو کے کارناموں کے سقم و نقائص کے ذمہ دار چیف ایڈیٹر صاحب ہیں۔ بوقتِ فرصت وہی جواب دہ ہوں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ گرگس اور گلزار صاحب لاکھ صاحبِ عزم ہوں مگر بغیر آپ کے تعاون کے وہ ایک پبلک کام کو سر سے نہیں چڑھا سکتے۔ آپ کو ہماری بدقسمتی سے اگر مضمون لکھنے کی فرصت نہیں۔ تو آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ جن میں ادبی جوہر قابل دیکھیں۔ انہیں پریم کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کریں جو باتیں آپ کی نظر میں اصلاح طلب ہوں ان سے مطلع کریں یہ کوشش کریں کہ پریم کسی کا دستِ نگر نہ رہے اپنا بوجھ آپ اٹھا سکے کیونکہ پریم کے مستقل خریداروں کی تعداد میں اضافہ آپ کا فرض ہے۔

(**بقیہ پریم کہانی صفحہ ۲**) موہن یادو کا "بابو ایک پیسہ" ایک ایسی صدا ہے جس میں ہندوستانی فلاکت اور بے چارگی جھانک جھانک کر رحم کی التجا کر رہی ہے لیکن افسانہ نویس ذرا سنگدل واقع ہوا ہے اس صدا کو خود تو نہیں سنتا لیکن در پردہ دوسروں کو سننے کی ترغیب دیتا ہے لطیف اختر (مرحوم) ہمارے ایک خوش فکر شاعر تھے لیکن ان کی "امید" کبھی پوری نہ ہوئی۔ وہ خود پورے ہو گئے مگر ان کی "امید" اب بھی قائم ہے۔ کوثر سیمابی کی "تلخیاں" مزاح، حقیقت اور زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا حسین امتزاج ہے "پریم" میں تلخیوں کا سلسلہ برقرار رہے گا اصحابِ ذوق کو صلائے عام ہے کہ وہ آزادانہ تلخ حقیقتوں کو موضوعِ بحث بنائیں۔ منظومات کے باب میں آثر لکھنوی۔ اثر صہبائی۔ اخگر عسکری دیا کرشن گردش، تمکین سیپوری، رسا جاودانی، بشارت فارانی، کیفی، برج لال ذوق کی دفعہ ایک خاص انداز میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ دیکھئے اور داد دیجئے۔

(**بقیہ تلخیاں صفحہ ۵**) ٹانگوں کے سہارے اس چھیل چھبیلی کا طواف اس انداز میں کریں گے کہ دُور سے رقصِ بسمل دکھائی دے آپ کے علاوہ اس البیلی حسینہ (بزم) کے عشق کا دم بھرنے والے چند لونڈے بھی ہیں۔ جو غالباً میر صاحب سے "عشق و محبت" کے ابتدائی درس لیتے ہیں آخر میں میر صاحب کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس الہڑ حسینہ (بزم) کے بانکپن میں نکھار پیدا ہو "سادہ" رونق بانداز میں شباب، تو سب سے پہلے نظر میں بلندی اور دل میں وسعت پیدا کرتے ہوئے بغض و عناد، حسد و کینہ اور تعصب و جانبداری کے رکیک جذبات سے اپنے تئیں پاک و صاف کریں۔ جب کچھ بن سکے گا ورنہ یہ حسینہ ہو گی، آپ ہوں گے اور رقصِ بسمل۔

لطیف ہاشمی

داغِ ناکامی

دور، ہاں حدِ نظر سے بھی بہت دُور لطیف! — لالہ زارِ شفقِ شام کے قریب

داغِ ناکامی اُبھرتا ہے ستارا بن کر — اپنے پہلو میں چھپائے ہوئے طوفانِ مہیب

پرورش پاتا رہا سینۂ مظلوم میں جو — جس کو سختی سے دباتا رہا دستِ تہذیب

کوثر سیمابی

تلخیاں

مسٹر سوز یکا آتش نے اگست کے شمارہ میں "چند تلخیاں" لکھ کر اہلِ ذوق کے لئے ایک مفید بحث و تجسس اور ادبی تنقید و تبصرہ کی راہ کھول دی ہے آپ نے جو کچھ لکھا وہ باون تولہ پاؤ رتی ٹھیک۔ انتہائی سبق آموز اور نام نہاد ادبا کے لئے تازیانۂ عبرت۔ لیکن آپ نے "درشتی پہلوانوں" کا ذکر تو کیا مگر اس "اکھاڑے" کے نشیب و فراز حسن و قبح اور نشست و برخاست سے متعلق خامہ فرسائی نہیں کی کہ جس میں یہ لوگ زور کرتے اور قلابازیاں کھاتے ہیں کبھی اوندھے منہ گرتے اور کبھی چاروں شانے چت گرے پڑے ہوں۔ اپنا اکھاڑہ ہے۔ اپنا منصف اپنے پہلوان غرضیکہ سب کچھ ہی اپنا ہے پھر اگر مطلق العنانی نہ ہو تو آپ کی سیرت مشکوک ہو جائے لاکھوں عقیدت پھیلتے پھیلتے بجائے خود خواجہ حسن نظامی بن جائے۔ لیکن وہ تو ایک سو درد مند بزرگ، ولی اور اردو کے کہنہ مشق ادیب ٹھہرے۔ بھلا خاک کو اکسیر سے کیا نسبت، سو حضرات چھوڑیئے اس جملہ معترضہ کو۔ قصہ یوں ہے کہ ہمارے یہاں کہنے کو تو بےشمار انجمنیں ہیں، نیشنل کانفرنس، مسلم کانفرنس، راجیہ ہندو سبھا۔ گوجر جاٹ کانفرنس اور کئی دوسری انجمنیں اپنی اپنی ڈگر پہ چل رہی ہیں، اور چلتی رہیں گی لیکن ہمارے یہاں ایک ایسی انجمن یعنی "بزم" بھی ہے۔ جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کی لاکھ کوشش کریں لیکن وہ بیچاری کچھ ایسی قابلِ رحم حد تک غیر معروف ہے کہ آپ کا ذہن اس کے ادراک کے باب میں ایک دم معذور رہے گا۔ وہ تو خوش نصیبی ہے آپ کی کہ میں اس کا پرانا آشنا ہوں، اچھی بری، گوری کالی، میٹھی اور نمکین سب اداؤں اور لگاوٹوں کو جانتا پہچانتا ہوں اس لئے آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ ہاں صاحب یہ کوئی سیاسی نوعیت کی انجمن نہیں ہے بلکہ خالصتاً "ادبی بزم" ہے اور نصب العین ہے دنیا کا پرچار، نام کی چمک اور بڑے میر صاحب کی چرب زبانی سے آغاز میں عشاقِ ادب جوق در جوق اس کی جانب بڑھے اس نے بھی لبھانے اور شرمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ سب کو لبیک کہا۔ کام چل نکلا۔ اور اس کو پیار و عزت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن ہوا یہ جو حسد و رقابت کا کہ جب دوسروں کی نظرِ التفات وا ہوئی۔ تو سب کچھ چھن جانے کے کرب و اضطراب نے بڑے میر صاحب کے پیٹ میں مروڑ اٹھا دیئے۔ انہوں نے وہ ہاتھ دکھائے کہ بس میں کر لیا "فتنہ" کو۔ دوسرے مایوس ہو گئے اور اس کی "رونق بازار" جاتی رہی۔ بڑے میر صاحب نے لیف، پوڈر، لپ سٹک، غازہ، کاجل غرضیکہ جاذبیت کے تمام ہتھیار فراہم کئے۔ مگر عشاق بڑے باوقار تھے۔ وہ نہ ڈرے اور حلقۂ احباب "محدود" ہونے لگا۔ اب یہ عالم ہے کہ اس کا طواف کرنے والوں میں ایک کاریگر ماسٹر ہے۔ بڑا ہی حسین و جمیل۔ گلا بہت رسیلا پایا ہے خیر سے شاعری بھی کرتے ہیں حضرت۔ اور ادبی خدمت کا خبط جب اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو اخبار فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے مہاشے یہ کیا؟ کپڑے سینے کی مشین اور اخبار "زمیندار" کو آپس میں کیا تعلق؟ تو بڑے فخر سے کہتے ہیں "ابھی ہم ادب کی متحرک خدمت کرتے ہیں" کیونکہ ہمارے بڑے میر صاحب کا قول ہے کہ ادبی خدمت کا ہتھیار اتنا کارگر ہے کہ اس کے پردے میں جیب تراشی کو بھی فن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

اور طواف کرنے والوں میں دوسرے ہیں ایک منیم جی کی شاعری بڑی سندر اور منوہر ہے۔ سب کچھ لٹ جائے کوئی پرواہ نہیں لیکن دل کو تھامے رہیں گے۔ بیچارے بڑے سیدھے سادھے اور شریف انسان ہیں۔ بڑے میر صاحب کا جادو کچھ ایسا رنگ لایا ہے کہ پاؤں دھو کر پیتے ہیں اور تیسرے بڑے میر صاحب بنفسِ نفیس ہیں۔ شاعری اور سکول ماسٹری کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں "بزم" کے عاشقِ صادق ہیں اگر بدلتی بازار میں ایک طرح کا پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے تو کوئی غم نہیں اپنے منہ بڑا دم غم سمجھتے ہیں اگر کوئی بھی دل پھینک نہ رہا تو وہ اکیلے ہی کیا کم ہیں مجنوں صفت

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

آثر لکھنوی

تتلیاں

(۱)

صبح مسکراتی ہے اشکہائے شبنم پر
ننھے ننھے کچھ عاشق چومتے ہیں کلیوں کو
سہمی سہمی ہے سوسن، نسترن جھجکتی ہے
تتلیاں لپٹتی ہیں اور یوں لپٹتی ہیں
چوم کر پلٹتی ہیں۔ چومتی پلٹ کر ہیں!
رقص تتلیوں کا ہے، جشن ہے شگوفوں کا
آنکھ خیرہ خیرہ ہے ایک اک کی مستی میں
تاکتی ہیں اُس گُل کو جھانکتی ہیں اُس گُل کو
ہے پروں کی جنبش میں سب نکھار نغمے کا

جب وہ ہوتی ہے رخصت گُل کے منہ سے منہ مل کر
اور اپنے ہی قد کے نیم وا شگوفوں کو
یہ چھڑاتی ہے دامن، ہاتھ وہ جھٹکتی ہے
پھول کانپ جاتے ہیں کونپلیں سمٹتی ہیں
پنکھڑی سے پر لپٹے اور منہ لبوں پر ہیں
اک چمن ادھر پائیں اک چمن ادھر بالا
جسم تھرتھراتا ہے شوق گُل پرستی میں
دھیان میں نہیں لاتیں نالہائے بلبل کو
جس میں ہے صدا شامل اور نہ دخل نغمے کا

موسم بہاراں ہے، رنگ خود پر افشاں ہے
جھومتی ہے شاخ گُل، مستیوں کا طوفاں ہے

(۲)

خطِ شوق پے در پے مہوشوں کو جاتے ہیں
غصہ کم نہیں ہوتا، پرزے پرزے کرتے ہیں
درج چونکہ ان میں تھے اضطراب کے مضموں
منتقل یہ ہوتے ہیں۔ تتلیوں کی صورت میں
تاکہ اس سے مل جائیں جس نے ان کو بھیجا تھا

پڑھ کے بے وفا مضموں تیوریاں چڑھاتے ہیں
کچھ بکھیرے جاتے ہیں خود ہی کچھ بکھرتے ہیں
پیچ و تاب دل کہیئے یا کہ عشق کا افسوں!
اڑتے پھرتے ہیں ہر سو انتہائے وحشت میں
قطع سلسلہ کر دیں انتظارِ بے جا کا!

فصلِ گُل ہوئی آخر اور ساز و ساماں ہے
عشق سر بزانو ہے حسن بھی پشیماں ہے

گلزار احمد فدا

دُکھیادیں

گذشتہ پچاس سال کے اندر جس تناسب کے ساتھ ہندوستانیوں کے سیاسی اور ادبی شعور نے ارتقائی منازل طے کیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے یہاں سکون، اطمینان اور آسودگی کا اگر یکسر فقدان نہیں تو اس درجہ کمی ضرور ہے کہ جس سے ان کا معیار زندگی قابل رشک حد تک بلند نہیں کہا جا سکتا۔ تقریباً اسی تناسب کے ساتھ ان کی زندگی میں حرکت جوش اور مصروفیت پیدا ہوئی۔ اور اسی مصروفیت کا یہ ثمرہ پیش رس ہے کہ ہندوستانیوں کے ادبی میلانات اور علمی رجحانات میں ایک طرح کی خوشگوار اختصار پسندی نے جنم لیا خوشگوار اس لئے کہ ان کے تغیر پذیر مذاق ادب و سیاست نے ناول کی بے جا اور ضرورت سے زیادہ طوالت سے گھبراہٹ اور سیر چشمی کا اظہار کیا۔ نئے نئے تجارب سے جب ادبی فراست میں نئی چمک پیدا ہوئی تو بھلا ایسی طبیعتوں کو اتنی فرصت و فراغت کہاں تھی کہ وہ الف لیلے، امیر حمزہ اور جن وپری کی غیر مفید اور طویل داستانوں اور ضخیم ناولوں کی متحمل ہو سکتیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عظیم انقلاب اور ہیجان پیدا ہو چکا تھا جس سے متاثر ہو کر فطرتاً انہیں نئے راستوں کی جستجو ہوئی کہ جو طویل نہ ہوں۔ اور جن پر گامزن ہونے کے بعد چند لمحوں میں یہ اپنی منزل پا سکیں اور یہی وہ راستے ہیں جن کو عرف عام میں "مختصر افسانے" کہا جاتا ہے۔

یوں تو اردو مختصر افسانے کے آثار سرشار کے فسانۂ آزاد میں بھی پائے جاتے ہیں بلکہ سرشار اور مولوی نذیر احمد کے ہمعصر بھی اکا دکا مختصر افسانے لکھتے رہے ہیں لیکن صحیح معنوں میں اس کی ابتدا منشی پریم چند آنجہانی سے ہوتی ہے آپ بلاشبہ مختصر افسانہ نویسی کے بابا آدم ہیں۔ آپ نے ایک خاص سلیقے اور بالغ نظری سے اردو مختصر افسانہ نویسی کو ایک زندہ اور مستقل فن بنا لیا۔ جو ناول کے فن سے زیادہ وقت طلب اور مفید ہے۔ چند لطیف، سیدھے سادھے نازک اور سچے اشاروں میں ایک پوری زندگی کو پیش کر دینے کا دوسرا نام افسانہ ہے اور یہ افسانہ اردو میں ایک عرصہ تک عشقیہ غزل سے زیادہ وقعت و اہمیت نہ پا سکا افسانے کا مرکزی تخیل وہی پرانا رومان، عشق و محبت کے فرسودہ اور بے کار تخریبی قصے اور ناکام ہجر و وصال کے مہلک ترانے رہا۔ افسانہ نویسوں کے نزدیک حسن و عشق ایک محور تھا۔ جس کے ارد گرد گھوم کر وہ افسانہ نویسی کے فن کی تکمیل کر رہے تھے زمانے کے حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو گونا گوں تغیر پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا انہیں قطعاً احساس نہیں تھا وہ دو دھڑکتے دلوں میں فراق و وصال کی چند کیفیتیں پیدا کر لینے کے بعد محبت کے عمیق سمندر میں ڈبو کر ان کی دھڑکنیں بند کر لینے میں ہی افسانہ نویسی کا کمال سمجھتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح محبت کا نیا نفسیاتی اور جنسی تصور پیدا ہوا اور ہم بڑے پندار سے کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ پچیس سال میں اردو افسانہ نے محبت و الفت کے جو شاندار شاہکار پیش کئے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں کسی عنوان فراموش نہیں کئے جا سکتے لیکن وقت کے تقاضوں کو ایسے رومانوں کی ضرورت نہیں تھی ایسے مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصوں کی احتیاج بھی نہیں تھی۔ یہاں تو زندگی کی گہری، نازک اور بہت سی حقیقتوں کو بے نقاب اور عریاں دیکھنے کی آرزو تھی۔ مجاز سے نفرت اور حقیقت سے پیار ہو گیا تھا محض خیالی، وہمی اور تخیلی باتوں سے ان کے اضطراب، بے چینی اور بے قراری میں کسی طرح کی کمی پیدا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ عوام و خواص بیشتر حقیقت کے پرستار تھے۔ لہٰذا وقت کی ضرورتوں کے مطابق اردو مختصر افسانے میں جدید میلانات کی تخلیق ہوئی اور افسانہ نویسی کا معیار یہ قائم ہوا کہ جو کچھ دیکھو، سمجھو اور محسوس کرو۔ بغیر کسی لاگ ولپیٹ کے من وعن اس کو اپنے الفاظ میں بیان کر دو۔

منشی پریم چند اس اعتبار سے موجودہ اور مستقبل کے افسانہ نویسوں کے صحیح رہنما ہیں۔ انہوں نے حقیقت نگاری کو اپنے فن کا طرۂ امتیاز قرار دے کر سماجی اور معاشرتی واقعیت کو مستحکم اور پائیدار بنایا اور افسانے کو زندگی کی حقیقتوں سے چپکا دیا۔ اس کے بعد اردو ادب میں بے شمار ایسے افسانہ نویس پیدا ہوئے جو اپنے تئیں پریم چند کے جانشین اور مقلد سمجھنے لگے لیکن کوشش کے باوجود ہمیں چند افسانہ نویسوں سے زیادہ ایسا ادیب نظر نہیں آئے جو صحیح معنوں میں پریم چند کی تقلید کرنے میں کامیاب ہو سکے ہوں۔ دوسروں کو ناکامی محض اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے پریم چند کے تتبع کو صرف افسانے کے اختصار تک محدود رکھا۔ پریم چند کی افسانہ نویسی کے اصلی جوہر کیا ہیں؟ ان کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ پریم چند کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کی ترجمانی کی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ ہندوستان دیہات کا مجموعہ ہے اس کی بیشتر آبادی دیہات میں پھیلی ہوئی ہے اور دیہات میں جو تاریکی انسانیت کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہی ہے اس کو دور کرنا ہی ملک و قوم کی سچی خدمت ہے چنانچہ انہوں نے قابل فخر خدمت کی جس کو تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھا جائیگا۔

جس کام کو منشی پریم چند نے شروع کیا تھا اس کو نہایت سلیقے اور چابکدستی سے پورا کرنے والے موجودہ اردو افسانہ نویسوں میں آل اعظم کریوی، مہاشہ سدرشن، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی اور ممولا رام کوٹی ہیں۔

دوسروں سے تو آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ اس وقت میں آپ کو صرف ممولا کی افسانہ نویسی اور شخصیت سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

ممولا ریاست کشمیر کی ایک جاگیر رامکوٹ میں تقریباً سولہ سال مختار عام کی حیثیت سے مقیم ہے۔ اپنی زندگی کے زریں اور قیمتی لمحات کو آپ نے دیہات کے تلخ اور بصیرت افروز مشاہدات کی نذر کیا۔ آپ کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا جوان اور حساس دل تھا۔ جہاں کہیں دیہاتی غریبوں پر کسی قسم کا ناجائز ظلم ہوتا دیکھتے تو تڑپ کر رہ جاتے۔ جوش، غیرت اور انسانی ہمدردی کے جذبات آپ کو بے چین اور پریشان کر دیتے لیکن جگر پاش ٹھنڈی آہیں بھرنے کے سوا آپ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے مگر آپ کچھ اور بھی کرنا چاہتے تھے کچھ اور کہ جس سے دیہاتی باشندوں کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو اور وہ بھی امن اور چین کی زندگی بسر کر سکیں چنانچہ اسی فکر میں دن رات غرق رہتے لیکن کوئی ایسی بات نہ سوجھی کہ جس سے ان کی دلی تمنا بر آتی۔ البتہ دیہاتی کسانوں پر آئے دن ٹوٹنے والے مظالم سے آپ اپنے درد مند دل پر نت نئی چوٹیں برداشت کرتے گئے اور جب برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور دل چھلنی بھی ہو گیا تو آپ خاموش نہ رہ سکے۔ ملازمت کو ٹھکرا دیا اور ہندوستانی دیہات کے داخلی حالات سے کماحقہٗ واقف ہونے کے لئے ایک عرصہ تک صحرا نوردی کرتے رہے۔ اس صحرا نوردی نے آپ اور اس انسانی ہمدردی نے آپ کو ایک حقیقت نگار افسانہ نویس بنا دیا جو آپ کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں دیہاتی کسانوں سے متعلق ہمیشہ ہمیشہ جاگزیں رہی۔ تب آپ نے لکھنا شروع کیا۔ اس دکھیا دیس میں آپ نے جو جو کچھ دیکھا اور اس سے جو جو کچھ اثر قبول کیا۔ اس کو تمام و کمال اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور یہی بیانات محبت کے پاک اور حیات بخش رومان، زبان کی لطافت اور حقیقت کی نزاکت کے امتزاج کے بعد بہترین اور سبق آموز افسانے بن گئے۔ چنانچہ ممولا کے درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے فن پاروں کا پہلا مجموعہ "دکھیا دیس" آپ کے سامنے ہے۔

یہ کہانیاں دیہاتی غریبوں کی آہوں، سسکیوں، چیخوں اور آنسوؤں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں جب ان آہوں اور آنسوؤں کو آپ ذرا قریب ہو کر دیکھیں گے تو آپ کا جی چاہے گا کہ ان میں سما جائیں لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ان میں سمانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ یقیناً آپ وہاں کے دردناک مناظر نہیں دیکھ سکیں گے وہ دلدوز مناظر جہاں چاروں طرف موت کی حکمرانی ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ تاریکیاں ہیں۔ گہری اور ہولناک خوف و ہراس سے پُر۔ انسانیت تلملا رہی ہے وہاں لیکن اس کی جان نہیں نکلتی وہ مناظر آپ کے نازک احساسات کے لئے ایک بار ثابت ہوں گے۔ نہیں مانتے تو وہ دیکھئے ـــ اس بیوہ کے آنسو آپ کو کیا بتا رہے ہیں کتنا گھناؤنا اور روح فرسا منظر ہے۔ گاؤں میں تحصیلدار اور پولیس انسپکٹر گھوڑوں پر سوار

جاتے آتے ہیں۔ اتفاقاً اس بیوہ پر نظر پڑ جاتی ہے۔ رات کو ملازم بزدستی اٹھا لاتے ہیں۔ اور پھر؟ . . . . پھر انسانیت کے گلے پر کند چھری رکھ دی جاتی ہے گاؤں میں کسی کو لب کشا ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جانتے ہیں یہ منظر سرخ کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ آنسو خون کے آنسو ہیں جو کتنی بار اس کی شربتی آنکھوں نے اپنے دکھیا دیس کی نذر کئے۔ دوسرے منظر میں آپ کو ایک دوشیزہ کی لاش نظر آئے گی گاؤں کے تالاب پر تیرتی ہوئی جس کو دیکھ دیکھ کر اس کا پانچ سالہ بھائی رو رہا ہوگا۔ اور جسے چپ کرانے والا اس سنسار میں کوئی نہ ہوگا۔ دور افق پر دو ستارے ٹوٹیں گے جو شاید اس یتیم کے والدین کی مضطرب روحیں ہوں گی جو اپنے لخت جگر کے آنسو برداشت نہ کر سکیں اور ٹوٹ گئیں — میں کہتا ہوں آپ کہاں تک ضبط کریں گے — وہ دیکھئے پٹواری زبردستی رشوت لے رہا ہے کیونکہ تحصیلدار کا حکم یہی ہے دیہاتی غریب اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی بصد حسرت و یاس مہذب "ڈاکوؤں" کے حوالے کر دیتے ہیں۔ شام کو تحصیلدار کی قیام گاہ پر خرابات کا دور چلتا ہے عیش و عشرت کے لوازمات زبردستی یا رضامندی سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ قدرتاً مہلک امراض لاحق ہوتی ہیں۔ اور پھر موت، ہاں وہی موت جس کی ان مناظر میں چاروں طرف حکمرانی ہے آپ بھی کہیں گے کہ یہ موت کا تکلیف دہ قصہ کیا چھیڑ رکھا ہے لیکن میں بھی کیا کروں، ہمارا دیس دکھی ہے۔ انتہائی دکھی جس کے ذرے ذرے میں انسانی دلوں کے ٹکڑے پوشیدہ ہیں۔ ان نازک دلوں کے ٹکڑے جو اپنے ہی عزیز و اقارب کے ہاتھوں ٹوٹ گئے اور جن کو جادو نگار ممولا نے بڑے اہتمام سے یکجا کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے محض اس لئے کہ آپ ان ٹکڑوں کو دیکھیں۔ اور محسوس کریں کہ آپ کے دیہات کی حالت کس قدر دگرگوں اور قابل رحم ہے اور ان کے سدھار کی کس درجہ ضرورت ہے اگر آپ ان کو نہ دیکھیں گے تو ممکن ہے کل آپ کا دل بھی ٹوٹ جائے اور ممولا کو آپ کے دل کے ٹکڑے بھی سمیٹنے پڑیں۔

یہ کہانیاں زندگی کی سچی اور حقیقی تفسیریں ہیں۔ اچھی بری، نیک و بد، امیر و غریب۔ اپنی و بیگانی غرضیکہ ہر قسم کی اور ہر درجہ کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کا مرکزی تخیل دیہات کی زبوں حالی اور مصائب و آلام ہیں۔ دیہات میں سرکاری ملازم دورہ پر آکر جس بے دردی اور سفاکی سے اخلاق و شرافت کا خون بہاتے ہیں۔ اور پھر کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ بس انہی لوگوں کی ریاکاری اور ظلم و ستم کی کہانیاں الگ الگ کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں ہندوستان کے پانچ لاکھ دیہات کے باشندوں کی دکھی زندگیوں کا صحیح مرقع ہیں اور یہ باشندے ہی ہندوستان کی اصلی طاقت اور سچی روح ہیں۔ انتہائی محنتی، جفاکش اور ایماندار کہ جن کو خود اپنے وطن کے حکمران افراد کے ہاتھوں طرح طرح کی سختیوں اور پریشانیوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور ان کے لئے رستگاری اور نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ فطرت نگار ممولا نے ہندوستان کی سیاسی بیداری کے اس خاص اور اہم پہلو پر ایسی دور رس اور مفید روشنی ڈالی ہے کہ جس سے ممولا کی شخصیت صرف ایک حقیقت نگار افسانہ نویس کی نہیں رہی بلکہ درد مند مصلح اور محب انسانیت رہنما سے جا ملی ہے ان کہانیوں میں اخلاق و اخوت اور روش پریم کی تعلیم اس اچھوتے پیرائے میں دی گئی ہے کہ اس دور پر آشوب میں جب چاروں طرف اندھیارا، تاریکی اور مغرب زدہ بہکی ہوئی ذہنیتیں ہیں یہ کہانیاں ایک بلند اور ارفع اخلاق کی بنیاد رکھتی ہیں جس کی تعمیر انسانی زندگی کے باریک نفسیات کسان، اس کے فرائض، ہل اور بیل، چوپال اور گرد گردی سے ہوتی ہے۔ ممولا کی حکیمانہ نظر نے ان افسانوں میں چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ذاتی تجربوں سے کام لے کر وہ حقیقت پناہ اصلاحی کارنامے دکھائے ہیں کہ جن سے متاثر ہو کر بے لاگ اور صاف صاف کہنا پڑتا ہے کہ منشی پریم چند کا صحیح جانشین ممولا کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ میرے دعوے کے جواز میں یہ کہانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا مطالعہ کیجئے اور بتائیے کہ میں نے کس حد تک درست کہا! — ان کہانیوں میں بازاری اور عمومی مسائل کا شائبہ تک نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس اور ناقابل فراموش مسائل اور حقائق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ممولا کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ثانوی مسائل کو نظر انداز کر دیتا ہے وہی مسئلہ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔ جو اپنے میں خاص قسم کی ندرت اور جدت رکھتا ہو اگرچہ عشق و محبت کا موضوع حد درجہ پٹا ہوا ہے تاہم آپ کو ان

کہانیوں میں سرکاری افسروں کے مظالم اور کنواری لڑکیوں کی چیخوں کے ساتھ ہی بے لوث محبت وعقیدت کی لطافتیں اور رومان کی رعنائیاں بھی ملیں گی شریلی مسکراہٹیں اور فلک شگاف قہقہے بھی سنیں گے آپ لیکن کہانیوں کا معتدبہ حصہ حزنیہ ہے۔ نشاطیہ اور طربیہ عناصر بہت کم ہیں کیونکہ ہمارا دیس واقعی بہت دکھی ہے اور غم شناس موتا نے دیس کے تمام دکھوں اور غموں کو ایک ایک کرکے دکھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک روحانی ڈاکٹر بن کر ان دکھوں کا علاج بھی بتایا ہے دیہاتی باشندوں کی وہ اخلاقی کمزوریاں اور خامیاں بھی گنوائی ہیں جو ان کو پسماندہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور جن کی اصلاح کے بعد انہیں صحیح معنوں میں اطمینان میسر آسکتا ہے ان لوگوں کو اپنی حماقت اور ظلم و ستم کا موثر مقابلہ کرنے کے پرامن ڈھنگ بھی بتائے ہیں اور ان مضحکہ خیز اور دلچسپ رسوم و قیود پر روشنی بھی ڈالی ہے جو دیہاتی باشندوں کے نخت الشعور میں گھر کر چکی ہیں اور جن کی ... کرنا وہ اپنی نسل کی بقا اولین فرض سمجھتے ہیں ان کی حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ وہی رسمیں اور توہم پرستی ہے جو ایک حد تک ان کے مصائب کا بڑا سبب بنی ہوئی ہے البتہ ان رسموں سے پرانے تمدن و معاشرت کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور مستقبل کے تمدنی اور معاشرتی مورخ کیلئے یہ رسمیں دلیل راہ ثابت ہوں گی۔

موتا نے سماجی نقائص پر بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے اس کے نزدیک ہمارے رنج و غم کے اصلی محرک وہ زخم ہیں جو سماج اور اس کے ناخداؤں کی غلط روی سے پیدا ہو چکے ہیں۔ لیکن موتا نے ان زخموں پر مرہم نہیں رکھا بلکہ اس کی ایک ایک کہانی ایک ایک نشتر ہے جس نے سماجی زخموں کے فاسد مادہ کو نکال باہر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موتا کی افسانہ نگاری کا پس منظر سماج اور اس کے بکھیڑے، چھوت چھات اور اونچ نیچ کے قضیے غریبوں کے جھونپڑے اور روزمرہ زندگی اور ہر درجہ کے ہندوستانیوں کے باہمی جھگڑے ہیں جن کو مٹانے کے لئے موتا نے لائق ستائش کوشش کی ہے اور اردو ادب اور افسانہ نگاری قابل مبارکباد ہے کہ موتا کی یہ حسین کوشش ہر حیثیت سے کامیاب ہے

موتا کی زبان نہایت شیریں اور دلنشیں ہے اس میں بلا کی حلاوت اور برجستگی ہے تصنع اور بناوٹ سے قطعی پاک، انتہائی میٹھی اور عام فہم کہ جس میں توسیع کے دقیق اور مغلق الفاظ اور تقویم لسانیاتی رکھ رکھاؤ کا کوئی دخل نہیں بلکہ نہایت اُجلی اور دُھلی ہوئی زبان ہے البتہ بعض مقامات پر اچھوتی تشبیہات اور نادر استعارے ضرور ملیں گے جن سے بیان میں زور اور عبارت میں لطافت پیدا ہوگئی ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ موتا نے اس ناگوار الجھی ہوئی زبان سے احتیاط کیا ہے جو اردو نواز اور ہندی دوست ادبا کے لسانیاتی مناقشوں کا نتیجہ تھی موتا کی زبان کو آپ ہندی بھی کہہ سکتے ہیں اردو بھی اور ہندوستانی بھی۔ کیونکہ یہی سادہ اور آسان زبان ہے جو ہندوستان کی اصل زبان قرار دی جا سکتی ہے۔ طرز تخیل اور اسلوب بیان زبان سے بھی زیادہ جاذب نظر اور دلکش ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قلم تقاضے کے باوجود کسی مقام پر نہیں ٹھہرتے بلکہ لکھتے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ کہانی کے ختم ہونے تک قائم رہتا ہے۔ اسلوب نگارش میں ندرت کی شگفتگی اور جدت کی شادابی ہے۔

اخلاقی اور فنی اعتبار سے یہ کہانیاں بلاشبہ قابل قدر ہیں اور ان کی صحیح قدر تو یہی ہے کہ ہر وہ شخص ان کا بغور اور بڑے خلوص سے مطالعہ کرے جو زندہ ضمیر اور حساس دل رکھتا ہے اور اس دل میں انسانی ہمدردی کو شکوک کی بجائے حکومت کشمیر کو اگر یہی عاید نے سال کی ہمدردی ہے تو میرے خیال میں اس ہمدردی کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ حکومت اپنے تمام اہلکاروں کو یہ کتاب پڑھائے تاکہ غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس اہلکاروں کو معلوم ہو کہ انسانیت، اخلاق اور شرافت کیا ہے؟ ان کے فرائض کیا ہیں؟ اور وہ کس حد تک اپنے فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ بجا لاتے ہیں؟ اگر آج ہماری ریاست میں ذمہ دار نظام حکومت ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ کتاب کے مصنف کو اس کی سماجی خدمت اور کتاب کی افادی اور اصلاحی اہمیت کے پیش نظر ایک گراں قدر انعام ملتا جس سے ادب و سیاست دونوں کا بھلا ہوتا۔ تاہم میں موجودہ حکومت سے بھی توقع رکھتا ہوں جو بہت حد تک آج ہماری اپنی حکومت ہے کہ وہ مصنف کے تعمیری کام سے متاثر ہوکر ہر طرح کی حوصلہ افزائی کرے گی اور یہ کتاب تمام لائبریریوں، سکولوں اور مختلف اداروں میں درسی حیثیت حاصل کر لے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس کتاب میں سرکاری افسروں کی جو بدسلوکیاں اور سماجی نقائص بیان کئے گئے ہیں اگر ان کا آج ازالہ ہو جائے تو کبھی دوسرے ذمہ دار نظام حکومت کی ضرورت نہ رہے بلکہ یہی ذمہ دار نظام حکومت ہو۔ کہ جس میں اہلکاروں کی زبردستیاں نہ ہوں اور سب اطمینان

کا سانس لے سکیں۔ اور صحیح ذمہ دار نظام حکومت کی تعریف بھی یہی ہے — آپ ان کہانیوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیجئے۔ آپ حیران ہونگے جب آپ کو ان میں بیان کردہ بعض نازک سماجی مسائل پر نیا کشمیر کے اہم حصوں کا دھوکا ہوگا۔ اور ان کے پس منظر میں آپ کو نیا کشمیر اور ذمہ دار نظام حکومت نظر آئے جس کی دھیرے دھیرے تشکیل ہو رہی ہوگی۔ وطن کی تمام مذہبی اور غیر مذہبی سوسائٹیاں یقیناً اپنے منصبی فرض کو بجا لائیں گی جب وہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ قبول کرنے میں دلچسپی اور جمہور دوستی کا ذرا ابھی ثبوت دیں گی اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ ملکی اور قومی اصلاح کی سچی طالب ہونے کی مدعی ہیں۔

یوں تو اس کتاب کے مطالعہ سے آپ پر کئی طرح کی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا اور اپنی معلومات میں ایک قیمتی اضافہ محسوس کرینگے جس سے آپ کی علمی، ادبی اخلاقی اور سیاسی بصیرت بھی ترقی پذیر ہوگی لیکن لگے ہاتھوں میں بھی ایک انکشاف کیا چاہتا ہوں سنیئے، سنئے کہ ممولا ایک فرضی اور قلمی نام ہے۔ حقیقت میں ان کہانیوں کے لکھنے والے ہیں ہماری ریاست کے نامور اخبار نویس دیوان نرسنگداس نرگس رئیس التحریر چاند جموں کشمیر کی صحافتی خدمت تو عوام سے خراج تحسین وصول کر چکی جناب ادبی خدمت بھی مجبور کرے گی کہ آپ کی تعریف میں ایک بار پھر رطب اللسان اور عذب البیان ہو جائیں۔

ڈاکٹر رازی

مہمان نوازی

"نسیمہ! نسیمہ! بیٹی دیکھو مردانے میں کون ہے"

"کوئی مہمان ہے امّی جان"

"مہمان — — — ؟ — میرے خدا! کیا وہ کھڑا ہے ابھی تک؟"

"نہیں امّی جوتے اتارے پلنگ پر بیٹھا ہے"

"اُف۔ اس نے تو پکے پیر جما لئے۔ میرا کلیجہ دھڑک رہا ہے"

"کیوں امّی؟"

"گھر میں کچھ ہے نہیں — کوئی چیز نہیں۔ اسے کھلاؤں گی کیا؟ — الٰہی توبہ اتنی غریبی —؟

"امّی جان! گھبراؤ نہیں۔ یہ لو میری چاندی کی بالیاں اسے بیچو۔ اور مہمان کے لئے کھانا تیار کرو"

"میری معصوم بچی! نہیں میں اسے کبھی نہ بیچوں گی۔ اچھا تم ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں"

"ہیں؟ امّی — یہ تمہارے بال کہاں ہیں؟"

"بالوں کی منڈی میں"

"ہائے خدا کا غضب! کس نے کاٹ لئے؟ امّی جلدی سے بتاؤ۔ میرا دل ڈوب رہا ہے"

"بیٹی! میں انہیں دو روپے میں بیچ آئی ہوں — یہ لو روپے۔ بازار جاؤ۔ کچھ سودا سلف خرید لاؤ۔ ہمارا مہمان بھوکا ہے"

"لیکن امّی جان! مہمان تو رخصت ہو گیا"

"کیا واقعی؟ — نسیمہ!"

(دونوں کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہیں) ...

آتش صہبائی

اگر اس جہاں میں محبّت نہ ہوتی

اگر اس جہاں میں محبت نہ ہوتی
تو جینے میں کوئی بھی لذّت نہ ہوتی

نہ ہوتا صبا میں یہ رقصِ مسرت
گُلوں سے ہم آغوش نکہت نہ ہوتی

نہ ہوتا سحر کا یہ رنگیں تبسم
سرور آفریں شب کی ظلمت نہ ہوتی

نہ ہوتا شفق کا یہ پُر کیف منظر
ستاروں کی یہ بزمِ عشرت نہ ہوتی

نہ ہوتا فسوں شام کی تیرگی میں
شبِ ماہ میں یہ لطافت نہ ہوتی

نہ ہوتا طرب خیز دریا کا نغمہ
سکوں ریز صحرا کی عزلت نہ ہوتی

نہ ہوتی جنوں خیز فصلِ بہاری
جنوں میں یہ موجِ مسرت نہ ہوتی

نہ ہوتا یہ مطرب کا سرمست نغمہ
یہ نقشِ مصوّر میں رنگت نہ ہوتی

نہ ہوتی یہ شاعر کی جادو نوائی
غمِ ہجر میں یہ حلاوت نہ ہوتی

محبت خُدا ہے خُدا ہے محبت
نہ ہوتا خُدا گر محبّت نہ ہوتی!

اخگر عسکری

عروسِ بہار

(۱)

دھوئے ہیں قطرے قطرے نے منہ برگ و بار کے آؤ بھی - دن تو آ گئے ملنے کے پیار کے
گل کا نکھار سبزۂ گلشن سے ہے سوا بکھرے ہیں گلستاں میں اشارے بہار کے
کب تک یہ بے رُخی یہ تغافل یہ بے حسی
ہوتی ہے زندگی بھی تو کچھ دن شمار کے

(۲)

آؤ تو رنگ عشق کے جوہر دکھائیں ہم گوہر بنائیں قطرۂ ابر بہار کے
موتی پرو کے رشتۂ جاں میں کریں نثار آئیں اگر پسند تغافل شعار کے
پتوں کو سی کے تارِ رگِ گل سے جابجا تیرے لئے لباس بنائیں بہار کے
گلشن کی پتیوں سے بنائیں اگر لباس چُن چُن کے لائیں پھول ہر اک مرغزار کے
پھولوں کے ہار - کان کے آویزۂ گہر
پہنائیں اپنے ہاتھ سے اخگر سنوار کے

(۳)

پھر لائیں تم کو صحنِ چمن میں کشاں کشاں تم بھی جو آؤ ناز کی دنیا ابھار کے
شرما کے سرنگوں ہوں وہاں ٹہنیوں پہ گل کلیاں کہیں نثار عروسِ بہار کے
اس امتزاجِ حُسن پہ قربان حسرتیں!
دنیائے دل طواف کرے شاہکار کے

(۴)

رگ رگ میں کوند جائیں مسرت کی بجلیاں دن اس طرح پھریں جو دلِ بے قرار کے
چکر میں لا کے گردشِ دنیا کو چھوڑ دیں پرزے اڑائیں گردشِ لیل و نہار کے
ہم سے مگر نہ آنکھ ملانا دمِ وداع!!
پاؤں اکھڑ نہ جائیں کہیں اعتبار کے

کشمیری لال ذاکر

آخری رات

آج کی رات مجھے چین سے سونے دے
آج کی رات ہاں! بس آج کی رات
آخری رات میری زیستِ لاحاصل کی
کل جو مٹ جائیگی اس شبنمی قطرے کی طرح
دن کی گرمی سے دہکتے ہوئے صحرا میں جو
شومیٔ قسمت سے سرِ شام ہی گر جاتا ہے
رہ نہ جائے مرے دل میں یہ حسرت یارب
کہ میسر نہ ہوا وقتِ نزع میں آرام
زندگی میں تو مجھے رونے سے فرصت نہ ملی
خون دل رستا رہا آنکھ کے ناسوروں سے
کروٹوں کو بھی میری نیند سے چشمک ہی رہی
ایک بھی رات نہیں ہستیٔ لاحاصل میں
جو منت کشِ آرام ہوئی ہو اب تک
زندگی کیا تھی مرے جینے کا تھا ماتم ایک
اب وہ ماتم بھی تو بس ختم ہوا جاتا ہے
دُور وادی میں جگر پاش ترنم کی طرح
بانسری سے جو نکل کر ایک لمحے کے بعد
تیر کر خنک ہواؤں میں فنا ہوتا ہے
آج کی رات مجھے چین سے سونے دے
آج کی رات ہاں بس آج کی رات
آخری رات میری زیستِ لاحاصل کی

رسا جاودانی

غزل

دوشِ پر زلف کو تو آج پریشاں کر دے
میری مشکل کی گرہ کھول کے آساں کر دے

ڈال کر خاک کے ذروں پہ ذرا عکسِ جمال
تابشِ حسن سے تو مہرِ درخشاں کر دے

سامنے پیکرِ انگشت بدنداں بن کر
بیگناہی! مرے قاتل کو پشیماں کر دے

جوشِ وحشت تو دکھا آج کرشمہ کوئی
میری زنجیر کے حلقوں کو بیاباں کر دے

ہے اگر تجھ میں کرامات تو اے شیخِ حرم
ہم سے بت خانہ نشینوں کو مسلماں کر دے

کیوں نہ آئینۂ مکدر یہ رسا ناز کرے
عکسِ رخ سے جو وہ خورشید بداماں کر دے

دیا کرشن گردش

حادثہ

سوئے مغرب جا رہا تھا ڈوبنے کو آفتاب — جیسے زنداں کی طرف ملت پرستوں کا شباب
بادلوں پر آخری کرنوں کا عکسِ آتشیں — جیسے میخواروں کی آنکھیں جیسے مقتل کی زمیں
ہو رہے تھے رفتہ رفتہ دن کے ہنگامے خموش — بے زری میں جس طرح عشق و محبت کا خروش
محوِ پرواز اپنے اپنے آشیانوں کو طیور! — جس طرح زاہد شبِ تیرہ میں ساقی کے حضور
میں تھکا ماندہ رفیقوں سے جدا تنہا، اُداس — آخرش پہنچا۔ کنارِ آب۔ اک بستی کے پاس
سامنے پنگھٹ پہ اک کافر ادا، رنگیں جمال — جیسے شاعر کا تصور جیسے صوفی کا خیال
میگسار آنکھیں، حسین بجلی سی، عارض آگ سے — عارضوں پر مست لہرانے میں کالے ناگ سے
آتشیں لب، دلفریب انداز۔ سینے پر اُبھار — ہر ادا میں دلکشی، مستی، جوانی کا خمار
سر پہ پانی کا گھڑا رکھا، اُٹھی، چلنے لگی! — اُٹھتے اُٹھتے سامنے دیکھا نظر مجھ سے ملی!
کیا کہوں، آپس میں ملتے ہی نگاہیں کیا ہوا — اس طرف بجلی گری دل پر، اُدھر سر سے گھڑا
زیرِ لب کچھ مسکرائی اور پھر شرما گئی! — دیکھ کر یہ حادثہ چہرے پہ سُرخی آ گئی!
تھرتھرائی، سر جھکا، آنکھوں میں آنسو آ گئے — پھول سے رُخ پر یکایک غم کے بادل چھا گئے۔
پھیر کر منہ آخرش بستی کی جانب چل پڑی — سوچتی ہو گی، میں کیا لائی تھی، کیا لے کر چلی
جاتے جاتے دے گئی مجھ کو محبت کا پیام — بھول سکتا ہوں بھلا میں کس طرح پنگھٹ کی شام

اب بھی یاد آتی ہے رہ رہ کر وہ رشکِ ماہتاب
جیسے بیوہ کو عروسی، جیسے بوڑھے کو شباب

نرگس

آج کی رات

اور ــــــ اور میں کیا کہوں ــــ یہی
کہ تم آج کی رات بھی ــــــ میرے پاس رہ جاؤ
دیکھو ساجن ۔ نمناک ہوائیں کیا کہہ رہی ہیں
دیکھو دیکھو موسم بدل رہا ہے
اور میں اکیلی ہوں
میرے پاس کوئی نہیں
سب کے سب چلے گئے ہیں
تم آئے ہو تو رہ کر جاؤ
اتنی جانے کی بھی کیا پڑی ہے
کیا یہی پریت کی ریت ہے؟
یہ بھی کیا پریم ہوا؟
ذرا سوچو تو۔
سچ جانئے۔ میں مرجاؤں گی اگر آج چلے گئے تم۔
آج کی رات
صرف آج کی رات
ساس یہاں نہیں ہے
نند سسرال چلی گئی ہے
خاوند بیگار پہ ہے
بھلا ۔ ساجن! تم ہی بتاؤ
ایسے مواقع زندگیوں میں کبھی بار بار بھی آیا کرتے ہیں؟
اس لئے مانو تو میری بات
رہ جاؤ میرے پاس ــــ میرے ساجن
تم سے کہتی ہوں ــــ رہ بھی جاؤ نا ــــــ ہاں
آج کی رات (ڈوگری سے)

بشارت فارانی

عید

(۱)

آپ کے خط کا انتظار رہا
آنکھ میں نقشۂ بہار رہا
عید آئی گذر گئی لیکن
دل بشارت کا بیقرار رہا

(۲)

عید کے دن خوشی نہیں ہے
رنج و غم میں ذرا کمی نہیں ہے
ایک میں ہوں اور عالم حسرت
زندگی گویا زندگی نہیں ہے

(۳)

زندگی عار ہوئی جاتی ہے
سر پہ اک بار ہوئی جاتی ہے
سانس لینا بھی اب تو ہے مشکل
معنیٰ دار ہوئی جاتی ہے

(۴)

جانتا ہوں کہ تم کو نفرت ہے
خواب میں بھی نظر نہ آؤ گے
عید کے دن کرو گے شکوے گلے
کیا انہیں بھول کر نہ آؤ گے

عشرت کاشمیری

تشنۂ تکمیل

مان لیتے ہیں کہ امیری غریبی میں "عرش والے" کا قصور نہیں عقل کی دولت سب میں تقسیم کر دی گئی۔ کسی نے اس خداداد حربے سے فائدہ اٹھایا کسی نے اسے استعمال نہ کرکے زنگ خوردہ بنا دیا۔ فائدہ اٹھانے والوں نے اس چابی سے دولت و عزت حکومت و شہرت کے قفل کھولے اور کاشانے کے سیاہ و سفید پر قابض ہوگئے۔ جو لوگ زمین جنبد نہ جنبد . . . . . بنے رہے اور ہمیشہ قسمت کو پیٹتے رہے ان کے مکانات جھونپڑیوں میں اور لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ اندھیری راتوں میں آہوں کے دھوئیں اور نالوں کی شورشیں غمناک فضا میں حشر برپا کرتی ہیں۔ دلوں کے ٹکڑے خون کے آنسو بنکر بہتے ہیں اور رہے لیکن قسام ازل اپنی جیب خالی کر چکے تھے۔ رحمت کی بارش برسی۔ نالوں، دریاؤں اور جھیلوں کا پانی بہہ کر سمندر میں شامل ہوگیا جہاں سے موتی بھی نکلتے ہیں اور جس کا پانی کھاری بھی ہوتا ہے۔

زمین کے کچھ بیٹے اس کی چھاتی پر بوجھ بھی ہیں اور کچھ پھول، ہمیشہ تر و تازہ اور مہکنے والے پھول۔

تاریخ نے کہا "انسان ابتدا میں اونچ نیچ، امیر غریب چھوٹے بڑے کے تصور سے خالی الذہن تھا۔ لیکن وقت نے اسے فطرت کی ہر چیز پر حکومت سکھا دی خود اپنے بھائیوں پر بھی حکمرانی کی جانے لگی۔

مذہب نے لوری دی "غریبی خدا کی رحمت ہے۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہے"

فلسفہ بولا "حقیقی خوشی کسان کے جھونپڑے میں ہے۔ بادشاہ کے محل میں نہیں"

حکومت نے منادی کرائی "بادشاہ خدا کا سایہ ہے خلیفہ پیغمبر کا جانشین ہے اور ساتھ ولیوں کی طاقت کا مالک ہے اس کی اطاعت فرض اور خدمت ایمان"۔ خواہ فلسفہ ہو یا مذہب تاریخ ہو یا حکومت ان سب کے انتخابی اعلانات (مینیفیسٹو) بجا۔ ان کی ہدایت کاری درست لیکن یہ کالے گورے بھدے اور موزوں خد و خال کا امتیاز کیوں ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ انگریزوں کا ملک سرد ہے۔ آب و ہوا خوشگوار ہے وہ سفید نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ کشمیر کی آب و ہوا برطانیہ جیسی ہے بلکہ بدرجہا رومان خیز ہے اور اس کے باشندے بھی گورے چٹے ہیں گو ان کے رخساروں کی سرخی پیٹ کی بیماری کے شکنجوں میں صرف ہو چکی ہے لیکن یو۔ پی، مدراس۔ بنگال وغیرہ صوبوں میں جہاں انسانی چہرے شب کی سیاہی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ایسے مردانہ حسن کے نمونے دیکھے گئے اور دیکھے جا رہے ہیں کہ قدرت کی شدید غلطی کا احساس ہوتا ہے کیا قسام ازل کی جیب یہاں بھی خالی ہو چکی ہے! یہ دولت سب میں برابر کیوں تقسیم نہ کی گئی؟ حامد کو آپ جانتے ہیں؟

کیا فرمایا۔ نہیں واللہ تعجب ہے کہ آپ سر ہلا رہے ہیں۔ جی جلاد۔ آپ کو بھول گیا ہے کیا؟ وہ جلاد۔ جو کبھی لکڑیاں ڈھوتا تھا۔

"واہ یاد کیسے رہتا! عوامی حافظہ اگر کمزور نہ ہوتا تو پبلک بہروپئے نئے نئے روپ بدل کر سٹیج پہ کیسے نمودار ہوتے۔

حامد کو جلاد کیوں کہتے ہیں؟ ہمارے قصبے میں کوئی سا ایسا نام ہے۔ جس کے ساتھ عرف کی دم نہ لگی ہو۔ اگر عرف اچھا ہو میرا مطلب ہے کہ طعنہ آمیز اور حقارت خیز نہ ہو تو خود نام والے کے سامنے اس کا استعمال کیا جاتا ہے ورنہ پیٹھ کے پیچھے مزے لے لے کر گردان کی جاتی ہے۔ یہ نام اور یہ عرف عام طور پر پہچان

کے لئے ہوتے ہیں کشمیریوں کی ذاتیں اور فرقے عرف اور پیشے کے مرکب سے بنی ہوتی ہیں جیسے گگڑ چوپا۔ واند بٹول وغیرہ۔ مرغوں اور چوہوں میں لطافت ہی کیا ہے۔ سوائے چڑکے۔ جلاد کو لیجئے۔ حامد غریب نے بچپن میں کسی بلی کو ہاتھ گھما کر ایسا ڈھیلا کھینچ مارا تھا کہ خاک پہ ڈھیر تھا۔ ایک کشتہ بے گور وکفن کو ڈرامہ فردماغ سب کچھ دیکھ رہا تھا ایسا نام رکھا کہ جب تک حامد کے ساتھ جلاد نہ کہا جائے۔ تب تک اُس کی شناخت شخصیت نہیں ہوسکتی اور یہ نہ حامد تک ہی محدود نہ رہیگا کیا عجب کہ مستقبل میں اُس کا خاندان جلاد نام کی ذات سے مشہور ہوجائے۔

"کیا کہا آپ نے حامد جلاد کے ہونے نہیں نہیں رہیں۔ وہ جبریہ مجرد رہنے پر مجبور رہے۔

جناب معاف کیجیے۔ خاندان اور رشتے کی برتری اور نسلی غرور افسانۂ ماضی اور پیر روایات پارینہ بن چکی ہیں۔ مذہبی لحاظ سے نہیں کہتا اگر اس نقطۂ نگاہ کو بھی سامنے رکھا جائے۔ تو بازی میرے ہاتھ رہے گی آپ کا مذہب مساوات کا حامی ہے لیکن شیخ سید کی تفریق روا رکھی گئی ہے عملی مساوات کب کی مفقود ہوچکی ہے۔ مذہبی اجازت کے باوجود جس اصول کو فرقہ بندی اور ذات پات کی تفریق نے کتابوں اور جلسوں کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ اُسے دولت کا طوفان کبھی اچھالتا ہے اور کبھی غرق کردیتا ہے آپ اپنے قصبے کے احد اقصاب کو چودھری احد اللہ گنائی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں یہ چودھری اور یہ گنائی کی اضافتیں اس کی روز افزوں دولت ہی کا نتیجہ ہیں ورنہ آپ اس کی ذات قبیلے سے واقف ہیں۔ اگر احد اقصاب غریب ہوتا تو اس کے پس پشت نہیں بلکہ خود اس کے سامنے ڈنکے کی چوٹ آپ اُسے احد اقصائی کہتے اور یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں حقارت کا دریا لہریں مار رہا ہوتا۔

میرے دوست عزت، شرافت، نسلی برتری، سماجی تفوق دولت کی دیوی کے ادنےٰ پجاری ہیں۔ امیر کے سب عیب گُن بن جاتے ہیں اور غریب کی نیکیاں بانس پر چڑھ جاتی ہیں۔

کیا خوب حامد جبریہ مجرد رہنے پر مجبور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی نسلی تعصب میں مبتلا ہیں۔ آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ اپنے بے تکلف دوست کے سامنے خاندانی ٹھیکیداروں کی مجلس میں آپ نظہار رائے نہیں کر رہے بلکہ اس شخص کے سامنے جو ہر شے کو انسانی عینک سے دیکھتا ہے اور انسانیت کی ترازو میں تولتا ہے۔

"آپ کی یہ دلیل بھی قابل قبول نہیں کہ خون اور دودھ کی صفائی سے نسلی خصوصیات قائم رہتی ہیں۔ دنیا ایسا ہی سوچتی ہے اور ایسا ہی کہتی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ گری پڑی نسلوں میں مخلوط شادیاں اعلیٰ جذبات پیدا کردیں۔ عرب کی جنگجوئی اور یہود کی خود اعتمادی اور تدبر کا اگر اشتراک ہوجائے اور دونوں کا مرکب دونوں کی خصوصیات کا حامل ہو تو وہ انسان جو جنگجو بھی ہو خود اعتماد اور مدبر بھی ہو کس قدر کامیاب انسان ہوگا۔ جنگجوئی سے میری مراد جہد اللبقا کے جذبے کی موجودگی ہے آپ جانتے تو ہیں کہ جب تک دنیا ایک بہترین معاشی نظام کی یک رنگی قبول نہیں کرتی جہد اللبقا کس درجہ ضروری ہے۔ جناب گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ گرم و سرد کے امتزاج سے اعتدال پیدا کیا جائے۔ انسان مختلف تہذیبی، نسلی اور مذہبی حلقوں میں منقسم نہ رہیں بلکہ انسان بن کر رہیں ان کی دنیا میں رنگ و روپ، قوم و مذہب، ملک و نسل کے امتیازات ختم ہوجائیں ایسی دنیا کی تخلیق کے لئے ابھی انسانیت کو سخت سے سخت خونریز اور عالمگیر لڑائیوں کا انتظار کرنا چاہیئے۔ عصر حاضر کی مادی ترقیوں کے باوصف صرف انسانیت کا ایک حصہ ان سے مستفید ہو رہا ہے ہر قوم اور ہر ملک کے چرواہے اپنی اپنی بھیڑوں کے گلّے کو ہانک رہے ہیں ماتم کرنے کا مقام ہے کہ حامد پڑھا لکھا ہے۔ ٹھیکیدار سے مالی حیثیت سے ہم دونوں سے بلند ہے لیکن آپ اس لئے اُسے جبریہ مجرد رہنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ کسی گمنام خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کہکر آپ اپنے جذبہ حقارت کی تسکین کرتے ہیں کرماں سیتی بلپ لدنگ بچہ دیکھو رنگ برنگ۔

"جناب حامد کی اصول پرستی اور صادق محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ خورشید کے لئے زاہدانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ دل کا سودا ہے خریدار ہر قیمت پر اپنی پسندیدہ چیز خریدنا چاہتا ہے حامد خطِ نفس اور ذوقِ نظر کا سامان خریدنا نہیں چاہتا وہ آرٹ کے صحیح دلدادہ کی طرح مصور کا شاہکار خریدنا چاہتا ہے ورنہ تصاویر کی بازار میں کمی نہیں سو وہ اگر چاہتا

تو ایک "خورشید" تو کیا سینکڑوں ماہ پارے اس کے آسمان کا طواف کرتے نظر آتے۔ دولت ہر طلسم کی لوح ہے جس علی بابا کے پاس یہ "سم سم" موجود ہو وہ ہر دروازہ کھول سکتا ہے۔

کل ہی چوگان میں ملا تھا۔ لوگ کشتواڑ کی اس جنت بدوش سیرگاہ کے مخملی سبزے پر لطفِ خرام حاصل کر رہے تھے۔ اور ہم دونوں بیٹھے چنار تلے رنگین شفق کے گل پوش آسمان پر تیرتے ہوئے کبوتروں کے جھنڈ سے غافل کتابِ زندگی کے پڑھے ہوئے باب دہرا رہے تھے۔ حامد نے مجھے اپنی داستانِ حیات، افسانہ معاشقہ اور جہد للبقا کا قصہ سنایا۔ اس نے "بوت، ناگ" آبشار کے بلندی سے گرتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ پوچھتے ہیں کہ "خورشید" میرے خوابوں کی ملکہ کیوں بن گئی ہے۔ سمندر پیچھے اور بھی دیکھے جاتے ہیں۔ جناب! میرے ربابِ ہستی میں صرف ایک ہی تار ہے اور اُسے چھیڑنے سے صرف ایک ہی نغمہ پھوٹتا ہے۔ صرف ایک نام ہے جو زبان پر ہے اور جس کے لیتے ہی خود میرے ہونٹ اُسے چوم لیتے ہیں۔ "خورشید" کی قدر و قیمت میں ہی جانتا ہوں۔ ناک نقشے کی بھی بُری نہیں لیکن مجھے جس چیز نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا غلام بنا دیا ہے وہ اس کی وہ گہری دلچسپی ہے جو اسے میری ذات سے ہے۔ اس دلچسپی کو خواہ آپ ہمدردی سمجھ لیجئے یا محبت۔ حقیقت یہ ہے کہ میری موجودہ فارغ البالی اس کی نظرِ کرم کا نتیجہ ہے۔ مقدر نے نعمتیں تو بنائی لیکن خود اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ میری کائنات یوں تو ہر طرح سے مکمل ہے صرف کسی کو اپنے دھڑکتے دل کے قریب دیکھنا چاہتا ہوں اتنا قریب کہ دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں ایک مشترکہ لطیف ترنم پیدا کریں۔ ان آنکھوں میں وہ کیفیتِ تبسم دیکھنا چاہتا ہوں۔ جن کی گردش نے بارہا میری قسمت کے کامیاب پانسے پھینکے اور خزاں رسیدہ درخت کو رونقِ چمن بنا دیا۔ والدین نہ دیکھے نہ یاد ہیں۔ ایک رشتے کے ماموں تھے۔ ممانی کی شفقت کا کیا کہنا۔ برف پڑ رہی ہوتی یا شمالی ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے ہوتے وہ حسبِ معمول مجھے زبردستی اس دریدہ کمبل سے اٹھا دیتیں جو اپنی گرمی کو زائل کر چکا تھا۔ اون کے ریشے کب کے علیحدہ ہو چکے تھے۔ کمبل تو نہیں ٹاٹ کے ٹکڑے سے مفہوم کچھ واضح ہو سکتا ہے۔ اگر کانگڑی نزدیک ہوتی تو یقیناً پوہ ماگھ کی روح میں اتر جانے والی سردی نے میرا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ علی الصبح آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھتا ورنہ لاتیں مار کر اٹھا دیا جاتا اور گالیوں کی بوچھاڑ اس وقت تک جاری رہتی جب تک چائے کے چند پیالے باسی روٹیوں کے ساتھ میرے حلق سے نہ اُتر جاتے۔ ماموں عام طور خاموش رہتے۔ وہ مجھے پٹتے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ دخل در معقولات ان کی عادت نہ تھی۔ جس دن ممانی کا پارا معمول سے زیادہ چڑھ گیا ہوتا اور ماموں میری پڑی پسلی ایک ہونے کا گمان کرنے لگتے تو تمباکو کا دھواں کچھ چھوڑ دیتے کچھ نگل جاتے اور اُٹھ کے مجھ پر برسنا شروع کر دیتے گو وہ ممانی کے برعکس گرجتے زیادہ تھے اور برستے کم تھے۔ صبح سے شام تک جنگلوں میں ڈنگروں کے پیچھے مارا مارا پھرتا یا لکڑیاں جمع کرتا رہتا۔ شام کو جب آتا تو ممانی کا سوجھا ہوا چہرہ دیکھ کر بھوک جاتی رہتی اور آنکھ بچا کر گلی میں نکل جاتا۔ بچہ ہی تو تھا۔ آٹھ دس سال کی عمر ہو گی۔ دوسرے بچے مجھ سے کتراتے۔ میرا مضحکہ اڑاتے۔ مجھے جلاد جلاد کہہ کر منہ چڑھاتے۔ اگر کوئی بھاگوان مٹھائی یا حلوہ لے آتا تو انہیں بہت ہی الم ہوا ہے کہ مجھے بھی پوچھا گیا ہو۔ لیکن میں کہتا کہ ان کی نفرت، تعصب اور بدسلوکی کو نظر انداز کر دینا کبھی کبھی ہاتھ بھی اُٹھ جاتا۔ اور دو ایک میرے ہاتھ سے خوب دھُن دیئے جاتے۔ لیکن گھر آ کر لاتوں، گھونسوں کی بوچھاڑ سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ رہیں گالیاں وہ تو ٹیپ کا بند تھیں۔ مویشیوں کے گڑے مردے اکھیڑ کر رکھ دیئے جاتے شکایت کرنے والے موقع ملنے پر مجھے پیٹتے بھی تھے اور ممانی کے کان علیحدہ بھرتے تھے۔ "خورشید" کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ بھی گلی کے کھیل میں شامل ہوتی تھی لیکن اُسے مجھ سے نفرت نہ تھی۔ نہ ڈر تھا۔ جب کوئی چیز گھر سے لاتی میرا حصہ مخصوص رہتا۔ جب کبھی لڑائی کا محاذ قائم ہوا۔ اس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ میری صفائی پیش کی اور شکایت کرنے والوں کا منہ بند کر دیا۔ ممانی ایسی مشفق سرپرست سے کسی مٹھائی یا حلوا پوری کی اُمید کیسے ہو سکتی تھی ہاں گھر میں جب کوئی اچھی سی چیز پکتی تو مجھے بھی تھوڑی سی مل جاتی۔ ایسا شاذ ہی ہوا ہے کہ میں نے بہتر سے بہتر تحفہ ملنے پر اس کا حقدار خورشید کو نہ بنایا ہو۔

جب ہم دوسرے لڑکوں کی آنکھ بچا کر سیب کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر چپکے چپکے کچھ کھا رہے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کائنات کی تمام مسرتیں اس سیب کے درخت تلے جمع ہوگئی ہیں۔ کبھی کبھی جب خورشید میری مظلومیت پر افسوس کرتی اور مجھے مشورہ دیتی کہ میں اپنے والد کے پاس چلا جاؤں تو جی چاہتا کہ اس کی ننھی سی گود میں سر رکھ کر اتنا روؤں جتنا اپنی ماں کے مرنے پر شاید بھی نہ رویا تھا۔

چار سال تک یہی ہیل و نہار رہے۔ گلی کی رونق قائم رہی اور بچوں کی ٹولیاں شام سے لے کر رات گئے تک ہنگامے برپا کرتی رہیں۔ چوتھے سال ان ٹولیوں میں نئے نئے ممبر شامل ہوئے اور پرانے ممبروں میں سے اکثر نکالے گئے جنہیں زبردستی شرکت سے روکا گیا ان میں خورشید اور میں بھی شامل تھے۔ وہ تو اس لئے کہ اس کے مطلعِ حیات پر نسائیت کا ابر چھانے لگا تھا اور مجھے حکمِ امتناعی اس لئے ہوا کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے فرائض میں اضافہ کر دیا گیا۔ شام کو جب تھکا ماندہ گھر آتا تو حکم تھا کہ بھائی کے ننھے میاں کو کھلاؤں۔ صحن سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ کہیں ننھے کو کسی ڈائن کی نظر نہ لگ جائے۔ ساتھ ہی تاکید تھی کہ خبردار جو بچہ رونے پائے۔ بچے کا بلکنا میرے فرض کی غفلت کا نتیجہ تھا اور اس صورت میں بھائی فوراً فردِ جرم عائد کر دیتیں۔ اس فرد میں اگلے پچھلے، چھوٹے بڑے سبھی قسم کے جرائم شامل ہوتے۔ پانی کوئی کہاں تک روک سکے گا۔ ایک راستہ بند ہوا تو دوسرا پیدا کر لیگا۔ خورشید سے گاہے گاہے ملاقات ہو ہی جاتی۔ باہمی ہمدردیوں کا سلسلہ جاری تھا۔

خورشید نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا اور میں سولہ برس کا ہو چکا تھا کہ محلے کے کسی گھر میں شادی ہوئی۔ محلے کی تمام آبادی اس گھر میں جمع ہوگئی تھی۔ اس رات میری ڈیوٹی یہ تھی کہ اپنے خالی گھر کا پہرہ دوں۔ رات آدھی کے قریب ڈھل چکی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوتے جاگتے کی حالت تھی۔ دروازے کی دھڑدھڑ نے مجھے مجبور کیا کہ اٹھ کر دیکھوں۔ کنڈی کھول کر جو دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ حیران تھا کہ کیا ہوا۔ دروازہ بند کیا ہی چاہتا تھا کہ آواز آئی "ٹھہرو"۔ ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ دوسرے لمحے خورشید مکان میں تھی۔ پہلا سوال یہ تھا۔ گھر والے کب لوٹیں گے"۔ "صبح دس بجے" میں نے خوشی میں جھومتے جھومتے کہا۔ وہ میرے کمرے میں اسی پھٹے ہوئے کمبل پر آ کر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ دفعتاً مجھے بھیک مانگتے مانگتے بادشاہی ہی مل گئی۔ مجھے تصورات نے ایسی رنگین دنیا دکھائی جہاں دکھ درد، فکر و آلام خواب و خیال ہی جانے ہیں۔ خورشید اب بچی نہ تھی۔ آغازِ شباب نے اس کی رگ رگ میں بجلی بھر دی تھی۔ اس بجلی کا برقی اثر خود دیکھنے والے پر بھی ہوتا تھا۔ وہ لمبے لمبے سیاہ بال آبشار کی طرح اس کی نورانی پیشانی پر لہرا رہے تھے وہ آنکھیں۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے اندھیرے میں دو تارے چمک رہے ہوں۔ وہ مرمریں ساغر کیف و سرور برسا رہے تھے۔ زعفرانی چہرے پر موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ گویا گلاب کے بوٹے سے پھول پر شبنم نے آبدار نگینے جڑ دیئے تھے۔ سیاہ فراک کی چوڑی آستین سے داہنا ہاتھ اس لکیر کی طرح تھا جو شبِ تاریک میں کسی نورانی ستارے کے ٹوٹنے سے پیدا ہو جاتی ہے وہ گستاخ ہاتھ ان سیاہ ریشمی لہروں سے کھیل رہا تھا جو نوری جبین کے نقرئی سمندر میں پیدا ہو رہی تھیں میری تبسم ریز نگاہیں گردن کے خم کا پورے طور پر طواف بھی کرنے نہ پائی تھیں کہ خورشید نے لبِ احمریں سے پھول برساتے ہوئے کہا "میں اس وقت اس لئے نہیں آئی کہ تم مجھے خوب خوب گھورو"۔ "تم"! سچ جانیئے عزو بھیا۔ اس "تم" میں کتنی شیرینی تھی میں نے محسوس کیا کہ خورشید نے مجھے "تم" کہہ کر شہد کے دریا میں دھکیل دیا۔ یہ لفظ میرے لئے کوئی نیا نہ تھا۔ غالباً لغت میں صرف یہی لفظ رہ گیا تھا جس سے ہر چھوٹا بڑا مجھے مخاطب کیا کرتا تھا لیکن ان لوگوں کا "تم" زہر میں بجھا ہوا نشتر ہوتا تھا۔ جو جسم کے ساتھ روح کو بھی چھید ڈالتا تھا۔ "دیکھو" خورشید نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم ان تیز نگاہوں سے مجھے گھورو گے تو میں بھاگ جاؤں گی"۔ لیکن ساتھ ہی اس کی برق ریز مسکراہٹ نے مجھے اپنی خاموش زبان میں کہا "یہ محض کہنے کی بات ہے"۔

(باقی، باقی)

دولت رام گپت

رُوپی

کچھ دنوں سے میری صحت خراب رہتی تھی۔ ایک روز میں نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ کوئی خاص بات نہیں لیکن بہتر ہے۔ کہ تم مہینے دو مہینے کے لئے پہاڑی مقام پر چلے جاؤ۔ مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ اچھا ہے ستمبر تک پہاڑی مقام پر چل کر رہنا چاہیئے۔

مجھے دو چیزوں سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ گانا سننے اور افسانے پڑھنے سے۔ چنانچہ اپنے ساتھ تفریح کے لئے ڈلہوزی جو چیزیں لے گیا۔ ان میں گراموفون ریکارڈ اور افسانوں کے مجموعے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

پہاڑی مقام بھی کتنا دلفریب ہوتا ہے۔ نیلے نیلے آسمان میں سفید بادل اڑ رہے ہیں۔ انہی سے ملے ہوئے پہاڑوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ سڑک دیکھیئے تو کہیں چڑھتی ہوئی جوانی کی طرح سیدھی اور شرمیلی دوشیزہ کی طرح سمٹ کر رہ گئی ہے دن کو سورج کی کرنیں بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہیں اور رات کو تارے۔

میں نے ایک چھوٹا سا بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اسی میں رہتا تھا۔ بنگلے کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں انواع و اقسام کے پھولوں کے پودے اور چند درخت پھلوں کے بھی تھے میرے بنگلے کے کچھ فاصلے پر ایک اور بنگلہ تھا جو امرتسر کے ایک سیٹھ لالہ سندرداس کا تھا وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس میں رہتے تھے۔ وہ نہایت ہی ملنسار اور نیک دل آدمی تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا۔

مجھے کھانا پکانے کے لئے ایک ملازم کی ضرورت تھی میں نے ان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا، تیرہ چودہ سال کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے بیچاری بہت غریب ہے۔ شاید اسی وجہ سے ابھی تک اس کی شادی بھی نہیں ہو سکی۔ ہمارے ہاں اکثر آتی ہے کام کاج کر دیتی ہے کچھ کھانے کو دیدیا جاتا ہے۔ کہیئے تو اس سے کہہ دیا جائے۔ آپ کا کھانا پکا دیا کرے گی"

میں نے کہا، ضرور کہہ دیجئے۔ اگر مجھ سے ایک غریب کا بھلا ہو جائے تو برا کیا ہے۔ ملازم کی ضرورت تھی۔ وہی سہی"

لالہ سندرداس بولے "اسی لئے تو میں نے کہا تھا"

"تو وہ کب آجائے گی"

"آج ہی بلوا لیجیئے"

"بہتر"

نوکرانی آگئی اس کا نام تھا روپی واقعی بہت نیک اور خدمت گذار لڑکی تھی۔ میں کبھی گراموفون بجاتا کبھی افسانے پڑھتا۔ پہاڑوں پہ یہی تو ہوتا ہے۔ سیر کھانا پینا اور وقت گذارنے کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلہ ضرور چاہیئے۔ میری عادت میں گانا اور پڑھنا شامل ہی تھا اس لئے وقت اچھا گذر جاتا تھا۔ روپی کو بھی گانے کا شوق تھا اور کہانیوں سے بھی رغبت۔ یہ بات میں نے خاص طور پہ دیکھی کہ ہر پہاڑی و پہاڑن خواہ کتنے غریب کیوں نہ ہو۔ منوں بوجھ اٹھاتے کیوں نہ ہو خوش خوش نظر آتے ہیں تشویش کے آثار کبھی کسی پہاڑی کے چہرہ پہ میں نے نہیں دیکھے فطرتاً گانا اور ناچنا ہر پہاڑی باشندے کا مشغلہ ہے روپی میں بھی یہی بات تھی۔ اپنے وہ کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد اکثر میرے بنگلے پہ ہی رہتی افسانہ کا لطف کچھ چپکے چپکے مطالعہ کرنے میں ہی آتا ہے۔ مگر روپی کے خیال سے کھلی آواز سے پڑھتا تاکہ وہ بھی سن لے۔

کوئی مشغلہ کتنا ہی دلچسپ ہو۔ پھر بھی کبھی کبھی طبیعت اکتا جاتی

ہے۔ بعض اوقات۔ ایسا ہو جاتا کہ گراموفون بجانے میں جی نہ لگتا اور نہ پڑھنے میں دل لگتا۔ اسی طرح ایک روز نہ مطالعہ اور گانے بجانے میں بھی دل نہ لگا۔ میں نے روپی کو آواز دی۔ میں کمرے میں اپنے پلنگ پر لیٹا تھا اور روپی کمرے کے باہر دروازے پر بیٹھی تھی میرے پکارنے پر بولی۔

"آئی جی بابوجی" اور آ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا "کیا کر رہی تھی"

"کچھ نہیں بابوجی یونہی بیٹھی تھی"

"تمہارے ماں باپ کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا، مگر تمہیں کچھ ان کی یاد ہے"

"اچھی طرح تو یاد نہیں بابوجی، پھر بھی بہت باتیں کچھ یاد ضرور ہے۔ باپو مجھے بہت چاہتا تھا۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو گھر آتا تو مجھے گود میں لے کر بہت پیار کرتا"

معلوم نہیں اب سوچ کر روپی نے مجھ سے سوال کیا "بابوجی ایک بات پوچھوں"

"ہاں ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو"

"اور کچھ نہیں بابوجی۔ یہی کہ آپ کے گھر کون کون ہے"

"بڑے بھائی ہیں۔ بہن ہے۔ ماں جی ہیں"

اسی طرح جب کبھی میرا دل گھبراتا۔ میں روپی کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اور اسی طرح کی باتوں سے دل بہلاتا۔ روپی کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ اسے میرے گھر والوں سے خاص دلچسپی ہو گئی ہے اس نے میرے گھر کے ایک ایک آدمی سے اپنا رشتہ بھی قائم کر لیا تھا۔ بات چیت کرتے وقت جب کبھی بیچ میں ذکر آجاتا تو کسی کو ماں کسی کو دیدی کسی کو دادا کہہ کر یاد کرتی وہ رفتہ رفتہ جیسے میرے خاندان کا جزو سی بن گئی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ پھوار پڑ رہی تھی دل کا عجیب حال ہو رہا تھا۔ دماغ میں ایک الجھن سی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی چیز کی ضرورت ہو۔ اور ٹھیک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چاہیئے۔ یا یہ کہ ضرورت کیسے پوری ہو۔ نہ جانے میں نے کیا سوچ کر آواز دی ——— روپی۔

"جی بابوجی"

وہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تم دن بھر بیکار بیٹھی رہتی ہو"

"پھر کیا کروں"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کچھ پڑھا دوں، پڑھو گی؟"

"پڑھائیں گے تو کیوں نہیں پڑھوں گی"

اس روز سے میں نے روپی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اب گراموفون بجانے یا کہانیاں پڑھنے سے زیادہ میرا وقت روپی کے پڑھانے میں ہی صرف ہوتا۔ روپی تھی تو پہاڑی لڑکی۔ مگر اسے بھی اب باجہ اور قصے سے زیادہ لطف پڑھنے میں آتا۔ اس نے بہت جلد حروف پہچان لئے اور بہت چھوٹے چھوٹے جملے پڑھنے لگی۔

ایک روز میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ روپی کا دستور تھا کہ کمرے کے باہر کھڑی رہتی اور جب تک میں آواز نہ دیتا وہ اندر نہ آتی۔ اس روز بھی وہ کتاب لئے باہر بیٹھی تھی۔ مگر درد سر کی وجہ سے میرا دل پڑھانے کو نہیں چاہتا تھا۔

اس لئے میں نے معمول کے مطابق روپی کو آواز نہیں دی۔ تو کچھ دیر انتظار کر کے ہاتھ میں کتاب لئے خود آئی میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اس نے سمجھا میں سو رہا ہوں۔ اس لئے وہ لوٹی میں نے کہا "روپی"

"بابوجی ——— میں نے سمجھا آپ سو رہے ہیں"

"سو نہیں رہا ہوں روپی! نہ جانے سر میں کیوں درد ہے"

روپی آ کر میرے سرہانے کھڑی ہو گئی "تو میں سر دبا دوں بابوجی"

وہ نہ معلوم کیسے میرے دل کا حال جان گئی۔

"اچھا تو ہو گا ذرا دبا دو" میں نے کہا

روپی میرا سر دبانے لگی۔ تھوڑی دیر میں درد سر دور ہو گیا۔ روپی کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا کہ پردیس میں رہ کر بھی گویا میں دیس میں نہیں ہوں۔ گھر پر سر میں درد ہوتا تھا کبھی کبھی ماتا جی سر دبا دیا کرتیں کبھی بہن

ان کے سر دبانے سے مجھے بہت راحت ملتی تھی۔ لیکن روپی کے سر دبانے میں راحت کے ساتھ ایک لذت بھی محسوس ہوتی تھی نہ جانے کیوں؟

ایک روز میں نے کہا: "روپی مجھے تمہاری وجہ سے بہت آرام ملتا ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ بابوجی! آپ کی وجہ سے جو میں سکھ بھوگ رہی ہوں۔ وہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"نہیں نہیں روپی تمہاری وجہ سے مجھے جو آرام مل رہا ہے وہ گھر پر بھی نہیں مل سکتا۔"

روپی بشاش ہو کر بولی "میں تو اس سے بھی زیادہ آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں مگر ——"

اتنا کہہ کر روپی رک گئی۔

"میں نے پوچھا "مگر کیا؟"

"آپ مجھ سے کوئی کام ہی نہیں لیتے۔"

"تم سب کام کر دیتی ہو۔ اس سے زیادہ اور کام ہی کون سا ہے؟"

روپی پھر کچھ نہیں بولی۔

اب تک تو روپی کھانا پکا کر الگ ہو جاتی تھی میں اپنے ہاتھ سے نکال کر کھاتا تھا۔ مگر آج روپی کھانا پکا کر جانے لگی۔ تو میں نے کہا روپی ذرا کھانا نکال بھی دو۔

ایسا معلوم ہوا کہ روپی کو میرے اس کہنے سے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڑے شوق سے کھانا نکال کر سامنے رکھا اور پھر اٹھ کر باہر جانے لگی۔

میں نے کہا "روپی جاتی کیوں ہو کسی چیز کی اور ضرورت ہوگی تو کون دے گا۔"

روپی بیٹھ گئی اس روز مجھے جو کھانا کھانے میں لطف آیا وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

میں نے کہا: "تم مہینے بھر سے کھانا پکا رہی ہو روپی لیکن آج کا کھانا جیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے ویسا کبھی معلوم نہیں ہوا تھا۔"

"روز ہی اسی طرح پکاتی ہوں بابوجی۔"

"پھر آج کیا بات ہے؟"

"میں کیا جانوں۔"

"آج یہی ایک بات نئی ہوئی ہے کہ پکایا بھی تم نے اور کھلا بھی رہی ہو تم۔"

"آپ تو بابوجی ——" روپی صرف اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

اسی طرح روز روپی کھانا نکال کر میرے سامنے رکھتی جب تک میں کھانا نہ کھا لیتا وہ میرے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ مجھے آرام پہنچانے کی کوشش کرتی۔ پہلے میں خود اپنا بستر کیا کرتا تھا۔ اب روپی بچھاتی۔ بستر اُلٹ پلٹ ہو جاتا۔ اوپر کی چادر سکڑ جاتی تو روپی ہی اسے ٹھیک کرتی۔

نہانے کے وقت تیل۔ صابن اور دھوتی غسل خانے میں رکھ دیتی۔ میری تمام کتابیں میز پر سجا کر رکھتی۔ میرے میلے کپڑے دھوبی کو دیتی اور دھلے ہوئے کپڑے اس سے وصول کرتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روپی محض کھانا پکانے والی ملازمہ نہیں بلکہ میرے تمام کاموں کی منتظم ہے۔

میں بھی روپی کو صرف کھانا پکانے والی نوکرانی نہیں سمجھتا تھا اپنا اکثر انتظام اس کے سپرد کر دیا تھا۔ پہلے وہ پہاڑی وضع میں رہتی تھی۔ مگر اب اس کے لئے کپڑے بنوا دیئے تھے اس کا رنگ گورا تو تھا ہی۔ اس نے اچھے کپڑے پہن کر وہ ایک شہری اور مہذب دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ رنگ روپ اور وضع قطع ہی میں نہیں بلکہ دو اڑھائی مہینے میرے ساتھ رہ کر اور تھوڑا پڑھ لکھ کر وہ تہذیب اور شائستگی کے اعتبار سے بھی ایک پہاڑی لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ کافی سلیقہ مند اور تمیز دار ہو گئی تھی۔

مجھے ڈلہوزی آئے ہوئے پانچ مہینے کے قریب ہو چکے تھے۔ میری صحت میں بھی کوئی نقص باقی نہیں تھا۔ بھائی صاحب نے خط لکھا موسم کافی ٹھنڈا ہو چکا ہے اور اب تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ جلد پہنچ آؤ۔

مجھ کو روپی اور روپی کو مجھ سے ایک خاص اُنس ہو گیا تھا۔

اس لئے اسے چھوڑنا مجھے بہت شاق معلوم ہوتا تھا۔ مگر اسے ساتھ لے جانے میں بھی دشواریاں تھیں۔

کنواری لڑکی لوگ نہ جانے کیا کیا خیال کرتے۔ گھر والے بھی اس کو پسند نہیں کر سکتے تھے۔ آخر روپی بھی دوشیزگی کی حالت میں کب تک رہ سکتی تھی۔ اگر سماجی بندشیں نہ ہوتیں تو وہ اس لائق تھی۔ کہ میں خود اس سے شادی کر لیتا۔ اور وہ ایک اچھی شریک زندگی بن سکتی تھی۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھ کر مجھے کہنا پڑا کہ روپی کو ساتھ لے جانا مناسب نہ ہوگا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے سگریٹ پیتے ہوئے کہا۔ گھر سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے روپی۔

روپی نے بڑی خوشی سے پوچھا "کیا لکھا ہے بابوجی۔ اماں جی اور دیدی اچھی طرح ہیں؟"

"ہاں سب لوگ بخیریت ہیں لیکن ————" میری زبان سے یہ نہ نکل سکا کہ مجھے بلایا ہے "میں اب جاؤں گا۔"

"لیکن، کہاں بابوجی؟"

"مجھے گھر جانا ہوگا۔ بھائی صاحب نے لکھا ہے ماں دیکھنے کے لئے بہت بے چین ہے چلے آؤ۔"

"تو کب جائیں گے؟"

"پرسوں"

تھوڑی دیر چپ رہ کر روپی نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ پھر بالو تما اور کچھ شرماتی ہوئی بولی "مجھے بھی ساتھ لے چلیں گے بابوجی؟"

میں سمجھتا تھا کہ روپی کو میرے جانے کا افسوس ہوگا۔ مگر یہ خیال نہیں تھا کہ روپی اس طرح زبان کھول کر کہے گی۔ میں سخت مشکل میں پڑ گیا۔ میں اس بھولی بھالی پہاڑی لڑکی کو کیا جواب دوں؟ لیکن میں نے غور و فکر کے بعد جو فیصلہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ اور کہہ ہی کیا سکتا تھا۔

میں نے کہا "تم اپنا دیس چھوڑ میرے ساتھ چل کر کیا کرو گی؟"

روپی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "دیس میں میرا ہے کون بابوجی؟ نہ ماں۔ نہ باپ۔ نہ بھائی ————"

اس "نہ" کے بعد معلوم نہیں روپی کیا کہنا چاہتی تھی۔ کہ کہتے کہتے رک گئی۔

میرا دل بے چین ہو گیا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "جس طرح یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح وہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ تمہارا وطن تو ہے۔ شہر کے لوگ بہت برے ہوتے ہیں"

"مجھے شہر والوں سے کیا مطلب۔ میں تو آپ کے ساتھ چلوں گی بابوجی۔ جس طرح یہاں کام کاج کرتی رہتی ہوں۔ اسی طرح وہاں بھی کروں گی۔ آپ تو بہت اچھے آدمی ہیں"

"تم دنیا کی حالت سے واقف نہیں ہو۔ تم جوان ہو۔ کنواری ہو۔ لوگ ہمیں نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ اور میرے گھر والے بھی اس کو اچھا نہ سمجھیں گے"

روپی جیسے پتھر کے نیچے دبی ہوئی بولی "تو آپ گھر نہیں لے چلیں گے؟"

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں چھوڑ کر جاؤں۔ مگر اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن تمہیں تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ لالہ سندر داس کی معرفت ہر مہینہ پانچ روپے بھیج دیا کروں گا"

"نہیں بابوجی روپے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے"

"کیوں؟"

روپی کچھ نہیں بولی۔

میں گھر چلا آیا۔ مہینہ پورا ہونے پر لالہ سندر داس کی معرفت روپی کے نام پانچ روپے کا منی آرڈر بھیجا۔ جسے لالہ سندر داس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ جس روز تم واپس گئے اس کے تیسرے روز بعد سہ پہر کو روپی ایک غار میں ڈوبی ہوئی پائی گئی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ پولیس کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ اسے اتفاقی طور پر حادثہ پیش آ گیا۔ یا اس نے قصداً غار میں چھلانگ لگا دی۔

پولیس کو پتہ چلا ہو یا نہ۔ مگر میں خوب سمجھتا ہوں کہ وہ غار میں کیوں گری۔ اسی لئے تو اس نے کہا تھا۔ کہ روپے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ +

موہن یاور

بابو ایک پیسہ

"بابو ایک پیسہ"
"صبح سے بھوکا ہوں بابو"
"تمہارا بھلا ہو بابو"

——— میں ایسی کانپتی ہوئی آوازیں سن سن کر کچھ بے رحم سا ہو گیا ہوں۔ مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں نہ جانے کیوں ؟ ——— یہ لوگ لنگڑے نہیں۔ نحیف و نزار نہیں، پھر یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا انہیں بھیک مانگ کر کھانے میں کوئی خاص لطف آتا ہے۔ شاید ——— کوئی خاص سرور ——— ہاں، لیکن یہ بے کار رہنا چاہتے ہیں۔ آہ! اب میں سمجھا۔ یہ لوگ کام سے جی چراتے ہیں۔ جاہل جو ہوئے ———

شام کو روزانہ میرا گذر راج تلک روڈ پر سے ہوتا ہے۔ اور یہی آوازیں ——— "بابو ایک پیسہ" "تمہارا بھلا ہو بابو" "صبح سے بھوکا ہوں بابو" اور مجبوراً مجھے ان نوجوان بھک منگوں سے منہ چھپا کر جانا پڑتا ہے کیونکہ میں نے کبھی انہیں پیسہ نہیں دیا۔ اور نہ دینا چاہتا ہوں ———

نوجوان بھک منگوں کے دھندے ہوئے گلوں سے نکلی ہوئی شکستہ، پامال اور لرزتی ہوئی صدائیں۔ اور پھر چار چار گز کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے بھکاری ——— اور تب میں سوچتا ہوں ———

"اس سڑک پر سب نوجوان بھک منگے کیوں بیٹھے ہیں ایک ہی عمر کے، سب کا ایک ہی لہجہ، سبھوں کے دانتوں پر زردی، آنکھوں میں چیپڑ۔ بڑے بڑے لانبے اور خشک بال۔ اور پھر ہر ایک راہ گیر کے آگے ہاتھ پھیلا کر "بابو ایک پیسہ" کا راگ الاپنا۔ ایسا راگ جس کے تصور سے ہی میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کریہہ المنظر ———

ایک شام کا ذکر ہے کہ اس سڑک پر میں نے پہلی بار ایک نوجوان بھکارن کو بیٹھے پایا۔ جو ہر ایک راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہتی تھی "بابو تیرا بچہ جیوے" "بابو تیرا اقبال بنا رہے" اور ——— اور پھر...

اس شام کے بعد وہاں سے سب نوجوان بھک منگے آہستہ آہستہ اٹھ گئے۔ شاید انہیں صبح سے شام تک "بابو ایک پیسہ" کا گیت گاتے گاتے اپنا بھوکا پیٹ یاد آتا ہو ——— انہیں اب کچھ بھی ہاتھ نہ آتا۔ تبھی تو وہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔ شاید بھوکے اور دکھتے پیٹ کی آگ ——— بجھانے ———

اب میں روزانہ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے پاس اس نوجوان بھک منگی چھوکری کو دیکھا کرتا۔ جس نے ان تمام بھک منگوں کی روزی مار لی تھی۔ جو اس سڑک کے دونوں طرف بیٹھ کر "بابو ایک پیسہ" "صبح سے بھوکا ہوں بابو" کا گیت گایا کرتے۔ مگر وہ گیت، جو ہر ایک رہگذر کے کانوں میں گھونسا کرتے تھے۔

اب میں نے بھی اسے روزانہ پیسہ دینا شروع کر دیا جب میں آتا۔ وہ زیر لب مسکرا کر "بابو ایک پیسہ" کا محبت بھرا گیت میری طرف پھینک دیتی ——— "تمہارا بھلا ہو بابو ——— تمہارا بچہ جیوے بابو" ———

بعض آدمی اسے آتے جاتے گھورتے اور ایک ایک پیسہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر چھوڑ دیتے۔ اور بعض تو فقط گھورتے ——— فقط گھورنا ہی ان تک محدود تھا ———

اسے اب کافی آمدنی ہو رہی تھی۔ اب اس نے میلی اور پھٹی ہوئی ٹخنوں سے اونچی گلی سڑی شلوار کو اتار دیا تھا۔ اور چیتھڑے نما پھٹی ہوئی قمیض کو بھی ——— اس نے نئی شلوار اور قمیض پہن لی۔ سر کے بال بھی گوندھ لئے۔ دوپٹہ بھی نیا اوڑھ لیا۔ دو تین دن نظر نہ آئی۔ سڑک سنسان رہی۔ میں اداس رہا۔ میرے کان وہ

آواز سننے کو ترسنے لگے "بابو تیرا بھلا ہو" جس آواز میں میرے لئے جینے کی دعا تھی۔ جو مجھے زندگی بخشتی تھی۔ ایک پیسہ کے عوض

——— زندگی ——— اور ایک پیسہ ———"

خدا جانے وہ کہاں چلی گئی۔ جب لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہوگیا۔ تو ایک دن اسی سڑک کے کنارے، اسی کھمبے کے پاس آبیٹھی ———

ایک شام کو جب میں سڑک پر سے گذر رہا تھا تو اسے میں نے ایک مرد کے پیچھے پیچھے جاتے دیکھا . . . . پیڈ گراؤنڈ کے متعلق سڑک پر ایک کار کھڑی تھی۔ جس پر ایک نوجوان بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ مرد اور بھک منگی چھوکری کار میں بیٹھ گئے ———

اور کار چل دی ———

اب میں نے اُسے کبھی اس سڑک پر بیٹھے نہیں پایا۔ اب پھر وہی نوجوان بھک منگے کہیں سے آدھمکے ہیں۔ اب پھر مجھے بھکاریوں سے چڑ سی ہوگئی ہے۔ اور اب میرا روز کا ایک پیسہ بچ جاتا ہے "بابو ایک پیسہ" "تمہارا بھلا ہو بابو" ———

چچ چچ چچ ———

لطیف اختر (مرحوم)

اُمیّد

اُس کی سیمیں چھاتیوں کے درمیاں
کپکپاتے ہونٹوں کی مُہرِ طویل
یاد آتی ہے مجھے
میں تو ہوں اک زندہ لاش
تو وہ جذباتِ سرد
آرزو کی بےبسی کا نوحہ خواں
زندگی کے جال میں اُلجھا ہوا
بےکسی کی موج سے گرمِ ستیز

آسمانِ زندگی پر دُور اک ہلکی چمک
ایک تھراتے ہوئے تارے کی آنکھ
دے رہی ہے زندگانی کا پیام
جاوداں لمحوں کے پھر دُہرائے جانے کی اُمید

مرسلہ ۔ جگدیش کنول

عزیز کاشش

رجّی

یہ سنتے ہی مانو میرا دل دھک سے رہ گیا، زمین میرے گرد گھومنے لگی۔ جسم کے اعضا گویا بے جان ہو گئے، اور مجھے ایک طرح کی غشی سی محسوس ہونے لگی۔

وہ . . . . ہاں وہ رجّی ۔ جو ایک وقت حسن و جمال کی تمام رعنائیوں اور جاذبیتوں کا ایک متحرک اور قیمتی خزانہ تھی، جس کی ہر ادا پر دل والہانہ مچل مچل جایا کرتا۔ جس کی آہو نما آنکھوں کی مستی میں آب بقا جھلکتا تھا۔ اس کے سیڈول جسم میں ایک غیر ارادی بے قراری اور عجیب لوچ تھی، ہاں وہی رجّی جسے میں پہروں دیکھا کرتا لگاتار دیکھا کرتا، آج چند ہفتوں سے اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور یہی سنتے میرا دل دھک سے رہ گیا۔

ماضی کے وہ حسین لمحات ایک ایک کرکے کسی تخیلی رومان کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے، جو نتیجہ تھے ہمارے دلفریب وقتی اور ہنگامی ملاپ کا کہ جن کے تصور سے میں ایک بار پھر جھوم اٹھا اور فرط کیف سے استغراق کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

میری اور رجّی کی ملاقات قصبہ کو جاتے ہوئے، راستہ کے چوراہے میں ہوئی تھی۔ برگد کا گھنا سایہ تھا۔ اس نے ایک گٹھڑی اٹھا رکھی تھی، جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ وہ پاس کی ندی سے کپڑے دھو کر آ رہی ہے اور میں قریب کے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا ــ شدت کی دھوپ تھی۔ اور بلا کی تپش، راستے کا ایک ایک پتھر آگ اگل رہا تھا۔ لُو کے دوزخ انگیز تھپیڑے نس نس میں سرایت کر رہے تھے۔ رجّی ذرا سستانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھی تھی قطرے پسینہ اس کی کنپٹیوں سے نمودار ہو کر مرمریں گالوں پر ایک حسین انداز میں بہہ رہا تھا، دھوپ سے اس کا احمریں چہرہ آتشیں ہو گیا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا کہ لہو گرا کہ گرا۔ میں نے اس کو بھری بھری نظروں سے دیکھا، گرمی سے اس کا تنفس تیز ہو چلا تھا، اور گداز سینہ ہچکولے کھاتا ہوا سکون و اضطراب کی امتزاجی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ ان ہلکی گلابی اور سفید پنڈلیوں کی بابت تو کچھ نہ پوچھو مت بس جگمگاتا ہوا جادو سمجھو کہ جس سے مسحور ہو کر جانے مجھ پر کیا بیت رہی تھی ــــ تاہم دھوپ تیز تھی اور میں چھاؤں کی طرف لپکا، آنکھوں سے سرد چشمہ اتارا۔ اور چھاتا بند کرتے ہوئے رجّی کو میں نے دیکھا، اور اس نے مجھے، اور دوسرے لمحہ اس نے فرط حیا سے . . .

. . . .

اپنی شربتی آنکھیں جھکا لیں، مجھے اس کی یہ ادا بہت بھائی، اور میں دل تھام کر رہ گیا،

"سخت گرمی ہے،" میں نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "کمبخت بادل بھی جانے کہاں غرق ہو گئے ہیں؟"

"بادل کی بڑی ضرورت ہے بابوجی، فصلیں سوکھ گئی ہیں، وہ دیکھئے بیچاری مکی کا برا حال ہو رہا ہے،" رجّی نے سینہ اٹھا کر دور کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

لیکن کھیتوں کی طرف بھلا کون دیکھتا وہاں کیا دھرا تھا، سارے جہان کی دلکشی تو سمٹ سمٹا کر رجّی کی گداز اٹھان میں سما گئی تھی اور میں اسی کو دیکھتا رہا۔

جب اسے میری خوش نگاہی کا احساس ہوا تو وہ جھینپ سی گئی۔ اس نے گٹھڑی کو گود میں ایسے دبا لیا جیسے کسی نوخیز حسینہ نے اپنے لبوں میں شرمیلی مسکراہٹ کو، تب حیا کی سرخی اس کے گالوں پر بکھر گئی۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" میں نے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔

"رجّی بابوجی" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہو؟" میں نے پھر پوچھا

"تالاب کے پچھواڑے اور پیپل تلے وہ ہمارا ہی مکان ہے جسے میرے بابا نے بنایا تھا، آج انہیں بہت تکلیف ہے۔ حدید آنے کو کہہ تھا کئی دنوں سے بیمار ہیں۔ جلدی چلو بابوجی،"

رجّی نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا اور مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھہرو رجّی تمہارے بابا کے پاس میں بھی چلوں گا۔ یہ دیکھو میں ابھی ابھی ایک آدمی کو دوا دے کر آ رہا ہوں" میں نے اپنا بیگ دکھاتے ہوئے کہا۔

"سچ بابوجی" رجّی نے دفعتہً مچل کر کہا "میرے بابا آپ کو دیکھ کر بڑے خوش ہو جائیں گے، وہ کہتے تھے کہ اگر ہمیں دوا دارو کھانے کو ملے تو اچھا ہو جاتا ہوں۔ دوائی کہاں سے آئی ہم بہت غریب ہیں بابوجی"

"فکر نہ کرو رجّی، میں غریبوں سے پیسے نہیں لیا کرتا۔ تم مجھے اپنے بابا کے پاس لے چلو"

رجّی اٹھلا کر سر جھکا کر میرے آگے چلنے لگی جیسے کوئی ننھی رہنما جو راہ دکھانے کے ساتھ ہی فخر بھی کر سکتا ہے، ایک فرشتہ کہ جسے صدیوں تک راہ دکھائی ہو دے۔

رجّی مجھے اپنے گھر لے گئی، چارپائی پر ایک بوڑھا کراہ رہا تھا۔ پاس ہی چار سالہ لڑکا منو میٹھا تعجب کی نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا۔ چند مٹی اور سلور کے برتن، ایک بھتر لپا ہوا اور کچھ بجھی ہوئی لکڑیاں غالباً اس مکان کی یہی کائنات تھی۔ بوڑھے نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے تھرما میٹر نکالتے ہوئے پوچھا

"آج بیس دن سے ایک ہی بخار ہے ڈاکٹر صاحب بچنے کی کوئی امید نہیں"

"گھبراؤ نہیں بابا، تم جلد اچھے ہو جاؤ گے" میں نے ڈاکٹروں کے مخصوص فقرے کو استعمال کرتے ہوئے کہا۔ تھرمامیٹر نے حرارت ۱۰۵ بتلائی۔ میں نے رجّی سے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا اور بیگ سے دو پٹیاں بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھتا گیا، کچھ وقفہ کے بعد یہ کام میں نے رجّی کے سپرد کر دیا اور خود اس کے لئے بیگ سے شیشیاں نکال کر دوائی بنانے لگا ——— بوڑھے نے نحیف آواز میں کہا "ڈاکٹر جی ہم بہت غریب ہیں جب اچھا تھا تو لکڑیاں اور گھاس کاٹ کر شہر لے جایا کرتا تھا، آج بیس دن سے یوں ہی پڑا ہوں ——— اور اب موت کا تو کوئی ڈر نہیں صرف اس بچی اور چھوٹے منو کا خیال رہ رہ کر بیتاب کر رہا ہے کہ ان معصوموں کا کیا ہوگا" بوڑھے کی خشک آنکھیں بمشکل چند قطرے نمودار کر سکیں جسے رجّی کے پلو نے اپنے میں جذب کر لیا۔

دوا بنا کر میں نے رجّی کو دی ساتھ ہی استعمال کی ہدایت بھی کر دی اور صبح پھر دیکھنے کا وعدہ کر کے چلا آیا ——— گھر پہنچا تو میں کچھ عجیب الجھن میں تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے رجّی کے باپ کو فوراً صحتیاب کر دوں خواہ مجھے کچھ بھی کرنا پڑے ——— صبح صبح میں پھر گیا، بوڑھے کا بخار کم تھا اور حالت بھی تسلی بخش۔ رجّی اس وقت گھر پر نہیں تھی بوڑھے نے کہا وہ لکڑیاں کاٹنے باہر گئی ہوئی ہے میں بوڑھے کو دیکھ کر واپس چلا آیا ——— اچانک راستہ کی پتھریلی پگڈنڈی پر بیٹھے ہوئے میں نے رجّی کو دیکھا جو اپنی ہی لکڑیوں کا گٹھا رکھے مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"بابوجی، اور تو کوئی خدمت کرنے کے لائق نہیں ہوں، یہ لکڑیاں" رجّی نے ایک راز بھرے لہجہ میں کہا۔ رجّی کے اس احساس سے میں بہت متاثر ہوا اور پیار سے بولا۔

"میں اس قابل نہیں ہوں رجّی بلکہ تم میرے لئے لکڑیاں لاؤ۔ میں تمہیں حسن کی دیوی سمجھتا ہوں تم پوجا کے لائق ہو پھر بھلا تم لکڑیاں کیوں لاتی ہو"

"بابوجی یہ تھوڑی سی تو ہیں۔ بابا جب راضی ہو جائیں گے تو ہم دونوں بہت سی لکڑیاں لایا کریں گے" وہ پھر معصومیت سے بولی۔

لکڑیاں رجّی نے ہمارے صحن میں لا کر پھینک دیں اور سلام کر کے چلی گئی میں نے بھی اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو گیا۔

میں رجّی کے ہاں روزانہ جایا کرتا۔ اس کے بابا بالکل تندرست ہو چکے تھے ان کے رواں رواں سے میرے لئے دعائیں نکلتی تھیں جب میں رجّی کے پاس جاتا تو اس کا چہرہ شگوفے کی طرح کھل جاتا، بادام نما شربتی آنکھیں فرط انبساط سے چمک اٹھتیں، اور میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے اور اس کی باتیں سننے میں ایک غیر فانی کیف محسوس کرتا، اور کچھ عرصے کے لئے اپنے آپ کو ایک انوکھی دنیا میں پاتا۔

دن ایک خاص سرور میں گذرتے گئے۔ میں روزانہ ان کے ہاں جاتا اور حتی الوسع ان کی امداد کرتا، رجّی بھی کبھی کبھار چھوٹے منو کو ساتھ لے کر میرے ہاں کبھی آم کبھی لیچی لے کر آتی۔ اور گھنٹوں میری بڑی بڑی کتابوں میں سے خود اور منو کو تصویریں دکھایا کرتی

ایک دن جب کہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ساون کی بے مہار بدلیاں آکاش پر بھاگی چلی جا رہی تھیں، دور پہاڑوں کے پیچھے کبھی کبھی بادل کی ہلکی سی گرج سنائی دیتی تھی ہوائیں قدرے خنکی تھی۔ اور آفتاب اپنی منزل کے اختتام پر تھا میں اپنے کمرے میں بیٹھا رات کو پڑھنے کے لئے ایک کتاب کے انتخاب پر سوچ رہا تھا کہ اچانک "بابوجی سلام" کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ باہر جو دیکھا تو گلی میں سلاخوں والی کھڑکی سے لگی رجّی مسکرا رہی تھی۔

"اندر آ جاؤ" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

رجّی اندر آ گئی، اس کے ہاتھ میں موتیے کے پھولوں کا ایک ہار

تھا جس میں جا بجا گلاب کے پھول نہایت خوبصورتی سے پروئے ہوئے تھے۔

"بلنے یہ ہار آپ کے لئے بھیجا ہے، کہتے تھے، بابو جی کا احسان ہم ساری عمر نہیں بھول سکتے، وہ تو فرشتہ ہیں"

"لیکن یہ گوندھا کس نے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے" وہ لجا کر بولی

"اب یہ بھی کہہ دو کہ ہار لانے بھی تم اپنی مرضی سے ہو، بابا نے نہیں کہا۔ بلکہ تمہارا جی چاہا کیوں؟" میں نے کہا۔

اس کے جواب میں وہ زیر لب مسکرا دی —— آہستہ سے آگے بڑھی۔ اور میرے گلے میں ہار ڈال کر میری طرف اپنی چمکیلی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

میں نے ہنس کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور وہ بات کا رخ بدل کر کہنے لگی بابو جی، آپ کے پاس جو خود بخود گیت گانے والا کالا باجہ ہے نا، منو کہتا تھا، کہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ جب بابو جی بجائینگے تو میں بھی سننے جاؤں گا۔

ہاں کل جب تم آؤ گی تو منو کو بھی ساتھ لے آنا، پھر ہم منو کو باجہ سنائیں گے۔ عرصہ تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مجھے اپنی ماں کی موت کا حال سناتی رہی کہ کس طرح دیوانے بیل نے سینگ مار مار کر اُسے لہولہان کر دیا تھا۔ اور وہ بے چاری وہاں ہی دم توڑ کر رہ گئی۔ . . . . اتنے میں زور سے بادل گرجا اور پانی چھاجوں برسنے لگا۔ ایک سمندر تھا جو آسمان سے ٹوٹ پڑا بارش کے تیز تیز چھینٹے دروازہ اور کھڑکی سے اندر آنے لگے، میں نے اٹھ کر انہیں بند کر دیا اور ساتھ ہی لالٹین جلا کر باورچی خانہ سے نوکر کو کھانا لانے کے لئے کہا۔ کھانا آ گیا تو رجّی کو میں نے کھانے کے لئے کہا، لیکن وہ کچھ سہم گئی تھی۔ میرے کافی اصرار کے بعد اس نے چند لقمے زہر مار کئے، اور اسی طرح سمٹ سمٹا کر کرسی پر بیٹھی رہی۔

"بابو جی اب میں گھر جاؤں گی، بابا انتظار کرتے ہوں گے"، اس نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ "اس وقت تمہارا گھر جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ باہر موسلا دھار مینہ برس رہا ہے۔ اندھیری اور ڈراونی رات۔ پھر تمہیں جانا بھی دور ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، بارش تھمنے کی نہیں، بہتر یہی ہے کہ تم یہاں رہ جاؤ۔ صبح جب بارش بند ہو جائے گی، تو چلی جانا —— گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو، مانگ لینا"

میری اس چھوٹی سی تقریر کے بعد وہ کرسی میں جا دبکی۔ میں نے اس کے لئے بستر بچھا دیا۔

وہ لیٹ گئی۔ لیکن کچھ سنجیدہ سی ہو گئی تھی، میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا، اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس کا جواب وہ صرف ہوں ہاں، میں ہی دیتی رہی۔

دراصل وہ کسی نامعلوم اُدھیڑ بن میں مبتلا معلوم ہوتی تھی۔ ناچار میں نے سونے کے لئے کروٹ بدل لی۔ لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔ اُس کے سینے کے تنفس کا ہلکا سا ساز مجھے بدستور سنائی دے رہا تھا، اس کے ہونٹوں کا لمس میرے ہونٹوں سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اپنے ارد گرد میں کچھ عجیب سی کیفیت پا رہا تھا۔

رجّی کے کبھی کبھی کروٹ بدلنے کی سنسناہٹ میرے سینہ میں ایک ہلچل سی پیدا کر دیتی تھی، جس سے بعض دفعہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب تھی، ایک کمزور سے جذبہ کے تحت میں اٹھا اور رجّی کی چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا —— وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر نیند کی آغوش میں تھی۔ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ لالٹین اُٹھا کر میں نے ساتھ والی ٹی پائی پر رکھ دی اور خود زمین پر بیٹھ گیا، روشنی اس کے دل فریب چہرے پر پڑ رہی تھی، اُس کے پریشان بالوں کو آہستہ سے میں نے آراستہ کیا۔ نازک انگلیوں کو نہایت نرمی سے چھوا، اور ملائم رخساروں کو گہری نظروں سے دیکھا۔ میرے سامنے وہ ایک سنگِ مرمر کے مجسمے کی طرح پڑی تھی، اس کی شفاف اور خوبصورت کلائیاں، سینے کی بھرپور جوانی۔ میرے جذبات کو

پرانگیختہ کر رہی تھی۔ اس کے گلاب کی پتیوں سے سرخ ہونٹ جو آبِ حیات کا چشمہ تھے۔ لالٹین کی روشنی میں ابرق کی طرح چمک رہے تھے ——— میں ان پر جھک گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ——— میں اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھنے ہی والا تھا۔ کہ مجھے! ——— مجھے اس کی بے چارگی اور بے بسی کا خیال آ گیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ اور لڑکھڑاتا ہوا ایک وزنی پتھر کی طرح اپنی چارپائی پہ جا گرا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ رجی اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی۔ اسے کیا پتہ کہ رات کو کیا کچھ ہوا میرے ساتھ۔ اتنے میں اس نے ایک دلربا انگڑائی لی۔ اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ——— مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا. . . . .

. . . .

محکمہ نے مجھے مزید ایک ٹریننگ کے لئے بمبئی بھیج دیا۔

لیکن افسوس کہ جاتے ہوئے میں رجی کو مل نہ سکا، بمبئی پہونچا تو ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ اور رجی کی یاد مجھے بے چین کر دیتی تھی، اکثر رات کو کالج سے تھک کر جب میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹتا تو کھڑکی میں سے منور چاند میں اپنی رجی کو دیکھتا، جو ہاتھ پھیلائے مجھے کہہ رہی ہوتی کہ "میرے ساجن تم مجھ سے اتنی دور کیوں چلے گئے ہو میں تو تمہارے انتظار میں گھل گھل کر دن کاٹ رہی ہوں" جب چاند کے سامنے کوئی آوارہ بدلی آ کر اسے چھپا لیتی تو میرا یہ طلسم ٹوٹ جاتا ——— بعد میں مجھے ایک دھکا سا لگتا جس سے میں دم بخود ہو کر رہ جاتا، کالج میں میرا کوئی ہمراز نہ تھا وہاں میں کھویا کھویا سا رہتا ——— سینما دیکھتا تو ہیروئین بھی مجھے رجی ہی دکھائی دیتی۔ ایک مدھر کیفیت تھا ——— جس میں میں ہمیشہ غرق رہتا۔

میں اکثر سوچتا کہ پلٹ کر میں رجی کو اپنا بنا لوں گا۔ اور زندگی کے رنگین لمحات بسر کروں گا۔

میرے جانے کے چند ماہ بعد رجی کا باپ پھر بیمار ہوا، لیکن صحتیاب نہ ہو سکا، اور وفات پا گیا، رجی کے لئے زندگی اندھیر ہو گئی ——— جاتی تو کہاں جاتی؟ ادھر بھرپور جوانی۔ اُدھر بے بسی اور دنیا کی للچائی ہوئی نگاہیں۔ رجی یہ سب کچھ سُلگ سُلگ کر برداشت کرتی رہی۔

قصبہ کی پنچایت نے فیصلہ کر کے رجی کا بیاہ کمیٹی کے ساقی سے کر دیا۔ جو پہلے ہی تین بچوں کا باپ تھا، اور ٹھرا (شراب) پینے کے علاوہ حسبِ توفیق جوا بھی کھیل لیا کرتا تھا.

بھولی بھالی خوبصورت رجی کو گویا بھاڑ میں جھونک دیا گیا۔

سارا سارا دن گھر کا کام کاج کرنے کے علاوہ رات کو دیر تک اپنے شرابی خاوند کے پاؤں دباتی رہتی۔ اور ذرا ذرا سی بھول پر بُری طرح پٹ جایا کرتی۔ رات دن رو رو کر اس نے اپنی چاند سی جوانی کو گھن لگا لیا۔ پہروں کسی گہری سوچ میں غرق رہتی۔ شادی کے گیارہ ماہ بعد اس کے پیٹ سے ایک مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی اور وہ خود مرتے مرتے بچی، آہو سی آنکھیں اندر کو دھنس گئیں، عنابی ہونٹ زرد پڑ گئے۔ وہ دلکش پھول سا چہرہ مرجھا کر خشک ہو گیا وہ اُبھرا ہوا گداز سینہ نہایت بے رحمی سے مسلا گیا، وہ کبک سی رفتار دیوار کا سہارا لے کر چلنے میں تبدیل ہو گئی ———

اور وہ سنہری رجی گویا مٹی میں رُل گئی۔ اس پر بھی بے رحم خاوند کے ظلم و ستم اور بڑھتے گئے اور رجی مجبور ہو کر موت کا انتظار کرنے لگی۔ ایک رات شدت کی سردی تھی۔ باہر قیامت کی بارش، رجی بخار میں مبتلا۔ اور چھوٹے منو کو گلے لگائے لگاتار رو رہی تھی کہ باہر سے اس کا خاوند شراب میں بدمست اندر آیا، اور رجی کو کھانا لانے کے لئے کہا، رجی کانپتی ہوئی اٹھی، کھانا تھالی میں ڈال کر اٹھی ہی تھی، کہ نقاہت اور کمزوری سے چکرائی اور لڑکھڑا کر دھم سے گر پڑی کھانا زمین پر بکھر گیا۔ اور تھالی ٹوٹ گئی۔

خونخوار ماشکی کڑک کر اٹھا اور کنول سی رجی کو اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی، بعد میں اسے چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بلا کی سردی میں باہر چھوڑ آیا ——— صبح جب اس نے دروازہ کھولا تو وہاں رجی کی لاش تھی۔ جسے وہ پھر اندر گھسیٹ کر لے آیا۔

(باقی)

غلام رسول نازکی

مُہلت

چند روز اور مجھے جینے دے

(۱)

غالباً دیکھ سکوں گا میں کبھی!
اپنی خوں گشتہ امیدوں کا مآل
غالباً تشنۂ دیدار آنکھیں
دیکھ لیں گی کسی کافر کا خیال

(۲)

نیند کے نرم و شبک سائے ہیں
چند دن اور بسر کرنے دے
زلفِ شبگوں کی حسیں وادی میں
پھر تخیل کو سفر کرنے دے

(۳)

اس نے تاکا ہے کئی بار مجھے
اپنی آنکھوں کی کمیں گاہوں سے
چند روز اور مجھے جینے دے
وہ پھر آئے گی انہی راہوں سے

(۴)

کیف آسودہ سا احساس لطیف
ایک مجبوب سا اقرارِ جمیل
ایک شاعر کی غزل کا شہ بیت
ایک فن کار کا شہکار جمیل

(۵)

تم مری بات سمجھ سکتے ہو؟
ساکن عرش خلش کیا جانے!
پیکرِ آب و گل آتش بکنار
پیکرِ نور طپش کیا جانے

(۶)

کاش، تقدیر اُسے لے آئے
اور تو زہر نگیں ہو جائے
اور یہ تیرے تقدس کا محل
یک قلم فرشِ زمیں ہو جائے

(رجّی صفحہ ۳۰ سے آگے) وہ نرم و نازک رجّی جس کے کتابی چہرے اور سندھوری جسم میں ایک جادو تھا۔ آج خاک میں مل چکی تھی اور اس کی موت پر سوائے منّو کے آنسو بہانے والا اور کوئی نہ تھا۔

جب میں بمبئی سے ڈیڑھ سال کی ٹریننگ ختم کر کے گاؤں پہونچا تو ایک بوڑھے سے رجّی اور اس کے بابا کی موت کے متعلق سنتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا، زمین میرے گرد گھومنے لگی جسم کے اعضا گویا بے جان ہو گئے! اور مجھے ایک طرح کی غشی سی محسوس ہونے لگی۔

عبد العزیز علائی

"طارم کا ساحل"

" اندجان " کے فوجی محبس سے دو مسلح سپاہی ایک پابجولان زخمی قیدی کو لئے ہوئے نکلے۔ ایک مضبوط گدھے کی پیٹھ پر چھوٹا سا خیمہ اور کچھ کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا۔ قیدی نوجوان تھا۔ بلند قد، فربہ اندام بڑا اسلحہ ور سر، فراخ چہرہ اور سُرخ و سفید رنگ حُسن میں بلا کی کشش تھی۔ لیکن زہر میں بجھی ہوئی تلوار کے زخم جو بازو پہ تھے اور آہنی زنجیروں کے بوجھ سے نڈھال، قدم رُک رُک کر اٹھتے تھے۔ یہ مختصر سا قافلہ جنوب مشرق سے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

چار روز کی مسافت طے کر چکنے کے بعد یہ "کلپا کچی" کے مقام پر پہنچے جہاں "دریائے طارم" صحرا میں جذب ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے یہاں جلا وطن قیدی کو بھوکے مرنے کے لئے آزاد کر دیا گیا اور محافظ سپاہی اُسے الوداع کہہ کر واپس لوٹ گئے۔

آزاد شدہ قیدی بہت دیر تک وہاں سر جھکائے بیٹھا اپنے انجام پر غور کرتا رہا۔ اسے کہاں جانا ہے؟ اس کی آئندہ جائے پناہ کہاں ہو گی؟ وہ خود بے خبر تھا۔ گمنام مسافر جسے اپنی منزل کا پتہ ہی نہیں اور لق و دق صحرا، خونخوار درندوں کا مسکن، آثار حیات سے یکسر خالی، آباد دنیا سے الگ تھلگ، جس کے سینے پر نہ کبھی کسی صحرا نورد کے نقوشِ پا ثبت ہوتے نہ مٹے۔ ہولناک بیابان کا تاریک گوشہ، افق تک وحشت برستی تھی اور خار دار جھاڑیوں کے سوا سبزہ کا کہیں نام و نشان نہ ملتا تھا۔

اتنا ہولناک ویرانہ اس کے دیکھنے میں کہیں کب آیا ہو گا۔ پر صعوبت سفر جس کا اختتام نظر نہ آتا ہو وہ دیر تک اپنے بازو کے زخم کو ہاتھ کی انگلی سے چھوتا رہا۔ لیکن اپنے مستقبل کے متعلق دل میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

وہ موت سے بچ نکلنے پر بھی وادیٔ موت کے ناکے پر بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرہ پر افسردگی یا خوف کا کوئی نشان پایا جاتا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر ایک بار سنجیدگی سے چاروں طرف دیکھا دُور بہت دُور افق پر اُسے گرد اٹھتی نظر آئی جسے دیکھ کر مسافر نے اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر لیا۔ یقیناً یہ کوئی قافلہ ہو گا جو صحرا میں بھٹکتا پھرتا ہے یا کوئی خانہ بردوش قبیلہ جس کے خیمہ زن ہونے کے لئے وہاں قدرتی لوازمات موجود ہیں۔

وہ اُٹھا اور کچھ سوچ کر چل دیا۔ صحرا کی فرحت بخش ہوا نے اس کے مضمحل اعضا میں تازگی پیدا ہو رہی تھی۔ او محبس کی اذیت بخش زندگی سے جو خستگی اور درماندگی پیدا ہوئی تھی وہ آزادی کی مسرت سے توانائی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ آفتاب ڈھل چکا تھا اور غروب آفتاب سے پہلے مقام لامکاں پر پہنچنے کی تمنا اُسے تیزی سے اُفق کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔

وہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا، افق کی خاکی گھٹا کچھ خلا کے بے پایاں گنبد میں پھیل کر کچھ سینۂ صحرا پر اُتر کر کم ہو رہی تھی، آفتاب کا بے نُور پیکر مغرب میں سپرد لحد ہو چکا تھا۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی تھی اور مسافر اس وحشت ناک مقام پر پہنچا جہاں "قلماق" قبیلہ کے خون آشام خنجر دن بھر انسانی لہو میں ڈوبتے اور تیر کے زہ سے نکلتے۔

ریگ صحرا پر گھوڑوں کے سُموں کے بے ترتیب سے نشاں پھیلے ہوئے تھے، مسافر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور جس جگہ متحارب قبیلوں نے فیصلہ کُن لڑائی لڑی تھی وہاں پہنچ کر رک گیا۔

"قلماق" قبیلوں کی آپس کی خانہ جنگی ختم ہونے کو ہو گئی لیکن اس کا خاتمہ ازبس حسرت ناک تھا۔ نہ فتح کا شادیانہ بجانے کے لئے کوئی فاتح زندہ رہا اور نہ مفتوح جو اپنی ہزیمت پر خون کے آنسو روتا۔

" دریائے طارم " کے خشک ساحل پر مرنے والوں کے چند لاشے گور و کفن کے لئے پڑے ترس رہے تھے اور کچھ کٹے ہوئے انسانی اعضا بکھرے پڑے تھے۔

نہایت دہشت ناک مقام تھا۔ شام کی تاریکی اور بیابان کے ہلاخیز سناٹے سے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ وہ دیر تک وہاں ساکت کھڑا رہا۔ اور قبائلی مقتل یا انسانی لہو سے سیراب شدہ مزرعہ کو عبرت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

بے گور و کفن نعشوں کو دیکھ کر اُسے شدت سے انسانی فرض کا احساس ہوا۔ شام تیرہ و تار، صحرا ناپیدا کنار اور منزل جس کا اختتام ہی نظر نہیں آتا۔ اُسے یہ گوارا نہ ہوا۔ کہ شہدا کے لاشے ناپاک درندوں کے دوزخ آسا پیٹ کا ایندھن بننے کے لئے چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا جائے وہیں کمبل ڈالا۔ روٹی کا ایک ٹکڑا، خاگینہ اور پنیر جو فوجی سپاہیوں سے اس نے زادِ راہ میں پایا تھا کھایا اس ہیبت ناک دشت کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پڑ کر سو رہا۔

سپیدۂ سحر کی اولیں نمود بہت پُر کیف تھی اور "طارم" کے ریگستانی ذرّوں کی تابانی پر انجم نثار ہو رہے تھے۔

مسافر خواب سے چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور جس مقصد کیلئے اس نے "طارم" کے دہشت پُر خطر میں خوفناک رات بسر کی تھی، اس کی تکمیل کے ذرائع کی تلاش میں مقتل میں گھومنے لگا۔

معلوم ہوتا تھا متحارب قبائل نے آخری لڑائی مآل سے لاپرواہ ہو کر لڑی ہے اور وہ اس کے نتائج سے بھی آگاہ تھے۔ ریت کی لمبی لیا شرقاً غرباً چلی گئی تھی جس کی اوٹ میں لاتعداد گہری کھائیاں کھدی ہوئی تھیں۔ جو جیتے جی کمیں گاہ اور موت کے بعد قبر کے طور پر استعمال میں لائی جا سکتی تھیں مسافر اپنے مضبوط آہنی بازوؤں پر ایک ایک لاشہ اُٹھاتا اور قبر میں رو بقبلہ رکھتا جاتا تھا۔ کٹے ہوئے اعضاء اعضا بریدہ لاشوں کے ساتھ رکھ دیتا۔ اب اتنی بڑی تعداد میں قبور کو پُر کرنا تھا جو بڑا کٹھن کام تھا۔ اس غرض کے لئے اسے ریت کی دیوار الٹنا تھی۔

وہ پہلی سی گرمجوشی سے بدستور اپنا کام جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ ان شہیدوں کے ورثاء اگر زندہ ہیں تو انہیں آخری زیارت کا موقع ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔

اس نے جلدی ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ انتظار بے سود ہے جس اہتمام سے یہ لڑائی لڑی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رونے اور رلانے والے سب شہادت پا چکے ہیں۔ آہ! انسانی ہوس کا انجام کتنا عبرت ناک ہے اور یہ قبائلی زندگی مآل اندیشی سے کتنی بیگانہ ہے۔ خدا جانے مٹھی بھر گھاس کے تنکوں اور پانی کے چند قطروں کے لئے ریت کے ذرّوں پر کتنا انسانی لہو ٹپکا ہے صحرا کا ایک گوشہ اس قدرتی عطیہ سے اسی طرح معمور ہے۔ اور معمور رہے گا لیکن قدرتی حق سے دوسروں کو محروم رکھنے والے ایسی بے لبی کی موت مرے ہیں کہ تربت تک نصیب نہیں۔

وہ اُٹھا اور ایک ایک قبر کو غور سے دیکھتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ تشفی حاصل کیا چاہتا تھا۔ کہ کوئی میت بے قاعدگی سے قبر میں تو نہیں اُتری اس نے ابھی پورا چکر نہ کاٹا تھا کہ اچانک دو عورتیں، ایک اونچے قطر پر سوار دیوار کی اوٹ سے نکل آئیں۔ ایک نوخیز دوشیزہ، ماہتاب کا ٹکڑا ہو اُکھڑا، آنکھوں میں بجلی کی سی چمک اور دوسری قدرے بڑھیا جس کے متاعِ حُسن کو پیرانہ سالی بھی لوٹنے سے قاصر رہی تھی سیاہ لباس میں ملبوس۔ ان صحرائی حوروں کو دیکھ کر مسافر بُت بے جان کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ ایسے لق و دق صحرا میں بھی حُسن پرورش پا سکتا ہے۔

وہ ایسا بے طرح کھو گیا کہ اپنے آپ پر اُسے ضبط نہ رہا۔ وہ اپنے ماضی و مستقبل کو بھول گیا۔ دونوں سوار عورتیں قطر سے اتریں اسے ایک جھاڑی سے باندھ دیا۔ وہ لحد میں اُترے ہوئے ایک ایک لاشہ پر کھڑا ہوتیں، آنسو بہاتیں اور قدم بہ قدم آگے بڑھتی چلی گئیں۔ آخری قبر کے قریب جہاں مسافر کھڑا تھا دوشیزہ نے پوچھا

"شہیدوں کو آپ نے لحد میں اتارا ہے ؟"

"ہاں"

"شکریہ! آپ رجال الغیب سے ہیں ؟"

"نہیں"

"تو پھر صحرا میں کیسے آنا ہوا ؟"

"جلاوطنی میں بھوکوں مرنے کے لئے"

"آپ کا نام ؟"

"جارود"

"دشمن!"

"جہاں زندگی کے بقیہ ایام بسر ہوں گے"

"آپ اپنا کام ختم کر چکے؟"

"نہیں مجھے آپ کا ہی انتظار تھا"

"جارود" ریت کی دیوار کی طرف بڑھا۔ اور اپنے آہنی بازوؤں کی بے پایاں قوت سے پشتے کے پشتے الٹتا چلا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر قبور کی ترتیب کو درست کیا۔ وہ گاہے گاہے غلط انداز نگاہ سے دوشیزہ کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ لیکن انتہا کی سرگرم مصروفیت کے باعث اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ اپنے خداداد حسن کی کشش کے باعث دوشیزہ کے تڑپتے ہوئے دل کی تسکین بن کر آنکھوں کی راہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہے۔

مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت مانگی گئی۔ دونوں عورتیں قاطر پر سوار ہوئیں جس کی لگام تھامے ہوئے "جارود" آگے چلا جاتا تھا۔

"جارود" پر جس طرح "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا..." کی بشارت پوری ہوئی۔ وہ معجزہ سے کم نہ تھی۔ اسے خود اپنی قسمت پر رشک آتا تھا "شیرازہ" جیسی حسین اور مالدار دوشیزہ اس کی شریکِ زندگی بنی جس کے ہاں صحرائی تمدن کے نقطۂ نگاہ سے ہر شے کی فراوانی تھی۔ دودھ، گوشت اور پنیر کے لئے بھیڑیں رہنے کے لئے پرتکلف کلابتونی خیمے خرما اور درخت، سواری کے لئے گھوڑے اور صحرائی گاڑیاں "جارود" کے شستہ مذاق اور نفاست پسندی نے صحرا کے اس سیراب گوشہ کو ارم کا نمونہ بنا دیا تھا اور چار سال کا ایک حسین بچہ "پرویز" جسے ماں اور باپ کا حسن و جمال مجموعی صورت میں ورثہ میں ملا تھا۔

"جارود" طبعاً فلسفی تھا اسے انسانی قسمتوں کے بننے اور بگڑنے کی بیسیوں مثالیں یاد تھیں وہ خدائی عطیات کی فراوانی پا کر گھبرا اٹھتا اور پریشانی کے عالم میں کہہ دیتا "دیکھئے اس کا انجام کیا ہو"

وقت گذرتا گیا اور کرۂ ارض مدار ارضی پر آفتاب کے گرد چار بار طواف کر چکا۔ "جارود" کی خرگاہ میں شمع جل رہی تھی۔ ایک کونے میں "پرویز" مکلف بستر پر پڑا سو رہا تھا۔ اور وسط میں جارود بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا سر میں لگی ہوئی تلوار کے زخم کی راہ جو زہر اس کے بدن میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ زیست بھر کے لئے اسے اذیت دیتا رہا۔ شیرازہ سرِ بالیں سر جھکائے بیٹھی تھی اور اشک پیہم سے آنچل بھگو رہی تھی۔

دو گھنٹوں تک مسلسل غش میں رہ کر آدھی رات کو "جارود" نے آنکھیں کھول دیں۔ دائیں طرف گردن موڑ کر "پرویز" کو حسرت سے دیکھا پھر "شیرازہ" سے مخاطب ہو کر کہا "شیرازہ" میری زندگی کا سفر طے ہو چکا۔ میں کب کا چل بسا ہوتا لیکن تمہاری مفارقت کے غم کے باعث عذاب موت دیکھ رہا ہوں" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد پھر کہا "شیرازہ میں تمہیں خدا کو سونپتا ہوں۔ پرویز کو کہہ دینا تمہارے ابا طویل سفر پر گئے ہیں۔ مجھے بھول جانا۔ خدا حافظ" --- اس پر پھر غشی طاری ہو گئی۔

شیرازہ کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی۔ وہ دل میں کچھ فیصلہ کر کے چپکے سے اٹھی، وضو کیا، دوگانہ پڑھا۔ اور سجدہ میں گر کر کچھ دعا مانگی اور ترکانِ تیموری کی طرح اس وقت سر اٹھایا جب قبولیت دعا کے متعلق اس نے اپنی ضمیر کی آواز سن لی۔

عید کی سہانی صبح تھی جس کی مسرتوں میں مرنے والوں کی یاد تڑپ رہی تھی۔ دریائے طارم کا ساحل لاتعداد شہداء کو آغوش میں لئے پڑا تھا جنہیں قبائلی خانہ جنگی میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ خام قبروں یا ریت کے تودوں کی طویل قطاریں بے ترتیبی سے ساحل پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور موسم خزاں کی سوختہ گیاہ نے ان کی سطح کو ڈھانپ رکھا تھا۔ گورستان کے باہر قبائلی افراد بہت بڑی تعداد میں سر جھکائے دوزانو بیٹھے تھے مرنے والوں کیلئے مغفرت کی دعائیں مانگتے اور چپکے سے اٹھ کر مختلف اطراف میں چلے جاتے تھے۔ شہید بچوں کی تربت پر مائیں ان کی بیواؤں کو لئے ہوئے آتی تھیں ان کا آنا قیامت تھا دل کی حسرتیں آہیں بن کر اٹھتی تھیں اور ان کے خاموش نالوں اور اشک پیہم سے تربتیں بھیگ رہی تھیں۔

اسی صبح کو ایک صحرائی گاڑی خاموشی سے گذرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اور کلپا کچی کے ایک غیر معروف چھوٹے سے گورستان کے سامنے رکی۔

گاڑی ایک حد تک خوشنما تھی۔ لیکن گیرج میں بیکار رکھے رکھے

آب وتاب کھو چکی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا مالک سیر وسفر کا شائق نہیں یا اس کی دلچسپیاں کسی وجہ سے کھو گئی ہیں۔ اور گاڑی شاذ حالتوں میں ہی استعمال میں آتی ہے۔

گاڑی بان نے اتر کر گورستان کا پھاٹک کھول دیا۔ اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اکتوبر کا مہینہ سردی بتدریج بڑھ رہی تھی آسمان ابر آلود تھا "نخلستان شان" کی سرد خشک سطح مرتفع سے آنے والی ہواؤں سے خون رگوں میں منجمد ہوا جاتا تھا۔ سارا ریگستان سرد پڑ چکا تھا۔ اور دریائے طارم کا پانی صحرا میں جذب ہو کر رہ گیا تھا۔

گاڑی میں جتے ہوئے اصیل گھوڑے ساکت کھڑے تھے "جاردو" اپنے سات سالہ بچے "پرویز" کو ساتھ لئے ہوئے گاڑی سے اترا۔ اور گورستان کے پھاٹک پر دو نو رک گئے۔

خام سی چار دیواری کے اندر گھرا ہوا محدود قطعہ زمین جہاں بار وبیڑ چار لائنوں میں ترتیب سے کھڑے خزاں کا رونا رو رہے تھے برگ وثمر سے تہی دامن، شاخیں برہنہ۔ سبزہ سوختہ سے ڈھپے ہوئے فرش پر خشک پتیاں بکھری ہوئی اور وسط میں سنگ خام کی بنی ہوئی سفید تربت جہاں "طارم" کے لق و دق صحرا بلاخیز سناٹا سمٹ کر رہ گیا تھا۔

"جاردو" اپنے معصوم بچے اور ڈرائیور کو لئے ہوئے دائیں طرف مڑا لمبی لمبی جھاڑیوں کے سرے سے بندھے ہوئے سخت کانٹے کے جاروب جو ایک درخت کے سہارے کھڑے تھے اٹھا لئے اور آن کی آن میں گورستان کی سطح خشک تیر ن رجھائے ہوتے پھولوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں سے صاف شفاف ہو کر آئینہ کی طرح نکل آئی۔

خس وخاشاک کے اٹھتے ہی سنگ لحد نظر آیا جس پر کندہ تھا

جاں دادمش بمژدهٔ وخجلت ہمی برم
زیں نقدِ کم عیار کہ کردم نثار دوست

"شیرازہ"

"جاردو" بالین تربت پر جھک کر دو زانو بیٹھ گیا۔ اور دیر تک جھوم جھوم کر کچھ پڑھتا رہا آواز میں سوز وگداز تھا۔ پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر قبر پر رکھ دیئے اور روندی ہوئی آواز میں کہا "شیرازہ! اٹھو میرے مقدر کا بن کر بگڑنا دیکھو۔ اٹھو اٹھو میری زندگی کا شیرازہ بے ربط ہو چکا ہے میں تیرے یتیم کے لئے مقدور بھر سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن ماں کی ممتا کہاں سے لاؤں؟"

وہ اٹھا۔ گورستان کا پھاٹک بند ہو گیا۔ اور آنسو بہاتا ہوا گاڑی پر سوار ہو کر چلا گیا۔

بملا گپت

ادھورا سپنا

ساجن کیسی پچھلے جنم۔ ایک سپنا دیکھا۔ بڑا ہی عجیب اور انوکھا۔ جس کا اب تک بھی میرے دل وجان اور آتما پر اثر چھایا ہے۔ کیا سناؤں۔ کیا دیکھا میں نے ؟ تم یاد کرو یا نہ۔ میں نے تمہیں دیکھا۔ تم میرے پاس کوٹھے پر آئے بکھرے بالوں کو تم نے اپنے ہاتھوں سے کنگھی کی۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ تم اسی طرح ساری عمر بال بنانے کے بہانے میرے پاس بیٹھے رہو۔ لیکن آنکھ کھل گئی۔ اور سپنے کی بات سپنا ہی ہو گئی۔ ساجن اب پھر کب آؤ گے۔ میرے پاس۔ چلو سپنے میں ہی سہی۔ آؤ ساجن ضرور آؤ۔ میری آتما تڑپ رہی ہے کہ بن ملے ہی کہیں ختم نہ ہو جاؤں اور یہ سپنا ادھورے کا ادھورا ہی نہ رہ جائے۔

ایم۔ اے عزیز

نوشتۂ تقدیر

(۲)

افرادِ ڈراما

باقر علی:۔ امجد کا باپ	زبیدہ:۔ امجد کی ماں
بڑی اماں:۔ زبیدہ کی ماں	اصغر:۔ امجد کا بڑا بھائی
امجد:۔ باقر علی کا دوسرا بیٹا	اسد اللہ:۔ امجد کا چچا
انور:۔ امجد کا ماموں (بڑی اماں کا بھتیجا)	زہرہ:۔ انور کی بہن
محمودہ:۔ زہرہ کی بیٹی	صادقہ:۔ محمودہ کی سہیلی

خادمہ

چوتھا سین

(باقر علی کی نشست گاہ۔ باقر علی، زبیدہ اور بڑی اماں بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں)

باقر علی:۔ پچھلے دو ہفتوں سے محمودہ کا کوئی خط نہیں آیا۔ فکر ہو رہی ہے

زبیدہ:۔ فکر تو خیر مجھے بھی ہے۔ لیکن آپ کے خوف سے چپ ہوں۔

باقر علی:۔ کیسا خوف؟

زبیدہ:۔ بعض دفعہ آپ ناراض بھی تو ہو جاتے ہیں۔ خدا کرے آج خط آجائے۔

(امجد داخل ہوتا ہے)

امجد:۔ (بغیر سلام کئے) یہ کیا مذاق ہے۔ آٹھ ماہ شادی کو نہیں ہوئے اور آپ کی بہو تین دفعہ میکے جا چکی ہے۔ رلبے ہمارے ایک دفعہ شادی کرتے ہیں۔ پھر لڑکی کو گھر بلانے کا نام نہیں لیتے۔

باقر علی:۔ کیوں نہ ہو۔ تم بھی تو نواب ٹھہرے۔

امجد:۔ اپنے اپنے گھر میں سب نواب ہیں۔ یہ کونسی شرافت ہے کہ دو مہینے سے آپ کی بہو کو خط لکھنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔

باقر علی:۔ گھبراؤ نہیں ہمیں بھی فکر ہے۔ محمودہ خط لکھنے میں دیر نہیں کیا کرتی۔ یہ تمہارے سلوک کا نتیجہ ہے۔

امجد:۔ اس کی غلطیوں کو اگر آپ نہ چھپائیں گے۔ تو یہ معلوم کیونکر ہو کہ آپ بھی اس کے ہمدرد ہیں۔

باقر علی:۔ بدتمیز۔ تمہیں حفظِ مراتب کا خیال بھی نہیں رہتا بتاؤ تو سہی آٹھ ماہ میں اسے کتنی دفعہ پیٹا ہے وہ اور بغیر قصور۔

امجد:۔ آپ تو بس مجھے ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔

زبیدہ:۔ تو اور کیا۔ تم نے کئی دفعہ اسے بلاوجہ پیٹا ہے۔ اور ہم سب کی موجودگی میں۔ محمودہ ایسی شریف اور کم زبان لڑکی بھی تمہارے سلوک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک ماہ گذر گیا لیکن اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی اماں نے خیریت کا ایک خط ضرور بھیجا۔ لیکن جب ہم نے محمودہ کو بھیج دینے کے متعلق لکھا تو وہ بھی خاموش ہو گئیں اور

امجد:۔ (بات کاٹ کر) بس جی بس لیکچر بازی ختم کیجئے۔

بڑی اماں:۔ امجد بیٹا۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکتے۔ لبیبہ نے کوئی بری بات نہیں کہی۔ زہرہ نے ہم پر بڑے احسان کئے ہیں

اور اب اسے میرے بڑھاپے پر رحم آیا ہے۔ محمودہ کو ہم جس قدر بھی سکھی رکھیں۔ کم ہے۔ آجکل کی ایک پڑھی لکھی لڑکی تمہارا سلوک کب تک برداشت کرسکتی ہے۔ وہ صرف خاندانی وقار اور ذاتی شرافت کی وجہ سے خاموش ہے۔

امجد:۔ بڑی اماں۔ یہ سب تمہارا ہی بگاڑا ہوا کھیل ہے۔ اگر تم اس کی طرفداری نہ کرو۔ تو میں ایک دن میں اسے سیدھا کردوں۔

باقر علی:۔ بے قصور؟

امجد:۔ تو گویا آپ اس کے قصور گنوانا چاہتے ہیں۔ تو سنئے میں رات دس بجے سوتا ہوں اور وہ صبح چھ بجے ہی گرم پانی کا لوٹا لئے میرے کمرے میں آدھمکتی ہے اور نماز پڑھنے کی تلقین شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کس قدر گستاخی ہے کہ ایک بیوی اپنے خاوند کو وعظ نصیحت کرے۔ اُسے کئی دفعہ تو صبح صبح ہی اس بات پہ پیٹ چکا ہوں۔ لیکن وہ باز نہیں آتی۔ اُسے تو بس مبلغ ہونا چاہیئے تھا میرے سر تو خواہ مخواہ تھوپ دی گئی وہ۔

باقر علی:۔ تو بس سب سے بڑا یہی قصور ہے نا؟

امجد:۔ اور سنیئے۔ بڑی اماں کو اب بڑھاپے میں خیرات کی سوجھی ہے اور جب آپ کی بہو کو کہتا ہوں کہ وہ بڑی اماں کی نگرانی کرے یعنی بڑی اماں دولت کو کاہل لوگوں کی نذر نہ کریں۔ تو حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثالوں کے بعد وعظ شروع ہو جاتا ہے۔ کہ خدا کی راہ میں سب کچھ دینا ہر مسلمان کا فرض ہے اسے تو کہیں پروپگنڈا سیکرٹری ہونا چاہیئے تھا۔ بیوی بنا کر بھلا میری زندگی تلخ کرنے سے آپ کو کیا مل گیا؟

باقر علی:۔ بس، یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟

امجد:۔ تو یہ قصور کیا کم ہیں؟ کہہ دیجئے کہ . . . . . سارے جہاں کی خوبیاں صرف محمودہ میں ہیں اور کسی میں نہیں، خدارا انصاف کیجئے کہ جو بیوی بڑی اماں کی خیرات کی لوٹ کھسوٹ اور نگرانی کرنے سے اس لئے انکار کرے کہ یہ خفیہ پولیس کا کام ہے کیا وہ بیوی کہلانے کی مستحق ہے؟

بڑی اماں:۔ بس بس۔ محمودہ میں ایک نقص بھی نہیں۔ سب قصور تمہارا ہے۔ تم بے فیض ہو۔ نکمے ہو۔ میں نے چالیس ہزار کی کوٹھی تمہارے نام کردی ہے۔ اور ایک ہزار ایکڑ زمین بھی تمہیں سونپ دی ہے۔ باقی جو کچھ میرے پاس ہے وہ خیرات میں جائیگا۔ غریبوں کا بھی کچھ حق ہے۔ ہم اتنے ٹھاٹ سے رہیں اور غریبوں کو دو وقت کھانا بھی نصیب نہ ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں دوسرے جہان کیا جواب دوں گی؟ نہ بابا میری عاقبت خراب کرنے کی نہ ٹھانو۔

(دروازے پر دستک ہوئی اور نوکر باہر سے تار لایا)

زبیدہ:۔ (حیران ہوکر) یہ کیسا تار ہے؟

بڑی اماں:۔ (رنگ زرد ہو جاتا ہے) خدا خیر کرے آج پندرہ دن سے محمودہ کا خط نہیں آیا۔

باقر علی:۔ انور کا تار ہے۔

زبیدہ اور بڑی اماں:۔ خیر تو ہے؟

باقر علی:۔ آج انور دہلی جاتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب محمودہ کو یہاں چھوڑ جائیں گے۔

زبیدہ:۔ کس درجہ شریف ہیں۔ ہمارے خط کی کتنی قدر کی۔

بڑی اماں:۔ خدا انہیں خوش رکھے۔

باقر علی:۔ ساڑھے گیارہ تو بج گئے۔ انہیں اب پہنچ جانا چاہیے تھا۔

زبیدہ:۔ موٹر گاڑی کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے دیر ہو گئی ہو۔

(دروازے پر دستک ہوئی اور انور و محمودہ آگے پیچھے داخل ہوتے ہیں)

انور اور محمودہ:۔ آداب۔

باقر علی:۔ (اٹھتے ہوئے) جیتے رہو۔

انور:۔ (بیٹھ کر) مزاج کیسے ہیں؟

باقر علی:۔ شکریہ۔ آپ سنائیے۔

انور:۔ خدا کا شکر ہے۔

زبیدہ:۔ کھانا کھائیں گے یا پہلے چائے پئیں گے۔

انور:۔ مجھے تو، روزہ ہے۔ محمودہ کو میں نے کہا تھا کہ تم کمزور ہو سفر میں روزہ نہ رکھو۔ لیکن کہنے لگی۔ اب تندرست ہوں اور تین گھنٹے میں تو گھر پہنچ جائیں گے۔ سفر بھی کونسا طویل ہے۔

باقر علی:- محمودہ کی بیماری سے متعلق اطلاع تک نہ دی۔ کیوں؟
انور:- محمودہ نے ہی منع کیا تھا۔ کہ آپ فکر کریں گے۔
محمودہ:- اماں جان مزاج کیسے ہیں؟
بڑی اماں:- تمہیں دیکھ کر خوش ہوں بیٹی۔
محمودہ:- (امجد سے) آپ بھی تو بیٹھئے۔
امجد:- ہاں بیٹھتا ہوں (ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
انور:- باجی کا تو یہ خیال تھا کہ محمودہ عید کر کے جائے۔ لیکن محمودہ نے کہا کہ ابھی عید میں پندرہ دن باقی ہیں۔ اور آپ کا تاکیدی خط بھی موصول ہوا تھا اس لئے رکنا مناسب نہیں۔
بڑی اماں:- انور تمہیں خدا سلامت رکھے۔ تم نے اور زہرہ نے ہم پر بہت احسان کئے ہیں۔
انور:- ہم آپ کے غلام ہیں بڑی اماں۔ اب مجھے اجازت دیجئے مجھے شام کو دہلی پہنچنا ہے۔
زبیدہ:- ایک دو دن تو یہاں ٹھہریئے۔
انور:- میری بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن دہلی میں جامعہ کے ڈاکٹر سید عابد حسین سے کچھ ادبی مشورہ کرنا ہے
بڑی اماں:- طبی مشورہ یا ادبی مشورہ۔
محمودہ:- وہ اسی قسم کے ڈاکٹر ہیں جیسے ڈاکٹر اقبال۔
انور:- (اٹھتے ہوئے) ڈاکٹر عابد بھی آئندہ نسلوں کی تعمیر میں ایک خاص اسلوب سے مصروف ہیں۔
(سب کھڑے ہو جاتے ہیں اور انور کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ انور باہر جاتا ہے۔ باقر علی، زبیدہ اور بڑی اماں بغلی دروازے سے اندر جاتے ہیں)
محمودہ:- آپ خیریت سے تو رہے۔
امجد:- ہاں۔
محمودہ:- آپ نے مہینہ بھر میں ایک خط بھی نہ لکھا۔
امجد:- ہاں
محمودہ:- آپ ناراض معلوم ہوتے ہیں
امجد:- ہاں۔
محمودہ:- آپ تو بڑے خوش ہیں۔ ناراض معلوم نہیں دیتے
امجد:- ہاں۔
محمودہ:- (زور کا قہقہہ لگاتی ہے)
امجد:- کیا کہا تھا؟
محمودہ:- آپ ناراض تو نہیں نا۔
امجد:- تھوڑا تھوڑا۔
محمودہ:- اچھا تھوڑا تھوڑا خوش بھی ہو جائیں۔
امجد:- میں کیسے خوش ہو سکتا ہوں۔ آج آٹھ ماہ شادی کو ہو چکے ہیں۔ پہلے دن سے ہی بک رہا ہوں کہ تم گھر کا انتظام اس طرح سنبھالو۔ کہ کوئی چیز کاہل اور سست لوگوں کو نہ دی جائے۔ لیکن بڑی اماں کا تمہیں کچھ اتنا پاس ہے کہ ان کی حمایت اور میری مخالفت کرتی ہو۔
محمودہ:- خدا اور رسول کے بعد میں آپ کا حکم بجا لانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ لیکن خیرات کا بند کرانا تو شرعی احکام کی خلاف ورزی ہے یہ مجھ سے ہونے کا نہیں۔
امجد:- تو جو کچھ تم کرتی ہو عین شرع کے مطابق ہوتا ہے۔
محمودہ:- اپنی طرف سے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔
امجد:- تو گویا شدت کی سردی میں چھ بجے صبح پانی کا گرم لوٹا کر خاوند کے گرد ہو جانا یہ بھی عین شرع کے مطابق ہے۔
محمودہ:- میرا تو یہی خیال ہے
امجد:- لیکن اس کے ثبوت میں کوئی قرآن یا حدیث کا حکم؟
محمودہ:- ہر کلمہ گو شاہد ہے۔
امجد:- اور اس تبلیغ کا نشانہ خاوند کو بنانا بھی عین شرعی حکم ہے؟
محمودہ:- خیرات گھر سے ہی شروع ہوتی ہے۔
امجد:- تو گویا مجھے یہ خیرات دے رہی ہو۔
محمودہ:- نہیں معاف چاہتی ہوں۔ نیکی گھر سے ہی شروع ہونی چاہیئے مہاتما بدھ سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو راہ راست پر لائے پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے اپنی بیوی حضرت خدیجہ کو پیغام حق سنایا۔

امجد:- تم سے بحث کرنا تو لاحاصل ہے۔ اچھا یہ خیرات بھی گھر سے شروع کرو۔ بڑی اماں کو بڑھاپے کے وقت سب کچھ ضائع کرنے سے روکو۔

محمودہ:- گویا خیرات کی بجائے انہیں بخل سکھاؤں اور خود بخیلوں سے بدتر ہو جاؤں۔

امجد:- تو گویا تم میرا حکم نہ مانو گی۔

محمودہ:- پیارے امجد۔ مجھے یہ کہو کہ بزرگوں کی عزت کرو، کفایت کرو، سادہ لباس پہنو، سادہ خوراک کھاؤ۔ اور جو بھی مشکل سے مشکل کام کہو میں کرنے کے لئے تیار ہوں اور بخوشی کر بھی رہی ہوں لیکن میرے بس کی بات نہیں کہ بڑی اماں کو نیک کام سے روکوں۔ جب آپ انہیں خیرات سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں کانپ اٹھتی ہوں اور سوائے ان کی طرفداری کے کچھ بن نہیں آتا۔ آئندہ تمہاری خاطر خاموش رہوں گی۔

امجد:- نہیں میرے ساتھ مل کر ان کی مخالفت کرو۔

محمودہ:- یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سری رامچندر جی نے اپنے پتا کے اشارے پر سلطنت قربان کر دی اور وطن تک چھوڑ دیا والدین کی فرمانبرداری ہر انسان کا فرض ہے۔

امجد:- تو گویا تم ہندو ہو۔

محمودہ:- نہیں۔ لیکن مختلف مذاہب کے ہادیوں اور رہنماؤں نے تقریباً ایک سا پیغام دیا ہے جھگڑا تو ان لوگوں نے پیدا کیا ہے جو خود تو مذہب سے واقف نہیں۔ لیکن بن بیٹھے ہیں پرچارک، واعظ اور رہنما۔

امجد:- تم تو کہیں تبلیغ کے کام میں لگ جاؤ میرے گلے کا ہار کیوں بن گئی ہو۔

محمودہ:- اگرچہ یہ شادی میری والدہ کے حکم سے ہوئی تاہم مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر ہے۔ لیکن یہ اصولی اختلاف ہے اور اصولی اختلاف پر تو بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے حضرت امام حسینؑ نے کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں بال بچوں سمیت کئی دن بھوکے پیاسے رہ کر شہادت کا جام پیا۔

امجد:- تم بھی اصولی اختلاف پر شہادت کا جام پینا چاہتی ہو۔

محمودہ:- نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ میں ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن ان کی شہادت ہمیں حق کی راہ دکھاتی ہے۔

امجد:- تو پھر تم مجھ سے اتفاق نہیں کر سکتی۔

محمودہ:- اتفاق تو کر لیا میں نے مخالفت ترک کر دی۔ گو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ایک ہزار ایکڑ زمین میں سے پانسو ایکڑ زمین غریب محتاجوں کے نام کر دی جائے تاکہ وہ بھوکوں نہ مریں۔ اور اپنی زندگی کے دن آرام سے بسر کر سکیں۔

امجد:- وہ کام کریں اور پیٹ پالیں۔

محمودہ:- ہماری پڑوسن کو ہی لیجئے۔ اس کے چار بچے ہیں۔ بڑا ابھی چھ سال کا ہے کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اب وہ کیا کام کرے اس کی چھوٹی لڑکی تین ماہ کی ہے۔ اسے سنبھالے یا کسی کے گھر کام کرے۔ خاوند قرضہ چھوڑ گیا ہے۔ اور قرضخواہ پورے یہودی بنے بیٹھے ہیں۔ گھر کی سب چیزیں لے گئے ہیں۔ اس نے تنگ آ کر کسی کے گھر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ لیکن وہ امیر آدمی ٹھہرے بمشکل ایک آدمی کا کھانا دیتے ہیں۔ وہ سب بانٹ کر کھاتے ہیں بچے بے صبری سے روتے ہیں۔ انہیں دلاسا دینے کے لئے صرف خالی پانی آگ پر رکھ دیتی ہے۔ جب نیند بھوک پر غلبہ پا لیتی ہے تو بچے ایک ایک کر کے سو جاتے ہیں یہ کس قدر نیکی ہو گی اگر اس کھولتے پانی میں کوئی چاول ڈال دے۔

امجد:- وہ کیوں۔

محمودہ:- ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ہم اتنی زمین کے مالک ہوں ہمارے گھر کے کتے بھی ان غریبوں سے اچھا کھائیں اور پڑوس میں غریب بھوکوں مریں۔ جاڑے میں سردی سے ٹھٹھریں اور گرمی میں لو سے جھلسیں۔

امجد:- تم تو بالشوازم کا پرچار کر رہی ہو۔

محمود :- نہیں۔ اقربا، یتامے اور مساکین کی مدد کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

امجد :- بس میں زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک دم جواب دو کہ بڑی اماں کی خیرات کی مخالفت کرو گی یا نہ۔

محمود :- نہیں۔

امجد :- پھر سوچ لو۔

محمود :- نہیں۔

امجد :- دوبارہ یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا — سوچ کر جواب دو۔

محمود :- نہیں

امجد :- (پیٹنے کو دوڑتا ہے)

(باقر علی داخل ہوتا ہے)

باقر علی :- خبردار۔ ہاتھ نہ اٹھانا۔ ورنہ سب جائداد سے بے دخل کر دیئے جاؤ گے۔

(پردہ گرتا ہے)

(باقی آئندہ)

گلشن سمیلپوری

پرانی کہانی

ترا وہ شباب اور مری نوجوانی ہیں دونوں کے دونوں پرانی کہانی
چلی آؤ دہرائیں پھر وہ کہانی عجب کیا ہے لوٹ آئے پھر نوجوانی
نہ ترا پاؤں جاؤں من جاؤ جانی کہ وعدوں میں ہی ڈھل چلی ہے جوانی
تو اقلیم حسن و ادا کی ہے رانی ہے شعروں کی دنیا مری راجدھانی
نگاہوں میں رقصاں ہے پھر عہد رفتہ ہیں یاد آرہی پھر وہ راتیں سہانی
بدل لے! بدل لے! یہ مٹیالی ساڑھی پہن لے! پہن لے! وہ پوشاک دھانی
بنا لے۔ سجا لے۔ یہ مانگ اور گیسو کہاں ہے ترا آج بھی کوئی ثانی
چلی آؤ بس کر گلاب و حنا میں مہک اٹھے پھر گلشن زندگانی!
رقیبوں پہ احساں کیے لاکھ تو نے مری بات ننھی سی لیکن نہ مانی

کھلونا سہی گلشن میں آب و گل کا!
مگر عشق تو ہے مرا غیر فانی

حمیدہ فضل کریم

پابندِ وفا

امجد ایک وکیل کا لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ خوبصورت نوجوان ذہین اتنا کہ ہمیشہ اپنی کلاس میں فسٹ آتا ہے۔ امجد کی والدہ بڑی سمجھدار اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ امور خانہ داری میں انہیں پوری پوری دسترس حاصل ہے۔ امجد کا چھوٹا بھائی افضل فسٹ ایئر میں ہے لیکن یہ اپنے بڑے بھائی کی طرح ذہین نہیں۔ اس کی دو بہنیں بھی ہیں۔ سعیدہ اور رشیدہ۔ یہ دونوں بی۔ اے کامیاب کر چکی ہیں۔ اور اب امور خانہ داری میں مشاق ہو رہی ہیں۔ دونوں سلائی میں بھی بلا کی ماہر ہیں والدہ کا ہاتھ باری باری بٹاتی رہیں۔ بڑی بہن سعیدہ بہت عقلمند ہے اس نے گھر کا سارا انتظام اپنے سر لے رکھا تھا۔ تعلیم چھوڑنے کے دو سال بعد اس کی شادی شہر کے ایک رئیس سے ہو گئی۔ زاہدہ اور شاہدہ امجد کی چچازاد بہنیں تھیں۔ زاہدہ میٹرک پاس کر چکی تھی۔ نہایت حسین و جمیل۔ سرو قد۔ بلا کی ذہین اور عقلمند لڑکی تھی۔ شاہدہ مڈل کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ سکینہ خانم امجد کی چچی قدرے سخت مزاج تھیں۔ امجد روزانہ ایک دفعہ چچا کے گھر جایا کرتا تھا۔ وقتاً فوقتاً بہنوں کو پڑھائی میں امداد بھی دیا کرتا۔ چچا کو اس کے ساتھ بہت اُنس تھا۔ لیکن وہ چچا بچپن کی طرح ضرورت سے زیادہ سیدھے سادھے تھے۔ بیوی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جاتی۔ امجد کو قدرتاً زاہدہ کے ساتھ الفت تھی اور زاہدہ کو بھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے اور گرمجوشی محبت کرتے تھے پہروں ایک دوسرے کو دیکھتے رہنا اور خوش ہونا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک دن امجد حسب معمول اپنے چچا کے گھر گیا اور دوران گفتگو چچی سے کہنے لگا۔

امجد :- چچی جان! زاہدہ کو کالج میں داخل کیوں نہیں کراتے؟ اس کی پڑھائی کیوں چھڑا دی ہے۔

چچی :- بیٹا! زیادہ تعلیم کیا کرنی ہے۔ لڑکیوں کے لئے بس اتنی ہی تعلیم کافی ہے جس سے وہ مہذب، سلیقہ مند اور سگھڑ بیویاں بن سکیں۔ نوکری کرانا لازمی نہیں۔

امجد کو چچی کا خشک جواب سنکر بہت افسوس ہوا۔ اور اُداس سا چہرہ بنا کر واپس چلا آیا۔ امجد کا مطلب تھا کہ زاہدہ زیادہ تعلیم حاصل کرے۔ کیونکہ اس نے زاہدہ کے ساتھ شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ اور امجد کو سو فیصدی یقین بھی تھا کہ وہ ضرور اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگا۔ شاید اس لئے کہ چچا کو بہت عزیز تھا لیکن امجد نے اپنے دل کی بات کبھی کسی پر بھی ظاہر کی تھی۔ من کی من میں رہی۔

کچھ دنوں کے بعد زاہدہ کے لئے رشتہ کا پیغام آیا۔ شہر کا ہی کوئی نوجوان تھا۔ زاہدہ کی والدہ (سکینہ خانم) رضا مند ہو گئیں۔ جب اس بات کی خبر زاہدہ کو ہوئی تو اُس کی دنیا اندھیاری ہو گئی۔ کیونکہ وہ دل میں کچھ اور خیال لئے بیٹھی تھی۔ دوسرے روز امجد چچا کے گھر گیا۔ تو چاروں طرف اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا۔ چچی صاحبہ خاموش باورچی خانہ میں مصروف تھیں۔ امجد سہم گیا۔ چچی کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ ضرور کوئی بات ہے۔ اس کو زاہدہ نظر نہ آئی۔ پہلے ہمیشہ امجد کی راہ تکا کرتی تھی وہ امجد کے لئے دو منٹ بیٹھنا دو سال کے برابر تھا۔ چاروں طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا کیا۔ جیسے کوئی دیوانہ۔ شاہدہ صحن میں مشین لئے بیٹھی کپڑے سی رہی تھی۔ وہ دونوں کی محبت سے بخوبی واقف تھی۔ امجد نہایت خاموشی کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور متعجب ہو کر پوچھنے لگا۔

امجد :- شاہدہ! آج کیا بات ہے؟ گھر میں سخت پریشانی سی معلوم ہو رہی ہے۔

شاہدہ :- بھائی جان! کوئی بات نہیں ——

لیکن شاہدہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اپنی والدہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

اس جواب سے امجد کا دل دھڑکنے لگا۔ اور چچی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

امجد: چچی جان! خیر تو ہے آج چپ سی بیٹھی ہیں۔ کہیں چچا جان سے تو جھگڑا نہیں ہوا؟

چچی: نہیں بیٹا جھگڑا وگڑا تو نہیں ہوا۔ ویسے ہی۔ کھانا تیار کر رہی ہوں۔ دیر ہو گئی ہے۔ تمہارے چچا آ رہے ہوں گے کہیں آتے ہی گرم نہ ہو جائیں۔ آخر دفتر سے جو آنا ہوا۔ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔

اس کے بعد امجد کو دوسرا سوال کرنے کی گنجائش نہ رہی خاموش ہو گیا۔ زاہدہ کو نہ پانے سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ سارے مکان کو لرزتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور جب رہ نہ سکا تو شاہدہ سے پوچھا۔

امجد: شاہدہ! آج تمہاری آپا کہاں ہے؟

شاہدہ: کہیں اندر ہی ہوں گی۔

امجد: کیا ہو رہا ہے؟

شاہدہ: کون جانے۔ شاید لیٹ رہی ہو۔

شاہدہ امجد کا چہرہ دیکھ کر رحم سے بھر گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور سوال کے بہانے سے کہا۔

"بھائی جان! حساب کے ایک سوال کا جواب ٹھیک نہیں آتا۔ شاید شیخ محمد حسین کو غلطی لگی ہے یا میرا غلط ہے۔ ذرا مہربانی کر کے سمجھا دیجئے"۔

امجد: لاؤ میں دیکھتا ہوں کون غلط ہے۔ شاہدہ سلیٹ لے کر آتی ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل عبارت تھی۔

"آج شام کو زاہدہ آپا کی منگنی کی رسم ادا ہوگی۔ اس لئے وہ سخت غمگین ہو کر بستر پر پڑی ہے اور زار زار رو رہی ہے لیکن بدقسمتی یہ کہ والدہ نہایت سنگدلی سے کام لے رہی ہیں۔ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کرتیں۔ یہ دو دلوں کا خون ہو رہا ہے"۔

یہ پڑھ کر امجد کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرا اٹھا۔ دوسرے لمحے اپنے کو سنبھال کر سر آئی کی حالت میں واپس ہوا۔ گھر پہنچ کر بستر پر ایسے دراز ہوا کہ جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ دین و دنیا کی سدھ نہ رہی۔ والدہ نے شام کے کھانے پر اسے بلایا۔

والدہ: امجد بیٹا! آؤ میز پر کھانا تیار ہے

امجد: امی جان! آج میری طبیعت ناساز ہے میں نہیں کھاؤں گا۔

اسی طرح تین چار دن امجد بستر پر بیمار پڑا رہا۔ کالج بھی نہیں گیا۔ اس کی والدہ کو سخت فکر ہوئی کہ لڑکا بیمار ہو گیا ہے بڑی بہن سعیدہ کو بلا بھیجا۔ وہ بھائی کی خبر پوچھنے فوراً آئی اور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

سعیدہ: امجد کیا بات ہے تمہاری حالت اتنی جلدی دگرگوں کیوں ہو گئی ہے؟

امجد: آپا! کوئی بات نہیں ویسے طبیعت خراب ہے

سعیدہ: عزیزم! تمہاری حالت ظاہر کر رہی ہے چہرے کا پیلا پن بتا رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔

امجد: آپا۔ بخار اور سر درد رہتا ہے۔

سعیدہ: نہیں امجد میں یہ نہیں مان سکتی۔ آخر بات کیا ہے؟

بالآخر امجد بڑی آپا کے مجبور کرنے پر بے اختیار ہو کر بولا۔

امجد: آپا میری زاہدہ کھوئی جا رہی ہے۔ دنیا ہی چھینی جا رہی ہے کچھ اس کے بعد آنسوؤں کے موتیوں کی لڑیاں مسلسل جاری ہو کر بستر پر بچھ گئیں۔ کہنے لگا۔

امجد: آپا! آپ چچی سے پوچھیں تو سہی شاید مان جائیں۔

سعیدہ: (حیران ہو کر) چچی سے پوچھوں۔ کیسے پوچھوں۔ وہ ہرگز نہیں مانے گی۔

امجد: آپا! بھلا آپ ان سے بات تو کریں۔

سعیدہ: مجھے امید ہی نہیں تو بات کیسے کروں وہ تو بہت ضدی اور اکھڑ عورت ہے۔

سعیدہ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر بہت مغموم ہوئی اور بہت دیر تک اس معاملہ پر غور کرتی رہی۔ جب شام ہوئی تو اپنی خادمہ کو ساتھ لے کر چچی کے گھر جا پہنچی۔

سعیدہ: چچی جان، آداب۔

چچی نے دعا دی اور سعیدہ کا استقبال کیا۔ بہنیں بھی دیکھ کر خوش ہوئیں۔ سعیدہ، زاہدہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ نہایت کمزور ہو گئی تھی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

سعیدہ: چچی جان! زاہدہ کیوں اتنی کمزور اور زرد ہو گئی ہے؟

چچی:- زاہدہ کو کتنے ہی دنوں سے بخار آ رہا ہے۔ دوسرے کھاتی پیتی بھی تو کچھ نہیں۔

سعیدہ:- خدا خیر کرے۔ علاج کرنا چاہیئے۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں کافی رات گئے جب سعیدہ نے اجازت چاہی تو نہایت سنجیدہ سا چہرہ بنا کر کہا۔

سعیدہ:- چچی جان! ہاں مجھے یاد آیا۔ آپ سے ایک بات کہنی تھی۔

چچی:- بیٹی۔ کہو۔ کیا بات ہے؟

سعیدہ:- (جھجکتے ہوئے) چچی جان! کیا ہی مبارک بات ہو گر زاہدہ کا رشتہ امجد سے کر دیں۔ دونوں ماشاءاللہ ایک جیسے سمجھدار اور عقلمند ہیں خوش بھی رہیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

چچی:- (ناک بھوں چڑھا کر) بیٹی میں نے تو زاہدہ کا رشتہ کر دیا ہے اب کیسے ہو سکتا ہے؟

سعیدہ نہایت پریشانی کی حالت میں اپنا سا منہ لے کر گھر واپس آ گئی۔ امجد کو سارا حال سنایا۔ پر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری امید میں وسعت نہ ہوتی تو دنیا کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ آخر امید پر ہی تو دنیا قائم ہے اس نے اپنے آپ کو ڈھارس دی لیکن ہر وقت زاہدہ کے خیال میں مگن رہتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا اگر ایسی حالت رہی تو شاید امتحان سے رہ جاؤں۔ اگرچہ میدان محبت میں ہار چکا ہوں۔ لیکن دوسرے میدان میں میری جیت ہو گی۔ کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت دینا دانشمندی نہیں۔

چار ماہ کے بعد زاہدہ اور سلیم سلک ازدواج میں منسلک کر دیئے گئے۔ سلیم ایک معمولی کلرک تھا۔ صرف ایک مکان ہی تھا جس میں رہتے تھے باقی اور کوئی جائیداد نہ تھی اور نہ کوئی پونجی وغیرہ زاہدہ کے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ وہ بیچاری ہر وقت امجد کے خیال میں مستغرق رہتی۔ سسرال میں وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی خوش نہ ہوئی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی معلوم دیتی تھی۔ والدہ کی عقل اور اپنی قسمت پہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی۔

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

آمدنی کم۔ اخراجات زیادہ۔ سلیم کو وہی کچھ کرنا پڑا جس پر عام طور پر سرکاری ملازم مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور حادثہ یہ پیش آیا کہ سلیم پر ایک مقدمہ بنا اور موقوف ہو گیا۔ اب آپ زاہدہ کی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زاہدہ نہ ہی بلکہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور بیکاری کے افلاس سے سلیم کو بیماری نے آ دبوچا اور زاہدہ کو عین عالم شباب میں بیوہ چھوڑ کر چل بسا۔

زاہدہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ والدین کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ سب تقدیر کا کھیل سمجھ کر چپ ہو رہے لیکن زاہدہ کی اماں (سکینہ خانم) جسے اپنی عقل پر فخر تھا۔ اسی صدمہ سے اندھی ہو گئیں۔ اس وقت اپنی خودی میں آ کر کچھ سوچا نہ سمجھا۔ لیکن

(اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت)

ادھر امجد نے بی۔ اے فسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا اور والد نے ایم۔ اے کے لئے علیگڑھ بھیج دیا۔ لیکن اسکو اتنا کچھ ہونے کے باوجود پھر بھی زاہدہ کی یاد ستاتی تھی۔ اور اس کی حالت پر کڑھتا رہتا تھا امجد کے والدین بھی اس کی منگنی کرنے کو تلے ہوئے تھے جب نام لیتے تو صاف انکار کر دیتا۔ اور اپنے دلی ارادہ کو اور پختہ کر لیتا۔

جب دو سال کا کورس ختم کر کے گھر واپس آیا۔ تو لوگوں کی زبانی زاہدہ کا حال معلوم ہوا دل پر سخت چوٹ لگی۔ شہر کے رئیس گھروں سے رشتے آنے لگے لیکن امجد سب کو ٹال دیتا۔

بالآخر ایک دن اسے خیال ہوا چلو زاہدہ کو دیکھ آئیں اس کے سسرال والے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر میں ایک بچہ تک نہیں۔ ایک بے حس و حرکت مردہ سا جسم بستر پر پڑا ہے۔ پہلے سہم گیا۔ پھر کلیجہ کو

تھام کر آہستہ آہستہ اس کے سرہانے پہنچا۔ پہلے تو اس نے پہچانا نہیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد پہچانا تو حیران سی رہ گیا اس کو آواز دی۔

زاہدہ۔ زاہدہ!۔ زاہدہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو بے اختیار آنسوؤں کے دو قطرے آنکھوں سے نکلے اور زرد گالوں پر بہتے ہوئے تکئے میں جذب ہو گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں بولنے کی ہمت نہ رہی تھی۔

امجد نے پھر بلایا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔

امجد:۔ زاہدہ جان! ذرا آنکھیں کھولو۔

زاہدہ:۔ (آہستہ سے آنکھیں کھول کر اور دھیمی آواز سے) اوہ آپ امجد ہیں۔ میں آپ کو پہچان نہ سکی۔ اُف میرے خدا۔

امجد زاہدہ کو اس حالت میں دیکھ کر سخت افسردہ ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور بے قرار ہو کر بولا۔

امجد:۔ زاہدہ! ہاں میں امجد ہوں۔ اور تجھے دیکھنے آیا ہوں۔ ذرا ہوش میں آؤ۔ زاہدہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہلکی سی مسکرائی پھر آہستہ آہستہ سہارا لے کر اٹھی اور کہنے لگی۔

زاہدہ:۔ امجد! میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ مجھے پوچھنے آتے شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتی کیونکہ آپ کی پرستار اور قصوروار ہوں۔

امجد:۔ زاہدہ جان! میں نے تم کو فراموش نہیں کیا۔ یہ محبت کا دستور نہیں۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے؛ یہ والدین کی مہربانی ہے۔

زاہدہ:۔ (سرد آہ بھر کر) امجد! یہ والدہ کی عقل کا نتیجہ ہے جس کا خمیازہ میں بھگت رہی ہوں۔ اچھا میرے مقدر میں ایسا ہی لکھا تھا۔ میں آپ کو دیکھ کر از حد خوش ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد زاہدہ کے درد بھرے الفاظ سنکر خاموش ہو گیا۔ اور دلی ارادے کو پورا کرنے پر تُل گیا۔ چنانچہ زاہدہ کا علاج شروع ہوا اور وہ اس میں بڑی دلچسپی لینے لگا۔ خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

نتیجتاً زاہدہ کی حالت روز بروز اچھی ہوتی گئی۔

ادھر امجد کے والدین اس کی شادی کرنے پر تیار ہو گئے لیکن وہ ٹال مٹول کرتا رہا اور والدین کو معلوم ہو گیا۔ کہ اب بھی امجد کا خیال زاہدہ کی طرف ہے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی کہ اتنا تعلیم یافتہ ہو کر بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کئی اچھے اچھے رشتے آرہے ہیں۔ بہنوں نے بہت شکوہ کیا۔ سب گھر والوں نے سمجھایا مگر امجد کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اسے تو اپنا ارادہ پورا کرنا تھا۔ جوں جوں گھر والے سمجھاتے اسی تناسب سے وہ اپنے دلی ارادے کو پختہ کرتا۔ جب زاہدہ بالکل صحتیاب ہو گئی اور اس کے والدین کو معلوم ہوا تو وہ بہت ممنون ہوئے

امجد نے ایک دن اپنے والدین کو صاف صاف دلی ارادے سے آگاہ کر دیا۔ والدین کو لڑکے کی عقل پر سخت افسوس ہوا۔ برا بھلا کہنے لگے۔ لیکن آفرین ہے امجد پر۔ کہ ہٹ دھرمی سے کام لیا اور زاہدہ سے شادی کر لی۔ کیا وفا اسی کا نام ہے؟

آئندہ شمارہ کی جھلک

محمد ہمتر (نور الٰہی) ——— آج عید ہے
دیا کرشن گردش ——— ٹراجن کا محاصرہ
نرگس ——— سندلیہ
ایم۔ اے عزیز ——— نوشتۂ تقدیر
عشرت کاشمیری ——— تشنۂ تکمیل
طالب گورگانی ——— شیاما
عبد العزیز علائی ——— ووٹ
حمید نظامی ——— این۔ پولین کا خواب
رام لعل مہتہ ——— نئی دنیا
عمر حزیں ——— پھر وہی
گلزار احمد فدا ——— اردو فن تنقید

رعنا نظامی

یادِ ایّام

یادم نمی کنی وز یادم نمی روی
عمرت دراز باد فراموشگار من

اے کہ تمہاری یاد اب بھی تسکینِ قلب و روح ہے۔
تم سے جدا ہوئے بارہ برس بیت چکے ——— آہ! جدائی کے ایک کم نہ دو، پورے بارہ برس۔ طویل بارہ برس ——— بارہ برس نہیں۔ بارہ صدیاں۔

جدائی کا ایک ایک پل ایک ایک صدی سے کم نہیں ہوتا اور یہاں پورے بارہ برس بیت گئے۔ پھر بھی تمہاری موہنی صورت آنکھوں تلے پھرتی رہتی ہے۔

۱۹۳۱ء کی تحریکِ کشمیر کا وہ دورِ پُر آشوب ———

میری بیکاری کا روح فرسا زمانہ ——— میرا گھر سے فرار اور جموں میں تمہارے ہاں قیام۔

جموں کے مسلمانوں کا جوشِ ملی ——— احرار کی سرفروشانہ سرگرمیاں ——— کشمیر اور جموں کے فرقہ وارانہ فسادات۔ قتل و خون۔ پکڑ دھکڑ۔ لوٹ مار ——— ——— مگر میں اور تم

دل ہلا دینے والے ان تمام واقعات و حوادث سے بے نیاز اور بے پروا اپنے عشق و محبت کی طویل و عریض دنیا میں ——— تمام کائنات پہ چھائے ہوئے، مستقبل ——— تاریک مستقبل سے بے خبر شاہراہِ زندگی طے کرتے چلے جا رہے تھے۔

آہ! لیل و نہارِ شباب!!

ساغر کی تحریک سول نافرمانی ناکام ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم منافقات کی آگ ریاست بھر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ دور دراز مقامات سے خونریزی و غارت گری کی دہشتناک خبریں موصول ہو رہی تھیں

جموں شہر پر فوج ——— گورہ فوج کا قبضہ تھا۔ تمام شہر پر مسٹر جنکنس آئی۔ سی۔ ایس کا کنٹرول تھا۔ دن کے وقت چار یا چار سے زیادہ اشخاص کا ایک جگہ جمع ہونا یا اکٹھے مل کر چلنا حکماً ممنوع تھا۔ شام کے آٹھ بجے سے لے کر طلوعِ آفتاب تک لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر میں اور تم چاندنی اور تاریک شاموں میں توی کے فردوس نظر ساحل پر پہاڑیوں کے جھنڈ میں مصروفِ گلگشت رہا کرتے تھے۔ آدھی آدھی رات تک مہتاب کے ٹھنڈے سائے میں۔ برقی قمقموں کی روشنی میں ——— تاروں کی شبنمی فضا میں ریزیڈنسی۔ اور ضلع کچہری کی سڑک پہ ٹہلا کرتے تھے کہ فیو آرڈر کا نفاذ اور مسٹر جنکنس کے گورہ شاہی احکام ہم پر مطلقاً اثر انداز نہ تھے۔

ایک مرتبہ تم یکایک آدھی رات کو جاگ پڑی تھیں۔ تم نے مجھے اپنے چہرے پہ جھکے ہوئے۔ اپنے بکھرے ہوئے سیاہ لانبے بالوں اور ان میں قرینے سے ٹنکے ہوئے موتئے کے پھولوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ تم نے بالوں کو چہرے پر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر میرے منہ سے

ع رلفیں بالوں کی لٹ چہرے پہ آنے دیجئے
جمع ہونے دیجئے شام و سحر میرے لئے

سن کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئی تھیں۔
"کب سے جاگ رہے ہو" تم نے کسی قدر سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔

اور میں نے جواب دیا تھا "میں سوتا ہی کب ہوں"
سامنے دیوار میں ٹنگا ہوا کلاک تین بجا رہا تھا۔ یہی ہماری سیر کا وقت تھا۔ ہم دونوں گھر سے نکل کر کنک منڈی بگھوناتھ

بازاراور ریزیڈنسی روڈ پر سے ہوتے ہوئے ریزیڈنسی گیٹ پر جا کر رک گئے۔ اور تم نے وہاں کہا تھا۔

"کاش یہ سڑک اسی طرح ناک کی سیدھ میں آگے ہی آگے چلی جاتی ——— افق تک۔ دور وہاں تک جہاں وہ ستارے نظر آ رہے ہیں ...."

"اور ہم دونوں اس پہ چلتے رہتے ——— چلتے ہی رہتے"!

میں نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا تھا۔

اور تم ایک سرد آہ بھر کر چپ ہو گئی تھیں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔

اسی وقت قریب سے ایک ادھیڑ عمر کا تانگہ بان میٹھے سروں میں

من کے ہارے ہار ہے

پیارے۔ من کے جیتے جیت

گاتا ہوا گذرا۔ تو تم نے میرے بازو میں چٹکی لی تھی۔ اور پھر آہستہ سے میرے کان میں کہا تھا۔

"من کے جیتے جیت"۔

اور میں نے جواب دیا تھا۔ "مگر میں تو من کی بازی ہار چکا ہوں" اب میری آنکھیں بھی اشک آلود ہو چکی تھیں۔

سوچتا ہوں کہ اس وقت میں نے کتنی سچی بات کہہ دی تھی۔

جیسا کہ شروع میں جہاں جموں سے اس پار ——— پنجاب ں آگ کے شعلے برسا کرتے ہیں۔ لو چلتی ہے۔ کڑکڑاتی دھوپ تنفس کو جلا ڈالتی ہے۔ وہاں جموں رنگینیوں کا مرقع بن جاتا ہے م کو بازاروں اور تفریح گاہوں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے رطرف چہل پہل۔ ہر طرف بھیڑ بھاڑ۔ برقی لیمپوں کی فراوانی نارو سماں باندھ دیتی ہے۔ ہر حصہ ملک کے لوگ یہاں ملتے ہیں اور چھوٹا سا کوہستانی شہر شمالی ہندوستان کا سوئٹرز لینڈ بن جاتا ہے۔ جموں کا موتیا پھول بہت مشہور ہے۔ مالی اس کے ہار گوندھ ہزاروں کی تعداد میں ہر روز شام کے وقت بازاروں میں بیچتے ں ساس کی بھینی بھینی خوشبو دماغ و روح کو مستی سے بھر دیا کرتی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ موتیے کے ہار تمہیں بہت مرغوب ہیں۔ اسی لئے میں ہر شام کو ایک ہار تمہاری خاطر بازار سے لاتا۔ اور اپنے ہاتھوں تمہارے گلے میں ڈالا کرتا تھا۔

"کہیں یہ ہار سچ مچ گلے کا ہار نہ ہو جائیں"، تم اکثر کہا کرتی تھیں

تمہاری ایک سہیلی ——— حسین دیر ہی جمال ——— ——— ایک نوخیز اور البڑ دوشیزہ

کیا نام تھا اس کا۔ ذہن سے محو ہو گیا ——— ——— استانی۔ شاید حکومت سے تبدیل ہو کر جموں آئی۔ تمہیں بھی ملنے آئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تم اس وقت اپنے سنگار کے کمرے میں اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں باہر سے آیا۔ سیدھا تمہارے سنگار کے کمرے کی طرف گیا۔ سیڑھیوں پہ چڑھتے ہوئے میرے جوتوں کی آہٹ سنکر شاید اس نے تم سے پوچھا۔

"کون ہے"؟

اور تم نے دروازہ سے جھانک کر مجھے دیکھا اور بے پروایانہ انداز سے کہا۔

"اوہو! آجاؤ"

میں اندر داخل ہوا۔ تو تمہاری سہیلی نے لمبا سا گھونگٹ نکال لیا تھا۔ مگر تم اس کے ساتھ میرا تعارف کراتے ہوئے بولیں۔

"بہن۔ یہ میرے دوست ہیں ——— بے حد قابل قدر انسان۔ اور بے حد قابل اعتماد رفیق، نامور ادیب اور شاعر ——— تمہیں ان سے تو پردہ کم کرنا چاہیئے"

اور تمہاری سہیلی نے۔

"پیاری بہن۔ میں تمہیں رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی" کہہ کر گھونگٹ الٹ دیا۔ اور ایک خالی کرسی پاس کھینچ کر مجھے اس پہ بیٹھ جانے کو کہا تھا۔

یکایک تمہیں مذاق سوجھا۔ اور تم مجھے کہنے لگیں

"شاعر۔ تمہارے دوستوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا مولو

شافہ بھی ایک پردہ نشین دوست کا۔ مگر تم سے کوئی پردہ نہیں رہا۔ رسمِ رونمائی ہو چکی۔ اب ذرا کچھ کھلائیے پلائیے۔

اور میں بازار سے برف میں لگی ہوئی لیمونیڈ کی بوتلیں اور مٹھائی لایا۔ ہم کھاتے پیتے اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔

مگر آج ——— پورے بارہ برس بعد

——— میں ہوں اور ہجومِ مصائب اور کشمکشِ روزگار۔ سب شاعری اور رعنائی بھول چکا ہوں۔ فکرِ معاش سر کھجلانے کی فرصت نہیں دیتی۔ جنگ کی ہیبت ناکیاں ——— اناج اور کپڑے کا قحط جان کھائے جا رہے ہیں۔ دفتر کی نوکری ہے۔ قلیل سی تنخواہ ملتی ہے۔ اور آٹھ روپے ماہانہ قحط الاؤنس۔ مگر وہ بھی پندرہ مہینوں سے بند ہے۔ افسر کی جھاڑیں الگ ہیں۔

دل کے بہلانے کے لئے کبھی کبھی انس، کی جنت نظیر وادی میں آنکلتا ہوں۔ بلند۔ سرسبز اور رنگ و بو سے مملو پہاڑوں کے دامن میں۔ چکڑی کے دل آویز جھنڈ دل میں دیوانہ وار چرنے لگتا ہوں۔ حیاتِ شعری کی تکمیل کی کوشش کرتا ہوں ——— تمہاری تصویر کو جو دل کے آئینے میں جڑی ہے۔ تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اور پکار اٹھتا ہوں ؎

بسر ہوئی تھی ترے ساتھ زندگی کچھ دن
پھر اس کے بعد مزا زندگی کا آ نہ سکا

(دبی دبی چیخیں صفحہ ۴۴ سے آگے) اٹھا۔ دفعتاً مالی کو کھٹکا ہوا۔ مبادا اس کے چمن کو نقصان پہنچے۔ طرح طرح کی اذیت پہنچانے لگا۔ دل دکھانے لگا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ پنچھی اس سے متنفر ہو جائیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے حتی الوسع رسوا و بدنام کیا لیکن وہ جگر پر پتھر رکھ کر برداشت کرتی رہی۔ آخر اس نے حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک طرف چل کھڑی ہوئی بے وسیلہ اور بے سہارا۔ اس نے ان ہی سے جو اس نے اپنے دامن میں خوشی کے حسین موتی اکٹھے کئے تھے سب زمین پر بکھر گئے اب پھر وہ تہی دامن تھی، بے یار و مددگار۔ پنچھی اس کی جدائی سے اداس اور افسردہ ہو گئے اور ایک طرح کی تکلیف دہ بے چینی محسوس کرنے لگے۔ مالی کی کوششیں پوری ہوئیں۔ اور اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوا۔ لیکن وہ حرماں نصیب اپنی بے بسی پر خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ مالی اسے چمن سے نکال دیا مگر پنچھیوں کے دل سے نہ نکال سکا ——— دور بہت دور ——— چمن اور پنچھیوں سے دور اس نے ایک غیر آباد جگہ میں ایک جھونپڑی بنالی جہاں وہ اپنی زندگی کے تلخ ایام گذارنے لگی۔ پنچھیوں کی یاد اس کے لئے تسکینِ جان تھی۔ باد صبا کو اس کی کس مپرسی پر رحم آتا تو وہ پنچھیوں کے دیس سے ہو کر آتی۔ پیام رساں بن کر حوصلہ افزائی کرتی۔ محبت بھرا اور دلپذیر پیام الفت پا کر اس کی روح زندہ ہو جاتی۔ وہ مسرور تھی کہ پنچھی اسے بھولے نہیں بلکہ بہت جلد آ کر ملیں گے۔ جب رات کی تاریکی میں دنیا والوں کی نگاہیں بند ہو جاتیں تو وہ تاروں کے جھرمٹ میں ان کی پیاری پیاری صورتیں دیکھتی۔ ہنس مکھ صورتیں۔ حیات بخش صورتیں ——— مگر بہت دور آکاش کے دوسرے کنارے پر ایک بداعتمادی اور بے اعتباری کی گھٹا اٹھی۔ یقین و محبت پر بجلی گری۔ چنگاریاں اٹھیں۔ فضا شعلوں سے بھڑک اٹھی۔ پنچھیوں کے آشیانے ڈگمگائے۔ وہ ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ باد صبا چمن سے ہو کر آئی۔ سوختہ جیسی تھی جب معلوم دیکھتے ہی غیر یقینی سے بھک بھک کر جلنے لگی لیکن جلسی گئی۔ کیونکہ آج وہ بھڑکتے شعلوں میں پھینک دی گئی تھی۔ خوشیوں نے سر پیٹ لیا۔ لوگ حیرتیں منہ تکنے لگیں۔ آرزو کی جگہ جگہ پھٹ گئی اور امیدیں... اس نے پُر نم نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ پنچھیوں کی ایک چیز تھی کیونکہ پنچھیوں کی زندگی کا سہارا ہونیوالا ایک اہم حصہ بن چکی تھی ——— وہ پھر ان کے پاس پہنچی۔ لیکن اب وہ دوسرے چمن میں رہنے لگی۔ پنچھیوں کیلئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان کی زندگی کی لوح ان کی دوسرے کے ہاں رہے لیکن مالی سے ڈرتے تھے۔ تاہم چپکے چپکے مالی کی نظریں بچا کر اسکو ملنے کے لیے بہانے میٹھی میٹھی مگر پابندی میں باتیں ہوتیں۔ اور واپس چلے آتے۔ ایک دن مالی نے دیکھ لیا بس پھر کیا تھا۔ گھر میں آگ لگا دی اور پنچھی مجبور ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے مالی ان کو منع کرے اسکے بعد وہ اسے الگ پابندیوں میں رکھیں لیکن ان کی روحیں آپس میں مل چکی ہیں اور محبت کا ناتا گہرا ہو چکا ہے۔ وہ زندگی بھر اب جدا نہیں ہو سکیں اور ایک وقت آئیگا۔ جب سچ کی جیت ہوگی۔ اس وقت وہ پھر افسردہ اور غمگین ہے لیکن اسے مستقبل درخشاں دکھائی دے رہا ہے اور جانتی ہے کہ ایثار، قربانی اور صداقت کے طفیل ایک دن دنیا اس کے قدم چومے گی۔ اور پنچھی اس کو گدگدائیں گے۔ ہنسائیں گے اور قہقہے لگائیں گے

ا۔ محجوبہ

دبی دبی چیخیں

وہ بڑی دکھیا اور غم نصیب تھی۔ دنیا نے اس کی قدر نہ کی ہیرے کی چمک سے پہلے ہی اسے مٹی میں ملا دیا۔ وہ دل برداشتہ ہو گئی اور کسی نامعلوم مقام کی طرف چل دی افسردہ اور ملول چلی جا رہی تھی وہ ہر طرح کی مصیبت برداشت کرنے کے لئے کمربستہ انتہائی بے سروسامانی اور بےچارگی کے باوجود اس کی خوداعتمادی اور جی داری میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ رات بڑی بھیانک اور تاریک تھی سنسان جنگل۔ لیکن وہ چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنی زندگی سے اتنی محبت نہ رہی تھی۔ حالانکہ اس میں وہ صلاحیتیں اور جانبیتیں تھیں کہ بادرد شاید کسی دوسرے کو میسر آئی ہوں۔ کرب و اضطراب کے بھنور میں الجھی ہوئی موت کی راہ دیکھ رہی تھی تشنۂ تکمیل ارمان اس کی بےکلی میں اضافہ کرتے۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئی سہانی ہوا کے لطیف جھونکوں نے اُسے نیند کی آغوش کے سپرد کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چاند میں بیٹھی ہوئی اپنے پیا کا انتظار کر رہی ہے سکھیاں اسے چھیڑ رہی ہیں مدھ بھرے اور رسیلے گیت گائے جا رہے ہیں موسم اپنے جوبن پہ ہے اتنے میں اس کے پیا آ جاتے ہیں۔ ایک خوبصورت اور نوجوان حسینہ کو ساتھ لئے مسکراتے اور پیار کی باتیں کرتے۔ وہ خوش ہوتی ہے اور سواگت کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دیتی ہے مگر آنے والی حسینہ کی کڑوی اور تلخ باتیں اس کا دل زخمی کر دیتی ہیں۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کے پیا نے حسینہ کی باتوں کو خوشی سے سنا۔ اور خاموش ہو گئے تو اس کے کلیجہ سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر وہی جنگل اور تاریکی۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے دور سے روشنی دکھائی دی۔ اس کے قدم جلدی جلدی اٹھنے لگے قریب پہنچی۔ تو دیکھا پھولوں سے مہکا ہوا ایک پُربہار چمن ہے بادِ صبا اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کیف و سرور کے موتی بکھیر رہی ہے اور دو پنچھی۔ سہانے اور پیارے پنچھی اپنے سریلے سُروں سے چمن کی زینت بڑھا رہے ہیں وہ ٹھٹک گئی اور دل ہی دل میں تعریف کی۔ آگے بڑھی پھر رک گئی۔ مبادا پنچھی غیرجنس سمجھ کر اڑ جائیں۔ ان کے ترنم میں مداخلت کر کے ان کی معصوم خوشیوں کو پامال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں وہ ان کے چہچہوں اور قہقہوں میں خود کو تحلیل کر دینا چاہتی تھی تاکہ سراپا مسرت بن جائے مصیبت کی ماری دکھیاری۔ آہستہ آہستہ ان کے پاس پہنچی پنچھی ڈرے نہیں۔ شاید انہوں نے دکھیاری کے دکھ کو بھانپ لیا تھا۔ بلکہ وہ بہلانے اور مسکرانے کے لئے اس کے قریب آئے پھر آنے جانے لگے۔ ان کا ننھا دل دھڑکا۔ انہوں نے قریب ہو کر دکھیا کے دل کی دھڑکن سنی اور تہیہ کر لیا کہ اس کے تمام دکھ دور کر کے رہیں گے تب وہ بہلانے لگے اور موسم بھر میں فضا خوشیوں اور مسرتوں سے معمور ہو گئی۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔ اس کی خاموش اور پرسوز زندگی میں خوشی کا ایک اچھوتا تموج پیدا ہوا اور پنچھیوں سے اسے روحانی لگاؤ اور جذباتی ربط ہو گیا اس نے یہ محسوس کیا کہ دہر میں اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ بلکہ دو ننھی ننھی زندگیاں اسے اپنا رہی ہیں۔ یہ جان کر وہ بہت محظوظ ہوئی۔ جب چاند کی دلربا روشنی اپنی آب و تاب کے ساتھ کائنات کے ذرہ ذرہ کو منور کر دیتی اور بھولے بھالے پنچھی اپنے آشیانے میں آرام کرتے تو چھٹکی ہوئی چاندنی میں وہ ان کے لئے پھول چنا کرتی۔ پھول . . . عقیدت کے پھول محبت کے پھول . . . . پھولوں سے گھونسلوں کی تزئین و آرائش دیکھ کر وہ خوشی میں لہرانے لگے۔ چہک چہک کر اس کے پاس آتے میٹھی میٹھی تسلی بخش باتیں کرتے درد بھری پریم کہانیاں چھیڑتی اور ساری ساری رات رومان کے آغوش میں بیٹھے چپکے چپکے سنا کرتے وہ بھی ننھی ان کی میٹھی اور روح نواز باتوں سے لطف اندوز ہوتی وہ گنگنانے۔ چہچہاتے اور مذاق کرتے ہوئے پھر سے اڑ جاتے اور دور دور کے ملکوں کی خبریں لاتے۔ دن گذرتے گئے۔ محبت کی عمیق گہرائیوں میں ان کی روحیں جگمگانے لگیں سچا خلوص ان کی گود میں اتر آیا۔ مسرتیں بلائیں لیتیں۔ خوشیاں منہ چومتی اب زندگی کو زندگی مل گئی تھی —— وہ بے نور زندگی کے تلخ ایام بھول گئی۔ یکسر تازہ روح ابھر آئی۔ خوشی سے اس کی زندگی کا رواں رواں جگمگا

(باقی صفحہ ... پر)



علمی ادبی اور اخلاقی
ماہنامہ
اکتوبر ۱۹۴۵ء
مطبعہ جاند ممواہ / اکش

ایڈیٹرز
گلزار احمد فدا۔ ادیب فاضل
اقبال تمنائی
زر سالانہ۔ پانچ روپے

رسالہ "پریم" جموں
اکتوبر ۱۹۴۵ء
جلد نمبر ۳ ——— شمارہ نمبر ۲

لاہور آفس
گوروارجن نگر لاہور
مہتمم:۔ ناگر مل مہاجن
فی پرچہ:۔ آٹھ آنے

پریم رس

(دیوان گیان چند پرنٹر پبلشر نے دیوانز پریس جموں سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "پریم" جموں سے شائع کیا۔)

پریم کہانی

ادارہ

ریاستی لکھنے والوں کا برطانوی ہند سے متعارف کرانے میں جو کام "پریم" نے کیا ہے۔ وہ لاریب ناقابلِ فراموش ہے۔ لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ "پریم" کو اپنی مختصر عمر میں جس شدومد اور دلچسپی کا اظہار غیر ریاستی اہلِ ذوق نے کیا ہے۔ اس کا عشرِ عشیر بھی ریاستی شائقین کے حصے میں نہیں آیا یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے نصب العین میں چندے ترمیم کرنا پڑی ہے۔ اور اسی ترمیم کا یہ حسین نتیجہ ہے کہ زیر نظر شمارہ بڑے کام کی چیز ہے اور آپ یقین کریں کہ آیندہ پریم کا ہر پرچہ اپنے گوناگوں محاسن کے اعتبار سے اس درجہ متنوع ہو گا۔ کہ آپ فخر سے جھوم اٹھیں گے۔ "پریم" کا رنگین ٹائیٹل تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اس ماہ سے اس کی ضخامت میں بھی قابلِ قدر اضافہ کر دیا ہے جس سے سرپرست ہونیوالے ادب پاروں کی تعداد یقیناً بڑھ جائیگی۔ — علامہ کیفی دہلوی، حضرت اثر عسکری، آغا محمد باقر دہلوی، جناب محمود رازی، مسٹر رام لال مہتہ، آفتاب ملک اور خلیل انور ہمارے نئے کرم فرما ہیں۔ کہ جن کے التفات کو "پریم" ہمیشہ محترم سمجھے گا — اب شروع سے چلئے عزیز کاشی کی "تلخیاں" ہر چند بظاہر تلخ ہیں۔ پر حقیقتاً شیریں۔ اور اس شیرینی سے کچھ صلح کل طبیعتیں ہی لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ علامہ موصوف کا "نیا، پرانا ادب" ایک بصیرت افروز علمی، ادبی اور تنقیدی مقالہ ہے جسے تعریف کی ضرورت نہیں بلکہ توجہ کی احتیاج۔ آغا محمد باقر دہلوی کا "راحت کدہ" جناب اثر صہبائی کے مختصر مجموعہ کلام پر معلوماتی تبصرہ ہے۔ جناب عشرت کاشمیری کا "تشنۂ تکمیل" اب کے تکمیل پا چکا ہے طنز سے ان کی طبیعت کو اگرچہ خاص مناسبت ہے۔ تاہم یہ رومان خیز بھی ہے۔ اور تشنۂ تکمیل رومان اور طنز کا مکمل مرقع ہے۔ جناب نرگس کا "سندیسہ" ان کا اپنا سندیسہ نہیں، بلکہ یہ سندیسہ ہے ایک دکھیاری، بیاکل اور شوہر پرست بیوی کا کہ جس کے پیا پردیس اُٹھ گئے .... لیکن یہی "سندیسہ" اس شدید نقصان کی طرف براہِ راست اشارہ بھی ہے جو ہمارے معاشی، اقتصادی اور سماجی نظام کی گرتی ہوئی عمارتوں سے انسانیت کو پہنچ رہا ہے۔ اور اسی نام سے جناب نرگس کی ایک تازہ تصنیف بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ جناب بملا گپت کی "یاد" واقعی یاد رکھنے کے قابل ہے اور جناب ایم۔ اے۔ عزیز کا اخلاقی ڈرامہ "نوشتۂ تقدیر" ایک مہذب اور شریف خاندان کی داخلی تصویر ہے جس میں بے پناہ سبق اور عبرت ہے۔ محترمہ مجوبہ نے اپنی روش سے ہٹ کر ایک خطوط لکھے ہیں جنمیں رومان، دلکشی اور جاذبیت کیساتھ معاشرتی اور سماجی پھوڑے کا تعفن بھی ہے کہ جسے مجوبہ نے بڑی دلیری سے کریدا ہے۔ جناب محمود رازی ایک کامیاب افسانہ نویس، شاعر اور مترجم ہیں۔ انکی دو چیزیں "سپاہی کی دلہن" اور "بیٹیا کی" بیک وقت پریم کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ محمود صاحب ہم سے دور ہیں۔ لیکن دوری کے باوجود آپ ہمارے ادارے کے ایک رکن ہیں۔ جناب عمر حزیں کا "پھر وہی" دنیاوی تفکرات میں مبتلا ایک نوجوان کی ذہنی کشمکش کا خوبصورت نقشہ ہے۔ جسمیں اگر زندگی سے فرار کی در پردہ تلقین نہ ہوتی تو اس "نقشے" کی خوبصورتی بیان سے باہر ہوتی۔ مسٹر رام لال مہتہ آپکو نئی دنیا کی سیر کرا رہے ہیں اور آپ کولمبس کی طرح اس دنیا میں ایک ایسی نئی دنیا معلوم کرینگے کہ جس سے "نئی دنیا کی نئی دنیا" بن جائیگی۔ صاحبزادہ محمد عمر (نورالٰہی) کا ڈرامہ "آج عید ہے" جہاں خندہ خیز ہے وہاں لطف ریز بھی۔ اور تحریر کی تازگی اس پر مستزاد۔ حضرت کوثر سیمابی کی "سلوٹیں" ایک دوشیزہ کو اٹھتی جوانی اور بہکے جوبن کا احساس دلاتی ہیں اور یہ احساس بجائے خود ایک مزیدار چیز ہے لیکن سوسائٹی پر ایک زبردست چوٹ بھی ہے جو آپکو بستر کی سلوٹوں میں لیٹی ہوئی نظر آئیگی۔ جناب محمد بشیر کا ادبی شاہپارہ "اردو نثر کی تدریجی ترقی" ایک تحقیقی مضمون ہے۔ جس سے آپ کی ادبی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ — منظومات کی فہرست میں اب کے بڑے بڑے سخن طراز موجود ہیں۔ مثلاً اختر لکھنوی، اثر عسکری، گلشن بیمیلوری، اخگر عسکری، کیفی، اسرار الحق محمود رازی۔ رعنا نظامی۔ آفتاب ملک اور خلیل انور کہ جن کے کلام بلاغت نظام سے "پریم" نہال ہو رہا ہے !!

عزیز کاشش

تلخیاں

میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر وہ کونسے وجوہ ہیں جو ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو ہوا دیتے ہیں تاکہ افق حیات پر چھائے ہوئے نگوں بختی کے بادل کبھی نہ چھٹ سکیں۔ ہمارے ذہن مفلوج، ہمارے قویٰ مضمحل، ہمارے حوصلے پست اور ہماری ذہنیتیں تاریک رہیں اور تاریکی ہی ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن جائے۔ روشنی کبھی دکھائی نہ دے۔ اور ہم اندھیرے میں ہی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ منزل پر پہنچنا ہمارے نصیبوں میں نہ ہو۔ ترقی پسند اور خوش نصیب قوموں کی صف میں کھڑے ہونیکا کبھی موقع نہ ملے۔ اور تالاب کے مینڈک کی طرح محدود وسعتوں پر قناعت کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھیں ـــــ لیکن اکثر سوچنے کے باوجود مجھے اطمینان میسر نہ ہوا۔ اور ان وجوہ کو معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا ـــــ جب دیکھتا ہوں کہ موسم سرما کی روپہلی صبح کو طلوع ہونیوالا آفتاب ساری کائنات کو اپنی تمازت سے ایک طرح کی آسودگی اور حرارت بخشتا ہے۔ تو وہ سرمایہ دار کے عالیشان بنگلے کو ایک مزدور کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے پر ترجیح نہیں دیتا۔ نہ ہی وہ ہندو اور مسلمان، کالے اور گورے۔ اچھے اور بُرے کی تمیز کرتا ہے۔ بلکہ مساواتی اصول کے تحت یکساں طور پر سب کو چمک، حرارت اور روشنی سے بہرہ اندوز ہونیکا موقع دیتا ہے ـــــ تو میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ کہ کائنات کا ہر ہر ذرہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے لیکن یہ "اشرف المخلوقات" ہے کہ "شرفِ باطل" کے زعم میں درسِ عبرت سے عمداً گریز کر رہا ہے۔ اور جانے کب تک کرتا رہے۔

ـــــ مگر اب میں باہمی تنفر اور تفاوت پیدا کرنیوالے اسباب کو سوچنے کی بجائے یہ سوچتا ہوں کہ ہمارا "ادب" اگر ہمیں اتحاد و اتفاق کے ایک سنگم پر کھڑا نہیں کرسکتا۔ بھٹکے ہوؤں کو صحیح راہ نہیں دکھا سکتا۔ ہماری اصلاح نہیں کرسکتا، ہمیں بے داغ، اجلی اور نکھری ہوئی زندگی عطا نہیں کرسکتا تو ہمارا "ادب" کچھ بھی نہیں۔ دھوکہ اور فریب! اور ہمارے ادیب پہلے درجے کے فریبی اور عاقبت نااندیش، ذہنی عیاش اور تخیلی فاسق، ریت کے محل بنانے مورکھ کہ جنہیں اپنے مآل کی کوئی خبر نہیں۔ ادب سے تعمیری اور افادی کام لینے کی بجائے ایسے کام لے رہے ہیں جن سے بغض و عناد اور حسد و جلن کی آگ بھڑک رہی ہے...... رکیک جذبات اور سفلی اغراض کی تکمیل کے لئے انہوں نے ادب کو آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ الزام تراشی اور اتہام بازی ہو رہی ہے۔ ایک دوسرے کو بدنام اور ذلیل کیا جا رہا ہے۔ اور ادب کے پردے میں بے ادبی کر وہ وہ ہاتھ دکھا رہے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔ نہ اپنی عزت دیکھتے ہیں نہ دوسروں کی۔ اور جھٹ پگڑی اچھال دیتے ہیں ـــــ ان حالوں کون ہوشمند ہے جو یہ کہے کہ ہمارا ادب اور ہمارے ادیب، مجبور و بےبس زندگی کیلئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہمارے پاؤں میں جو بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ انکو توڑنے کی کوشش کرسکتے ہیں یا فرقہ وارانہ منافرت باہمی تنفر اور آپس دشمنی کے جھگڑے مٹا کر یہ کہیں کہ آؤ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں۔ اور بلکہ وہ کام کریں جس سے ہندوستانیوں کی زندگی مجبور نہ رہے۔ زنجیریں ٹوٹ جائیں تاریکی دور ہو جائے اور اطمینان کا چمکتا ہوا چاند اپنی پرکیف چاندنی سے ہماری روحیں منور کردے۔ زندہ اور باعمل قوموں کی صف میں ہم بھی کھڑے ہوسکیں۔ اور فخر سے کہہ سکیں کہ ہم بھی زندہ ہیں۔ اور اسلئے زندہ ہیں کہ ہمیں اتحاد و اتفاق کا وہ دھارا مل گیا ہے جس نے ہمارے دلوں کی کدورتوں، دشمنیوں اور رنجشوں کو یکسر دھو ڈالا ہے۔ لیکن یہ تو ایک سہانا اور سنہرا خواب ہے۔ جو شاید کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو۔ تو ہم ملکر یہ سوچیں کہ اس خواب کو حقیقت کیونکر بنا سکیں گے؟ اور وہ کونسے ذرائع اور وسائل ہیں جن کے حصول پر ہماری مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ہمارے ادب کی بقا ان مشکلوں کی آسانی میں مضمر ہے ؎

کشن سمیلپوری

افکارِ تازہ

اک عمر کے آزار کو سہہ کر گئے ہوتے
اے کاش! لڑکپن ہی میں ہم مر گئے ہوتے

ایسا تو نہ غم دیتی ترے عشق کی بازی
آغاز میں گر ہار کا دم بھر گئے ہوتے

گر تیری جفاؤں کا وہاں ذکر نہ چھڑتا
ہم سامنے داور کے نہ یوں ڈر گئے ہوتے

لے لیتے اگر عاشقِ صادق کی دعائیں
کیوں حشر میں وہ باچشمِ تر گئے ہوتے

رہتے پسِ عشاق کھلے گر تیرے جلوے
کتنوں ہی کے کوچے میں ترے سر گئے ہوتے

جلوؤں ہی میں گم رہتے سدا حضرتِ موسیٰ
گر طور سے پہلے تیرے در پر گئے ہوتے

اچھا ہوا پہنچے نہیں ان تک میرے نالے
ورنہ کسے معلوم! یہ کیا کر گئے ہوتے

تجھ سے بھی سمجھ لیتا میں اے کاتبِ تقدیر
کچھ اپنے نہ گر مجھ سے دغا کر گئے ہوتے

میں کاش بھلا سکتا تیرے طعنوں کے نشتر
اے کاش! میرے زخمِ جگر بھر گئے ہوتے

گر سنگ کو پگھلانے کا گُر جانتے ظالم!
ہم کب کے تیرے قلب میں گھر کر گئے ہوتے

گر جانتے! پیٹے گا تو نیکی کا ڈھنڈورہ
احساں تیرا۔ در پہ ہی ترے دھر گئے ہوتے

مسجد میں تری شیخ۔ اگر پاتے اخوت
ہم بہرِ عبادت وہاں اکثر گئے ہوتے

ہوتا کہیں معلوم اگر تیرا ٹھکانہ!
ہم تیری تجسس میں نہ در در گئے ہوتے

اے قیس پہنچ سکتے وہ گر تیرے جنوں کو
محفل سے نہ اُٹھ کر تیری تا گھر گئے ہوتے

ہاں دوست! ترا رنگ نہ پڑتا کبھی پھیکا!
محفل میں نہ گر ایسے سخنور گئے ہوتے

اے کاش! نہ ٹھنتی مری قسامِ ازل سے
اے کاش۔ کوئی کارِ نکو کر گئے ہوتے

اے کشن۔ وہ لا سکتے اگر تابِ نظارہ!
اُس شوخ کے در پر مہ و اختر گئے ہوتے

علامہ کیفی دہلوی

نیا۔ پرانا ادب

اِن کہاوتوں کو رہنے دیجئے کہ
آفتاب کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں،
پرانے دستور الوداع، نئے دستور خوش آمدید!
ہر نئی بات میں لذت ہوتی ہے۔

~~~~~~~~

جو چیز آج نئی ہے کچھ دنوں میں پرانی ہو جائیگی، جو آج نئی نویلی دلہن ہے وہ تھوڑی مدت میں گھر والی اور پھر مالکن بن جاتی ہے "میری جان"، اور "میرے سر تاج" تھوڑے دنوں میں کنّیت کے کلمے اور "وہ" اور "ان کو" بن جاتے ہیں، نو روز صرف ایک ہی روز ہوتا ہے اور ایک ہی روز تک رہتا ہے۔ عید ایک دن عید ہے اور پھر بقولِ کہ "عید پیچھے ٹر"۔

پرانا دانہ جو بے پروائی سے زمین پر گرا دیا جاتا ہے اور اس پر کچھ مٹی اڑ اڑ کر پڑ جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے وہ ضائع کر دیا گیا مگر فطرت فنا کی قطعیت کے منافی ہے، وہی مدفون دانہ ایک پودا پیدا کرتا ہے، وہ پودا اپنے وقت پر ایک درخت ہو جاتا ہے اور ویسے ہی بے شمار دانے پیدا کر دیتا ہے۔ اب آپ کسے نیا کہیں گے اور کسے پرانا، کسے فنا کہیں گے اور کسے بقا؟

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ایک نئی اچکن سلوائی کچھ دن اُسے پہنکا، منقطع پھرے پہننے سے اس میں شکنیں وغیرہ پڑ گئیں آپ نے اسے خشک دھلائی کے کارخانے میں بھیجدیا جہاں اس کے داغ دھبے، موڑ توڑ اور جھول چوس دور کئے گئے اور وہ استری ہو کر آپ کے پاس واپس آئی تو کیا آپ اسے نئی اچکن کہیں گے؟

جو کچھ کہا گیا ہے اسے ادب پر ڈھالئے اور نئے ادب اور

جسے پرانا ادب کہا جاتا ہے اس پر غور کی نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی

نیا نو دن اور پرانا سو دن

والی مثل درست ہے ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو۔ لیکن اصل بات وہی ہے۔

حرکت جس کا نتیجہ تغیر ہے اسے اصلاح کہیئے یا انقلاب بھی کہہ لیجئے۔ اگرچہ اصلاح اور انقلاب میں بہت بڑا فرق ہے جس کی تشریح آگے کی جائے گی۔

ایک زندہ زبان کی۔ زندہ ادب کی زندگی کی پہلی شرط ہے چونکہ ہماری زبان صرفی نہیں ہے یعنی مصنوعی قواعد سے پیدا نہیں ہوئی۔ اور وہ زندہ زبان ہے اس لئے اس کے ادب میں اصلاح اور تغیر ساقط نہیں ہو سکتے۔

یہ امر بھی صحیح ہے اور انسانی فطرت کا مقتضی ہے کہ قدامت اور جدت میں ہمیشہ کچھ مدت تک جنگ رہا کرتی ہے اور پھر آپس میں سمجھوتا ہو جاتا ہے، ایسا ہونا دیر میں یا جلدی . . . . جمہور کی جبلت اور خواص کی ذہنیت کے رجحان پر منحصر ہے۔

اجتماعیت کا فلسفہ ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتا ہے کہ جمہور خواص کے خیالات سے متاثر اور محرک ہو کر جب ایک طرز عمل اختیار کر لیتے ہیں تو اس حد سے آگے تجاوز کر جاتے ہیں جو خواص نے تبیین کی تھی اور خواص یعنی اپنے لیڈروں کو رجعت پسند کہہ کر ان سے بغاوت پر اتر سکتے ہیں۔ خواص زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہیں عمل کی قوت اور اس کے متعاہر کو جانچتے ہیں اور ضرورت کا موازنہ کرتے ہیں جب اجتماعی جرگے میں وہ مخالف فضا پلٹتے ہیں تو جمہور کی طرف رجوع کرتے ہیں اور معقول پراگندہ سے کام لیتے ہیں جمہور اسے لے دوڑتے ہیں۔
~~~~~~~~

اور وہ کچھ ہوتا ہے جو تاریخی انقلاب فرانس میں رونما ہوا۔

خواص کی نظر اصلاح پر ہوتی ہے اور جمہور کی انقلاب و انہدام پر۔ جمہور میں جوش پیدا کر دینا آسان ہے۔ جمہور کے جذبات کو بھڑکا دینا مشکل نہیں لیکن اسے ضرورت اور اعتدال کی حد کے اندر رکھنا مشکل اور سخت مشکل ہے بلکہ اکثر ناممکن ہو جاتا ہے، جب آزاد نے یہ کہا کہ اب نئے شاعر اسلاف کے اگلے نوالے چباتے ہیں یا حالی نے شعر اور غزل کے دفتر کو ناپاک قرار دیا تو ان بزرگوں کا منشا نئے زمانے کے حالات کے مناسب اصلاح اور ترقی اصلاح و ترقی تھا نہ کہ انہدام اور انقلاب۔ مگر اب ان کی روحیں ادب میں انقلاب زندہ باد اور انہدام زندہ باد کے نعرے سن کر وہ زاغ کی طرح زود پشیمانی سے کاصد مرا نظاتی ہوں گی۔ اور حالی کو تو یہ زندگی ہی میں کہنا پڑا۔

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی۔ کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پر اتنا نہ رگڑ۔ دھبا ہی رہے اور نہ کپڑا باقی

زبان اور ادب کی تاریخ صاف بتاتی ہے کہ اردو زبان اور ادب کا کوئی عہد ترمیم اور اصلاح سے خالی نہیں رہا۔ اگر میں یہاں اس کی تفصیل کرنے بیٹھوں تو یہ قارئین کرام کی ذہنیت کی توہین ہوگی۔ یہ باتیں اردو ادب میں ہوتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ہوا کریں گی اور ہونی چاہئیں۔

مجھ پر ایک جلسے میں سوال ہوا کہ میرے دیوان میں تو نظم عاری موجود ہے ہیں نے۔ دراب میں کہا کہ بے شک ہے بلکہ چار چار مصرعوں کے متبادل قافیے کے بند بھی اردو میں سب سے پہلے میں نے ہی کہے تھے، وہ بھی دیوان میں موجود ہیں لیکن اس سے آپ کو یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ میں ترمیم اور اصلاح کا مخالف نہیں ہوں اور ہیں۔

بات سادی یہ ہے کہ اخذ اور تقلید ایک چیز ہے اور اندھی تقلید دوسری چیز۔ یہ میں پہلے دکھا چکا ہوں کہ جمہور کی ذہنیت کس تیزی سے نئی بات کو پکڑ بیٹھتی ہے۔ اور پھر اسے چھوڑنے میں نہیں آتی آجکل جسے نیا ادب، یا ترقی پسند، یا انقلابی جماعت کہا جاتا ہے اُسے جو برا سمجھا جاتا ہے یا سمجھا جاتا ہے کہ برا سمجھا جاتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ آیا قدامت پرستی ہے یا کیا؟ اس صحبت میں اس بارے کچھ عرض کیا جائے گا، امید ہے کہ اسے اصولی بحث پر محمول کر کے ٹھنڈے دل سے سنا جائیگا، میں آج دل کی بات کہہ ڈالتا ہوں اور جو کچھ میں نے ثقہ لوگوں سے سنا ہے۔ اور خود دیکھا اور معلوم کیا ہے۔ اس کا لب لباب پیش کئے دیتا ہوں۔

یہ تو سب مانتے ہیں کہ ایک قوم کا ادب اور معاشرت باہم تاثر پذیر ہیں مگر کورانہ تقلید یا انقلابی جبلت ہمیشہ یا کہئے اکثر تاثر کے انداز میں خلل ڈال کر معاشرت کو پس پشت پھینک دیتی ہے، تہذیب اور جبلت میں جو فرق ہے وہ ایک طرف معقول استدلال اور سوچ میں، اور دوسری طرف جذبات کی فراوانی اور بے میزان افعال میں امتیاز کو معدوم کر دیتا ہے، مقامی خصوصیات اور ناموس اخلاق کے گلے پر تیز چھری پھیر کر معاشرتی اور اجتماعی کردار میں تخریب کے آثار پیدا کر دیتا ہے جس سے جماعت کا آخر میں حصہ سہم جاتا ہے اور روک تھام کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔

ہمارے ادبی دنیا میں آجکل یہی کیفیت طاری اور جاری ہے نوجوان اہل قلم کا وہ حصہ جس سے قوم کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں "بڑھو اور سنبھلو" کی آوازیں سن کر آواز دینے والوں کی ہنسی اڑاتا ہے، یہ کہہ کر کہ "حضرات اپنی تقویم پارین کو اونچے سے طاق پر رکھ دیجئے اب نیا زمانہ ہے اور نیا ادب"، روک تھام کرنے والوں کو اپنے ان نورچشموں سے بڑی امیدیں تھیں وہ ان کے جوان بازو اور جوان دل و دماغ سے اصلاح کا کام لینے کی امید رکھتے تھے لیکن جب یہ بیباکانہ ادائیں دیکھتے ہیں کہ وہ نورچشم دانستہ یا نادانستہ معاشرت کے اخلاقی شعور کے دھوئیں اڑا رہے ہیں۔ تو ان کی روح کو صدمہ ہوتا ہے۔

ایک طوالف ہی کو لیجئے، آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے عقیقہ اور ختنہ مونڈن اور جنیو، شادی اور فرزند نرینہ کی تولید کی تقریبوں میں طوائفوں کے ناچ مجرے ہوا کرتے تھے، عید اور دسہرے وغیرہ کے موقعوں پر طوائفیں بڑے اور متوسط درجہ کے لوگوں کے ہاں انعام لینے اور مبارکباد کہنے آیا کرتی تھیں۔ اور ہولی کے ہفتہ کو تو رہنے دیجئے

جس کی نشاط انگیز تقریبوں کی وہ جان تھیں، لیکن اب آپ کہاں ان کے گھنگھروؤں کی چھن چھن سنتے ہیں؟ کہیں ان کی صورت نظر آتی؟ میونسپل بورڈوں کے ان کو شہر بدر کرنے سے بہت پہلے وہ تقریب بدر ہو چکی تھیں۔ سوال ہوتا ہے کہ انھا پنجروں میں ان سالوں میں انہیں قعرِ گمنامی و گم گشتگی سے نکال کر کیوں گھسیٹ لیا جاتا ہے؟ کیا یہ ایک طرح کی بداخلاقی کی تعلیم نہیں ہے؟

یہ تو ہوئی ایک بات، اور سنیئے، فلم سازی کے ایک بڑے ادارے کے ڈائریکٹر نے ایک دفعہ مجھ سے شکایت کی کہ ہمارے نوجوانوں کو زنانہ کرداروں کے ساتھ سٹیج پر آنا اور اختلاط کی تمہید اٹھانا نہیں آتا، ان کو اس کی تربیت دینے میں ہمیں بہت مشکل ہوتی ہے اور بہت دیر لگتی ہے بلکہ اس لئے ایکٹروں سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتا ہے جو اور قابلیتوں کے اعتبار سے بہت کامیاب اور قابلِ پسند تھے۔ یہ سن کر جو کچھ کہا گیا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا جوان بہن کے ساتھ اس طرح پھرتا ہے کہ ساتھن کا ہاتھ اس کے کندھے پر ہے اور اس کا بازو ساتھن کی کمر پر تو اس میں اخلاق کی تبرکییں کھو گئیں اور معاشرت کا خون کیونکر ہو گیا، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کبھی اس ادا سے چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھے نہیں گئے، جن کی یہ تقلید ہے ان کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ سفر اور سفر سے واپسی کے وقت ایک مرد اپنی بیوی جوان بیٹی، ماں اور دادی کا منہ چومتا ہے، ریل کے سٹیشنوں کے پلیٹ فارم پہ ایسے منظر روز دیکھنے میں آتے ہیں فرمایئے اس بارے میں کیا رائے عالی ہے بس اس سے زیادہ اس بارے میں کہنا مناسب نہیں۔

ادب میں اب سے پہلے جو بدعنوانیاں ہوئیں وہ ہو چکیں پر اور پھر یہ بھی ہے کہ ان کی پرواز محض تخیلی تھی، پھر بھی انہیں اچھا نہ سمجھا گیا اور دبایا گیا اور جنسی عصمت کا تحفظ اور حیاداری کا عنصر غالب رہا۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کا انداز تحقیقی ہے، اور اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، خوف ہے کہ یہ اطوار کہیں آگے چل کر عادیانہ ثابت نہ ہوں، اس نازک موضوع پر اس وقت اس سے زیادہ کہنا غیر ضروری ہے۔

اب رہا کسان، مزدور، قلی، سرمایہ دار وغیرہ نظم اور نثر کے یہ موضوع آجکل بہت زوروں پر ہیں، یہ موضوع ہمارے ادب میں نئے نہیں مگر فرق صرف قلت اور کثرت کا ہے آجکل شاعر اور ناثر انہیں کو سامنے رکھ کر قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور انہیں میں الجھ الجھا کر ختم ہو جاتا ہے مگر وہ بھولتا ہے کہ کسان کے لئے زمینداری بنک اور دوسرے رفاہی ادارے قائم ہیں، مزدوروں کے یونین قائم ہیں، سرمایہ دار کی گردن پر قانون انتقال آراضی، اور قانون ساہوکارہ کے طوق موجود ہیں پھر بھی اگر ان کی حالت خراب ہو تو اس کا سبب کیا ہے؟ یہ دریافت کرنا شاعر یا افسانہ نگار کا کام نہیں، یہ کام ہے سیاس اور اقتصادیات کے ماہر کا، مگر یہاں ان باتوں سے کسے سروکار ہے یہاں تو نظم اور نثر کو کسی نہ کسی طرح سجا دینا بس یہ مقصود ہے، جو لوگ ان موضوعوں پر لکھنے کی قسم کھائے بیٹھے معلوم ہوتے ہیں ان میں سے ایک فردِ واحد بھی ایسا دیکھنے میں نہ آیا جو ایک پیسہ یا ایک قدم ان لوگوں کی فلاح میں اٹھاتا ہو ایک تعلیم یافتوں کی بیروزگاری کا مسئلہ ہے جس پر توجہ برائے نام ہے بلکہ ہے ہی نہیں انہیں لوگوں میں سے بعض نے تنگ آکر قلم سے استمداد کیا ہے اور آپنے مقصد پر پہونچکر اسے بھول بیٹھے ہیں، غرضیکہ ان موضوعوں پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ صرف اور محض لکھنے کے لئے ہے، اسے خارجی داخلیت سے زیادہ حیثیت نہیں جس نے مشاعرے میں رات کے بارہ بجے اس دسمبر کے مہینہ میں ایک سچی تحریری نظم ایک غریب کٹیا کی حزنیہ حالت پر سنائی تھی۔ اور اپنے قلم کی نوک سے سرمایہ دار کو دوزخ کے پھاٹک کے اندر ڈھکیل آیا تھا۔ وہ آدھی بجے بعد جب اپنے دولتخانہ پر پہنچے گا تو اس نوکر کو جو ناکافی کپڑوں میں کانپتا کانپتا دروازہ کھولنے آیا تھا۔ پہلے جھڑکا کہ دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگی، حالانکہ حکم دیا تھا ہمارے آنے تک جاگتا رہے، یہ نہ پوچھئے کہ اگر وہ غریب ذرا بڑبڑایا تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا خیر اب اسے حکم دیا جاتا ہے کہ جلدی چلئے بنا کر لائیے یہ ہے عملی زندگی ان حضرات کی جو فلاکت زدوں کی حمایت کے دعویدار بنے پھرتے ہیں۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں میرے بعض دوستوں کو ناگوار گذریگا لیکن سماج کی طرف اور خود ان کی طرف جو میرا فرض ہے

اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

اگر مزدور، قلی، کسان کی حالت کی فلاح اور ان کی بہبودی منظور خاطر ہے تو ان اداروں کے دستور، نظام، اور عملی پہلو کی جانچ کی جائے جو ان کے فائدے اور حق رسی کے لئے کھولے گئے ہیں، ساہوکارے اور زمینداری کے قوانین کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے نقائص اور کوتاہیوں کے دور کرنے یا کم کرنے میں اقدام کیا جائے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پرانے اور داخلی موضوعوں میں اب گنجائش نہیں رہی اور نہ فن کے مسلمہ قواعد اب تعمیل کے مستحق ہیں، یہ بات یقیناً غور کے قابل ہے لیکن فن بھی تو آسمان سے اترا ہوا کبھی مانا نہیں گیا ہمارے ہاں اس میں بھی زبان اور ادب کی طرح ترمیم اور تنسیخ ہوتی رہی ہے، ایک غزل ہی کو لیجیے کہ کیا غزل اب وہیں اور اسی حالت میں ہے جہاں اسے داغ اور امیر نے چھوڑا تھا۔

اگر آپ دنیا کی کسی قوم کی نظم اور ادب کی تقلید پر تلے ہوئے ہیں یا فرض کیجیے، انگلستان کی جنگ عظیم کے بعد کی شاعری کے مقلد اور ماننے والے ہیں تو اس میں کسی کو کوئی شکایت کیوں ہو گی لیکن پھر آپ پر وہاں کے عروض کے آئین اور قواعد کی پابندی بھی لازم آئے گی۔ میرا مطلب یہ جتا دینا ہے کہ فنیت اور فنکاری کے اصولوں سے کوئی ذوق سلیم رکھنے والا آزاد نہیں ہو سکتا، اگر آپ اسے مان لیں تو میں کہوں گا کہ پھر اپنے ہاں کے قواعد میں جہاں استبداد یا اصلاح کی گنجائش نظر آئے وہاں ترمیم سے کیوں نہ کام لیا جائے جو سلوک اس تحریر کی ابتدا میں اچکن کے ساتھ کیا گیا وہی ادب کے متعلقہ شعبوں میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ مطمح نظر اصلاح اور رفع دقت ہو۔

ایک سوال جنسی نفسیات اور واقعیت کا بھی ہے جس نے ہمارے دو سلسلوں کے دونوں حصوں کو پریشان کر رکھا ہے کوئی ادب اور کسی ملک کی شاعری جو کسی مہذب سماج سے وابستہ ہے نفسیاتی پوسٹ مارٹم کی حامل نہیں ہو سکتی پوست کندہ واقعیت اور چیز ہے اور واقعہ نگاری دوسری چیز، ہمارے سماج کو جنس شمسی راس نہیں آ سکتا کیونکہ ہمارا ملک ہی شمسی ہے یعنی گرم، ایرانی خرافات کی تقلید ہم نے کی اور پشیمان ہوئے، اب یہ مغرب کی اندھی تقلید خدا جانے ہمیں کہاں پہونچائے گی، فارسی کی تقلید شاعری اور اس میں زیادہ تر غزل تک محدود رہی، اس کے ذمائم رفع کرنے میں ہمیں آدھی صدی سے کچھ زیادہ ہی مدت لگ گئی اور پھر اس کی نوعیت بھی خاص اور اوپری تھی،

نفسیاتی مفکر کا یہ قول بھی ہمارے سامنے تھا کہ:۔

"الفاظ غریبہ و کنایات بعیدہ استعمال نہ کند و از فحش و شتم احتراز نماید، و اگر احتیاج بہ تعبیر از امرے فاحش افتد بتعریض و کنایت اکتفا کند"۔[1]

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس احتیاط اور تاکید کے خلاف کیا کہا جا سکتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ انگلستان ہماری قسمت کا ہی مالک نہیں بلکہ ہماری ذہنیت پر بھی مسلط ہے اس تسلط میں روس کے نئے تمدن کا بھی حصہ ہے یہ سب کچھ بڑی زیادہ صحت کے ساتھ مغربی ذہنی تسلط کا منتہائے کمال عمر میں بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں، مغربی علوم اور ادب کی تعلیم بیشک جنگ کے پہلے سے اپنا اثر پھیلا رہی تھی، لیکن اس کا انتہائی فروغ جنگ عظیم کے بعد کی بات ہے، جنگ کے بعد انقلابی اور بغاوت کا رنگ انگلستان کے ادب اور شاعری پر چڑھا۔ بات جب یہاں تک پہنچ گئی تو یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس نئی پرواز کو وہاں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے اس سلسلہ میں صرف ان دو[2] شخصوں کی رائے پیش کی جائے گی جو اس وقت انگریزی کی دنیا میں ہر روایتی جنبہ اور تعصب سے آزاد اور کٹر نقاد مانے جاتے ہیں یعنی کیمبرج یونیورسٹی کے مسٹر ایف۔ آر۔ لیوس اور آئی۔ اے رچرڈس لیوس کہتا ہے:۔

"نہ تو مارکس اور نہ اس کے پیروؤں کا یہ اعتقاد تھا کہ ادب اور آرٹ میں معاشیاتی خواہشات کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جماعتوں سے بالاتر ایک نقطہ نظر ہے۔ ایک تعقلی، جمالیاتی اور اخلاقی مستعدی اور عملیت ہے جو سماجی اصلیت اور معاشیاتی سوانح کا اظہار نہیں، ایک چیز انسانی کلچر ہے۔

یہ وہی انسانی کلچر یا آدمیت ہے جس کی شان میں ذوق کہہ گیا ہے۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ

یہ کلچر واقعیت کی عریانیوں سے بالاتر ہے اور ان سے بے تعلق،

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

[1] اخلاق جلالی، لامع دوم، لمع چہارم

اختر عسکری

نقوشِ مستقبل

اوانا عمل کریں گے۔ جہاں میں یہ جستجو کریں گے
بلندیوں پر جو آبشاریں ہیں ان پہ جا کر وضو کریں گے

شرابِ علم و ہنر کا کر دیں گے فطرتِ آدمی کو حامل
ہے جس قدر مے کدے میں باقی سپردِ جام و سبو کرینگے

بلندیاں ہیں بلندیاں جس سے رفعتیں رفعتیں بنیں ہیں
خمیر اس خاک کا یقیناً ودیعتِ آرزو کریں گے

امیر کو سطحِ نا ملائم پہ لائیں ہرگز یہ دل نہیں ہے
مگر جہاں تک بھی ہو سکے گا غریب کی آبرو کریں گے

کہیں لٹائیں گے جان اپنی کہیں کریں گے نثار دل کو
غریب کی رفعتوں کی خاطر کہیں تو پانی لہو کریں گے

بنائے علم و ہنر کے مرکز اگر ہو آزادیوں کے قائل
جو بیج فصلِ بہار میں لگ گئے وہ شاید نمو کریں گے

بنائیں گے سب جہاں سے اونچا ہم اپنی تہذیب کا ثوالہ
لگے ہوئے ہیں غلامیوں سے جو زخم دل میں رفو کرینگے

ادائے فرضِ عبادِ مولا کے واسطے سربکف رہو تم!
وہ خون کر دیں گے آرزو کا تمیز جو رنگ و بو کرینگے

تمیزِ مذہب تمیزِ ملت تمیزِ رنگت کو چھوڑ دیں گے
جو قعرِ ذلت میں کھینچتی ہو ہم ایسی غفلت کو چھوڑ دینگے

گراں سرشتِ وفائے عالم شہابِ عقل و ہنر بنے گی
سیاہیٔ بختِ نارسا پھر جو رات سی ہے سحر بنے گی

سیلِ فطرت کی یورشِ تیز کام کر دے گی بے لبسی کا
نئے بنیں گے جہان والے نئی سرشتِ قدر بنے گی

شکستِ حسرت سے آرزوئیں فروغ پائیں گی رفتہ رفتہ
جو رات بھر میں مٹیں گے تارے انہیں سے میری سحر بنے گی

پیام لائیگی ایک دن بیدلی سرشتِ نمودِ دل کا!!
خزاں وبال فروغ ہے جو وہی دمِ بال و پر بنے گی

لگیں گے گلشن میں پھول ہر سو کھلیں گے غنچے مسرتوں کے
ریاضِ ہستی میں شجرِ ہمت کی آبرو پھر ثمر بنے گی!

اگر ہوں یکجہتی تدبر سے ایک ہندوستان والے
فلک سے شاید بلند ہو گی جو رفعتِ بام و در بنے گی

کریں گے داد و ستد کو وقفِ خیالِ انسانیت جہاں میں
ہمارے اوجِ خیال سے پھر فضائے شام و سحر بنے گی

یہ زندگی جس کو آج تک ہم فریب دیتے رہے ہیں پیہم!
کبھی بنے گی ہنر کی منزل کبھی متاعِ ہنر بنے گی

بیا کہ درسِ علومِ عالم بہ بندگانِ خدا فروشم
برائے تعمیرِ آدمیت ایں دل فروشم ایں سر فروشم

محمود رازی

سپاہی کی دلہن

ایک عورت، کہ ہے جوان و حسیں! — چپ سی بیٹھی ہے صحن میں، غمگیں!
لب ہیں خاموش، آنکھ پُرنم ہے — دردِ ہجراں ہے، کرب ہے، غم ہے
جی میں سَو سَو اُبال آتا ہے — جانے کیا کیا خیال آتا ہے؟

اُس کا دم ساز ہے لڑائی میں!
کھاتی جاتی ہے یہ جدائی میں!

پوچھا ہمسائی نے، کہو بھابی! — بھائی صاحب کی آئی ہے چٹھی؟
بولی وہ، آہ سرد سی بھر کے — خط تو آتے ہیں! خود نہیں آتے

ہو گئے آج چھ برس پورے
تھک گئی ہوں اُڑا اُڑا کوّے

کھٹکھٹایا کسی نے دروازہ! — (دل نے زخم اور پایا اِک تازہ)
دیکھا جا کر، کہ تار آیا ہے! — یہ سمندر سے پار آیا ہے!
لے کے بولی، کہ ہاں! پڑھو بھائی — میرے ساجن کی کیا خبر آئی؟

پڑھ کے کہنے لگا، کہ اے پُرغم!
مر گیا جنگ میں ترا پریتم!

دل پہ گہرا ہوا اثر سن کے — مرگِ محبوب کی خبر سن کے
اور ہوتی، تو کوٹتی چھاتی! — نوچتی بال، پیٹتی جاتی!
پر، وہ صبرِ جمیل کی حامل — حکمِ ربِّ جلیل کی حامل
سرِ تسلیم کر کے خم، بولی! — مسکرائی، ہٹا کے غم بولی!
موت آتی نہیں شہیدوں کو — حق پرستوں کو، اور سعیدوں کو
جو مجاہد ہیں، مر نہیں سکتے — حق کے شاہد ہیں! مر نہیں سکتے

نام ان کا ہے تا ابد زندہ
ہاں انہیں رہتا نام بد زندہ

ہے مسرّت، کہ میرے شوہر نے — دُرجِ صدق و صفا کے گوہر نے
جام بھر کے پیا سعادت سے — آفریں! بادۂ شہادت سے
میں بھلا اس کو کس لئے پیٹوں؟ — وہ تھا جاں باز! اس لئے پیٹوں؟
کس لئے روؤں اور چلاؤں؟ — حرفِ افسوس، لب پہ کیوں لاؤں؟

ہو گیا وہ شہیدِ آزادی!
پائی ہم نے نویدِ آزادی!

اخگر عسکری

منتشر جذبے

ابتدا

دل کی جمعیت ہوئی ہے از سرِ نو پاش پاش رنجِ نومیدی لے گی ہے آرزوؤں کی تلاش
آؤ بھی تم کو دکھائیں عشق کی گل کاریاں!
اشک عنابی نہیں یہ دل کی ہے سیال کاش

محبّت

عشق میں تخریب کی حد یہ کہ پھنک جاتا ہے دل حسن نے لاکھوں کئے ہیں چاہنے والے تلاش
کیا شہیدانِ محبت کو ملا ہے دہر میں!
کس مپرسی میں پڑی رہتی ہے پروانے کی لاش

زندگی

زندگانی کی تگ و دو کارِ لاحاصل تمام دوڑتی ہے جیسے دریاؤں میں موجِ ارتعاش

غلامی

حکم اور تعمیل کی الجھن میں خودداری گئی خاک رکھے گی کسی کی آبرو فکرِ معاش

بڑھاپا

جا رہا ہے اس طرح خورشیدِ مغرب کی طرف جیسے رہرو تھک کے تابش میں کرے سایہ تلاش
حور کے لالچ میں جو بھی ہو سحر خیزی حرام
شیخ صاحب پہ یہ ظن اخگر سنبھل ہشیار باش

اثر لکھنوی

حُسنِ بیان

کہہ کے "بھلا ہیں کس کی باتیں"
مجھ کو سنائیں میری باتیں
ہائے وہ بولی میٹھی میٹھی
اور وہ بھولی بھولی باتیں
آگ بھبھوکا پھر ہو جانا!
کرتے کرتے پیاری باتیں
پھر وہی چتون تیکھی تیکھی
پھر وہی اُکھڑی اُکھڑی باتیں
شوخی سمجھوں یا عیاری
آپ اور دلداری کی باتیں
کہتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو
دیکھتے جاؤ اپنی باتیں!
ایک نہ اک دن آئیں گی منہ پر
جس کی ہوں گی جیسی باتیں
تیرے سوا پھر کس کو سناؤں
جان کے دشمن تیری باتیں
آپ نہ بگڑیں دیوانوں کی
ہوتی ہیں کچھ ایسی ہی باتیں
تیر سا مارا تو نے ہمدم
یاد دلا کر بھولی باتیں!
سن لو سن لو پھر نہ سنو گے
بعد اثر کے ایسی باتیں

رعنا نظامی

حُسنِ مجاز

دلِ مضطرب پہ براہِ راست اثر کرے جو وہ ساز ہے
جو تعینات سے ماوراء ہے وہ نغمۂ روح نواز ہے
میں بھلاؤں تجھ کو تو کس طرح ترے در سے اُٹھے جبیں تو کیوں
تیرا آستاں ہے حرم مجھے تیری یاد میری نماز ہے
تری بزمِ ناز میں باریاب نہ کیوں ہوں میں نئے رنگ سے
وہ اصولِ عشق بدل گئے نہ وہ غزنوی نہ ایاز ہے
تجھے کر تو دوں خود ہی آشنا مگر اس تضاد کو کیا کروں
مری چشمِ فکر ہے حق نگر تو اسیرِ حُسنِ مجاز ہے
نہیں چھپتی میری نگاہ میں یہ جہانِ عشق کی وُسعتیں
اُڑا جا رہا ہوں کہ سدِّ راہ نشیب ہے نہ فراز ہے
تجھے کیا خبر کہ شکستگی میں جو لُطف ہے وہ کہیں نہیں
جسے تو حقیر سمجھ رہا ہے وہی تو محرمِ راز ہے
ہے اثر سے خالی بیاں تیرا تو حریفِ بزمِ سخن نہیں
تجھے حُسنِ شعر پہ فخر ہے تجھے زورِ فکر پہ ناز ہے

آغا محمد باقر

"راحت کدہ"

"راحت کدہ" یہ خواجہ عبد السمیع پال آثر صہبائی کا وہ کلام ہے۔ جو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد کہا تھا صہبائی ان مرحومہ کو راحت کہا کرتے تھے۔ اسی رعایت سے اس مجموعے کا نام "راحت کدہ" تجویز کیا گیا ہے۔ نیز اس اعتبار سے بھی اس کو راحت کدہ کہنا درست ہے کہ غم زدہ شاعر نے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر دل کے بوجھ کو ہلکا کیا ہے۔

۱۹۳۳ء میں آثر صہبائی کا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں "راحت کدہ" کے عنوان سے ان تاثرات کا اظہار کیا گیا تھا جو اس المناک حادثے سے شاعر کے دل میں پیدا ہوئے تھے اب انہی اشعار کو احباب کے اصرار سے مزید سو شعروں کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ راحت کدہ کا مقدمہ خان بہادر مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس مقدمہ میں شاعری کی ضرورت، اہمیت اور حقیقت پر زمانہ حال کی روشنی میں بالکل اچھوتے اور دلکش انداز سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں آثر صہبائی کی شاعری اور اس مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میاں بیوی کی پاک اور بے لوث محبت، جس کا اظہار اب تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شاعری کا موضوع بن سکتی ہے اور روایات شرم و حیا اور غیرت و خودداری کو قائم رکھتے ہوئے۔ ایسے مؤثر پیرائے میں نظم ہو سکتی ہے کہ پڑھنے والا کلیجہ تھام لے، جہاں تک مجھے علم ہے، اس قسم کی شاعری میں اولیت کا سہرا صہبائی کے سر ہے" اس مجموعے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اشعار کو تاریخ وار درج کیا گیا ہے۔ اس ترتیب سے شاعر کے جوش غم کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ شروع کے اشعار میں طبیعت کا جوش زیادہ بڑھا ہوا ہے مثلاً

طوفان اضطراب ہے اور رو رہا ہوں میں
شام غم فراق میں جاں کھو رہا ہوں میں
ہے سوز غم سے شعلہ بداماں خس وجود
آغوش غم میں تیری فنا ہو رہا ہوں میں

ابتداً صہبائی نے اپنے درد کا اظہار دو دو شعروں کے قطعوں میں کیا ہے۔ ان قطعات کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں بیٹھے بیٹھے ایک ناقابل برداشت درد اٹھا اور بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، ابتدائی اشعار میں جوش و خروش زیادہ اور جذبات میں گہرائی کم" لیکن جب یہی درد ایک مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے گویا "دکھ جی کے پسند آجاتا ہے" تو ہر شعر میں اس انداز سے تراوش کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے، اور وہ یہ محسوس کرتا ہے۔ جیسے یہ کیفیت اس کے اپنے ہی دل پر بیتی ہے۔

بعد کے اشعار کے پس منظر میں بھی شاعر کے دل و دماغ پر وہی اپنی رفیقۂ حیات کی دائمی مفارقت کے جذبات موجزن ہیں لیکن اب وہ تخصیص نہیں کرتا، اس لئے اس کے اشعار پڑھنے والے کے لئے نشتر بن جاتے ہیں۔

جوں جوں غم کی فراوانی کم ہوتی جاتی ہے بہار غم بہار جانفزا معلوم ہوتی ہے

مثلاً ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء کو آثر کی پر بہار زندگی کا رنگین خواب درہم برہم ہوتا ہے اس حادثے کے تقریباً دو سال بعد وہ یوں نغمہ سرا ہوا ہے

تمہاری فرقت میں میری آنکھوں سے خوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں
سپہر الفت کے ہیں ستارے کہ شام غم میں چمک رہے ہیں
عجیب ہے سوز و ساز الفت، طرب فزا ہے گداز الفت

یہ دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں کہ لالہ و گل دہک رہے ہیں
مگر اثر ہے خموش و حیراں ہوا ہے گم چاک چاک داماں
لبوں پہ آہیں نظر پریشاں پلک سے آنسو ڈھلک رہے ہیں

آپ نے دیکھ لیا ان اشعار میں جذبات کی شدت کس قدر ہے اور تغلعات کی جگہ کبھی کبھی شعروں کی نظموں یا غزلوں نے لے لی ہے لیکن پھر بھی درد بدرجۂ اتم موجود ہے یعنی صرف غم نہیں رہا، آپ اس نے فلسفیانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ گویا انفرادیت کی جگہ وسعت آگئی۔ ملاحظہ فرمائیے۔ حیات و ممات کے مسئلے اب کس رنگ میں اختر کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ درد و اثر میر تقی کے کلام میں بھی اس فراوانی سے نہیں پایا جاتا۔

سطحِ دریا پر اُبھر آتے ہیں ہم
بلبلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم
تیر کر لیکن ذرا کچھ دُور تک
اس نئی ہستی سے گھبراتے ہیں ہم
تنگ آکر وحشتِ افکار سے
سر انہیں موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم
ٹوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق
پھر سکونِ بیخودی پاتے ہیں ہم
خوب ہے نیرنگیٔ موت و حیات
بس یونہی بن بن کے مٹ جاتے ہیں ہم
کیا وہیں ہیں، ہم جہاں سے آئے تھے
یا کہیں جاتے ہیں یا آتے ہیں ہم

راحت کدہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو خونِ دل کی تراوش سے لالہ زار کا سماں پیش کرتے ہیں۔ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور سے طلب فرمائیے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ لکھائی چھپائی اور جلد نہایت عمدہ ہے۔

اخگر عسکری

گِلہ

جناب نرگس کی معرکۃ النظم "آج کی رات" مطبوعہ پریم (ستمبر) سے متاثر ہو کر

میں تمہاری بات مانوں تم نہ مانو میری بات　　کیا بُرا اس میں رکھا ہے گرچہ یاں رہ جاؤ رات
دل کی باتیں کون سمجھے تم نہ سمجھو گے کبھی　　تم ہو وہ جس نے کہ دن میرے بنا ڈالے ہیں رات
اور شب کی خوبیوں پر ہولنا کی کا فسوں!　　اس طرح تم لے پڑھا جاتے رہے اُس کے صفات
خنکیاں اس کی ہلاہل۔ تیرگی اس کی۔ بَلا۔　　خامشی اندوہ رساں تنہائی۔ اُلفت کی زکات
تم نے بھی سوچا ہے کیا نسوانیت کی زندگی　　تم بنا سکتے ہو بیشک میری ہر شب شب برات

اے کہ تیری ذات سے ہے زندگانی کو ثبات۔
تجھ پہ میں قربان کر ڈالوں جہاں کی کائنات

عشرت کاشمیری

تشنۂ تکمیل

(۲)

نہ معلوم کیوں میرا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اور خزاں رسیدہ پتے کی طرح کیوں کانپ رہا تھا۔ میری آواز میں رندانہ لغزش پیدا ہوئی "بھاگ جاؤ گی۔ تو بھاگ جاؤ میں روٹھے دیوتا کو منا لونگا۔ میری تیز آنکھیں۔ خدا شاہد ہے کہ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کہاں سے ان میں چمک پیدا ہو جاتی ہے ورنہ آگے پیچھے تو بجھی رہتی ہیں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ یہ دیئے بجھ جائیں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے" یہ کہہ کر میں نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ "بڑے شریر ہو تم" خورشید نے میرے تمتماتے ہوئے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "اگر پھر آنکھیں بند کیں، تو پھر روٹھے دیوتا کو منانا مشکل ہو جائیگا۔

میں نے تیزی سے کہا "میرا دیوتا۔ قہر و حقارت کا دیوتا نہیں۔ وہ محبت کا دیوتا ہے وہ خلوص کا مجسمہ ہے وہ انسانیت کا۔"

"چپ" خورشید نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا لمحہ بھر کے لئے اس کا ہاتھ میرے لبوں پر رہا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ہاتھ ابھی تک اپنی جگہ پر رکھا ہوا ہے ابھی تک اس کا لطیف لمس میرے جسم میں ارتعاش پیدا کر رہا ہے۔

"دیکھو حامد۔ اگر تم اپنی موجودہ حالت پر رہے تو تم کچھ نہ کر سکو گے تمہارے ماموں جمانی تمہارے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں گے اور پھر چچوڑی ہڈی کی طرح تمہیں پھینک دیں گے۔ کیا تمہیں اپنی پستی کا احساس نہیں؟"

میرا طلسم خیال ٹوٹ گیا "پستی کا احساس نہیں" اس جملے نے مجھے عرش کی بلندیوں سے اٹھا کر زمین کی پستیوں میں پھینک دیا۔ میرے ولولے ختم ہو گئے۔ میرے حسین سپنے ٹوٹ گئے۔ ایک خیال پیدا ہوا۔ کہ کیا خورشید بھی مجھے حقیر سمجھتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ذرّہ ناچیز اور آفتاب کا کیا مقابلہ میں نے اس کی آنکھوں میں اس کے کہے ہوئے جملے کی تاویل ڈھونڈنی چاہی۔ وہ ستارے اسی شدّت سے چمک رہے تھے۔ ان کی ضوریزی بدستور میرے خانۂ دل کو منور کر رہی تھی۔ میری ڈوبتی ہوئی کشتی پھر ابھری۔ وہ مجھے حقیر نہیں سمجھتی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد جیسے وہ اپنے خیالات کو ایک مرکز پر جمع کر رہی تھی خورشید بولی "تمہیں اگر مجھ سے محبت ہے تو تم اس کا ثبوت دو"۔

"محبت کا ثبوت" اس کی محبت کا کیسے ثبوت دوں؟ مجھے موزوں الفاظ دل سکے کوئی مثال بھی یاد نہ آئی۔ وہ زیادہ جوش کے ساتھ بولی "ہاں ہاں محبت کا ثبوت۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا۔ میرے بتلائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا ہوگا۔ وہ راستہ جو تمہاری کایا پلٹ دیگا۔ تمہیں ذرّے سے ایک کرم بنا دیگا۔ تم دیکھتے نہیں کہ سدو جمال کا لڑکا چند برسوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ پہلے مزدور تھا پھر میٹ اور آج ٹھیکیدار ہے۔ اگر وہ اپنی قسمت پہ شاکر رہتا تو وہ بھی تمہاری طرح آج دوسروں کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوتا۔ میں تمہیں وہاں دیکھنا چاہتی ہوں جہاں عزت قدم چومتی ہے اور دولت نچھاور ہوتی ہے۔"

اس کا ایک ایک جملہ دل میں اتر گیا "لیکن" میں کچھ بولنا چاہتا تھا اس نے آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا اور بولی "لیکن ویکن کچھ نہیں تم بچے نہیں ہو۔ تمہارے ماموں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا تم ان کے زرخرید غلام ہو؟ اگر نہیں تو غلامی کا جوا گردن سے اتار پھینکو۔ کل صبح میں تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتی۔ نہیں کل صبح نہیں۔ پرسوں صبح۔ اگر کل

ہی تم چلے گئے تو تمہاری ممانی تمہیں چور بنا دے گی۔ پرسوں ٹھیک رہے گا۔ پرسوں تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ کہاں جاؤ گے؟ اس کا فیصلہ تم خود کرو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی اور تمہیں اس حالت میں دیکھنا پسند کروں گی جب تم خود کما کر کھاؤ گے اور دوسروں کو کھلا سکو گے۔ یہ لو راستے کے لئے۔"

اس نے ایک پوٹلی میرے سامنے پھینک دی اور میرا جواب سنے بغیر تیزی سے نکل گئی۔ جیسے ہوا کا جھونکا دروازے سے آئے اور روشندان سے گزر جائے۔

دس پندرہ منٹ تک خاموش رہا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ رفتہ رفتہ حواس بجا ہوئے۔ اس کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آ گئیں۔ اس نے سچ کہا تھا۔ سرد و حمال کا لڑکا غفار اصغر چند سالوں میں گودڑیوں سے محلوں میں پہنچ گیا تھا۔ میں جسمانی طاقت اور دماغی حالت میں اس سے بہتر تھا۔ کیا میرے لئے وہ دروازہ کھلا نہیں ہے؟ ایک نئی امنگ دل میں پیدا ہوئی۔ تصور نے مجھے بڑے بڑے دلکش مناظر دکھانے شروع کئے۔ میں نے دیکھا کہ میں امیر کبیر بن گیا ہوں۔ خورشید گہنوں سے لدی ہوئی میرے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہے۔ وہ مجھے کچھ دے رہی ہے۔ دفعتاً مجھے پوٹلی کا خیال آ گیا۔ فرش پر ہاتھ مارا وہ وہیں تھی۔ اندھیرے میں اس کی گانٹھیں کھولیں اور میرے ہاتھ گول چیز سے ٹکرائے۔ پانچ روپے تھے۔ چاندی کے پانچ۔ خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ میرے جنگل کے ساتھی مجھے سنایا کرتے تھے کہ عورت اسی مرد سے خوش رہتی ہے جو اسے نفیس نفیس تحفے دے۔ انہوں نے تحائف کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں گری چھوہارے، انگوٹھی، صابن، ریشمی رومال اور روپے بھی شامل تھے۔ جس نے شہد نہ چکھا وہ گڑ کو میٹھا سمجھتا ہے۔ پہاڑی بوالہوسوں کی تجارتی محبت جذبات اور خواہشات کے تبادلہ سسٹم کے تحت آ جاتی ہے۔ شکر ہے کہ خورشید گری اور چھوہاروں کی بھوکی نہ تھی اور میں انہیں خرید نہ سکتا تھا۔ وہ میرے جنگل کے نقلی عشاق کے مقرر کردہ کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ اس نے اپنی تمام پونجی میرا شکریہ سنے بغیر مجھے دے دی تھی۔ کاش میں ہدیہ دل کے علاوہ کوئی دوسری پیشکش بھی پیش کر سکتا۔

دوسرے دن ماموں ممانی نے خوب ڈانٹا، خوب پچکارا، دھمکیاں دیں، لالچ دیئے لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات۔ نہ ڈنگر سے گیا اور نہ ہی ممانی کے صاحبزادے کو لٹے لے پھرا۔ میرے اعلان بغاوت پر وہ دونوں بہت سٹ پٹائے۔ میرے مطالبات معلوم کئے جانے لگے۔ نئے کوٹ اور نئی چپلی کی پیشکش کی گئی۔ چالاک مہاجن کی طرح انہوں نے اس فرضی قرض کی فہرست پیش کی جو میرے والد اور والدہ کے کفن دفن میں انہوں نے خرچ کیا تھا اور جو میری آٹھ دس سالہ خدمات کے باوجود جوں کا توں قائم تھا۔ محلہ دار جمع ہو گئے۔ مجھے ایک صاحب کے سپرد کیا گیا کہ وہ ماموں کے احسانات مجھے گن گن کر سنائیں اور اپنی چرب زبانی سے اڑتے پنچھی کو پکڑ لیں۔ وہ اللہ کے بندے مجھے گھر لے گئے۔ چائے پلائی۔ گھر پہنچ کر ان کے وعظ کی صدا بدل چکی تھی۔ ماموں کے سامنے وہ مجھے خدا کے قہر سے ڈرا رہے تھے۔ احسان فراموشی کی صورت میں مجھے دوزخ میں ہمیشہ جلنے کی بشارت دے رہے تھے۔ قید کی دھمکی کئی بار دی گئی تھی۔ لیکن اپنے مکان میں انہوں نے مجھے کہا "میاں! ماشاءاللہ اب تم جوان ہو۔ رمضانا تو تمہیں ساری عمر دھوبی کا کتا بنائے رکھے گا۔ روٹی کپڑا بیشک تمہارا ملیگا لیکن نہ تم شادی کر سکو گے نہ تمہارے پاس چار پیسے جمع ہو سکیں گے۔ تم رمضانے کے دبیل نہیں ہو۔ اگر تمہارے والدین کے کفن دفن میں اس نے روپیہ خرچ کیا ہے تو ان کی جائیداد بھی وہ پی گیا ہے۔ تم نے آٹھ دس سال اس کی خدمت بھی کی ہے۔ تم سے کوئی عدالت کوئی پائی بھی مواخذہ نہیں کر سکتی۔ تم آزاد ہو۔" اتنا ہی نہیں ماموں کے اس ہمدرد ہمسایہ نے مجھے یہ بھی کہا تھا۔ "رمضانے کی لڑاکا عورت سے تمہارا نباہ مشکل ہے۔ اگر تمہیں وہاں تکلیف ہے تو تم بیشک یہاں آ جاؤ۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ خدا جنت نصیب کرے تمہارے والد کو۔ میرے گہرے دوست تھے۔ مرتے وقت تمہارا ہاتھ مجھے پکڑا گئے تھے لیکن رمضانے کا دل نہ توڑ سکا۔ یہاں کام کاج تو کچھ ہے نہیں۔ بیلوں کی ایک جوڑی، چند بھیڑ بکریاں اور تین گائے ہیں۔ پھرتے پھراتے انہیں جنگل میں لے گئے اور شام کو انہیں ہانکتے ہوئے گھر لے آئے۔ جنگل میں تم بیکار

باقی صفحہ ۴۰ پر

نرگس

سندلیہ

میں اکثر گرمیوں میں پہاڑوں پر جاتا۔ وہاں کی پرکیف ہواؤں، دلفریب نظاروں اور امرت سے بھی سوا اُبلنے والے چشموں سے لطف اندوز ہو کر میدانوں کی کلفتوں کو دور کر لیتا۔ لیکن مجھے یہ ایک بُری عادت ہے کہ میں زیادہ ہما ہمی کسی بھی چیز میں پسند نہیں کرتا۔ انسانی رونقوں سے بھرپور پہاڑوں پر جا کر ان کوہستانی دلاویزیوں کا آنند لیتا ہوں۔ جہاں قدرت نے اپنی رنگینیوں اور لطافتوں سے ایک ایسی ہی رونق کا عالم بکھیر دیا ہے۔ وہاں ان تنہائیوں میں کھویا کھویا سا پھرتا ہوں اور حقیقی مسرت کی تلاش میں کوہستانی مناظر کو دیکھ دیکھ کر اصلی راحت اور قلبی سکون حاصل کر لیتا ہوں۔

بیتی ہوئی گرمیوں میں مجھے ایک ایسا جانگداز حادثہ پیش آیا جس سے آج تک میرا دلی سکون تلملا رہا ہے بہتیرا دل بہلاتا ہوں ہر طرح کی کوششوں سے ان نظاروں کی طرف دل کو لگاتا ہوں مگر اس حادثہ کا اثر میرے دماغ سے دور ہونے کا نہیں جو ایک حد درجہ کی شریف و حسین پہاڑی عورت نے اپنے پیارے شوہر کو میرے ذریعہ سندلیہ دے کر اپنی سادہ لوحی اور بے لبسی کا اظہار کیا تھا

میں چار ماہ سے ان پہاڑوں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اور جب واپسی پر میرا گذر ایک نہایت خوش منظر خطہ سے ہوا۔ تو بے اختیار جی چاہا کہ ایک دو راتیں یہاں بھی بسر کرنی چاہئیں۔ بس یہی خوش نما خطہ میرے غم کا باعث ہوا۔ یہاں ایک ہی گھر تھا۔ کسی دن شاندار ہوگا۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج دوسری دنیا کو اپنی روشنی دینے جا رہا تھا میں وہاں پہنچا اس گھر کے صحن میں مویشی بندھے تھے۔ اور ایک عورت ادھیڑ عمر کی لیکن نہایت ہی رسیلی آنکھوں والی انہیں گھاس ڈال رہی تھی میں نے بیٹ سرکاتے ہوئے اوپر راستہ سے ہی آواز دی۔

"رات گذارنی ہے اجازت ہو تو نیچے اتر آؤں اگر کھانے والے کو بھی کچھ مل جائے۔ ورنہ آپ ہی بتا دیجئے کہ آگے آبادی کتنی دور ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے وہاں پہنچ سکوں گا یا نہیں؟"

"آپ کون سے محکمہ کے آفیسر ہیں" اس نے جواب دیا۔

"کسی کے بھی نہیں پردیسی ہوں۔ اور سیلانی۔ اپنے وطن کو واپس جا رہا ہوں"

"کہاں؟"

"لاہور"

"لہور"

"ہاں"

تو وہ کہنے لگی: "اچھا آ جائیں آپ۔ میں نے خیال کیا کہ آپ شاید پولیس کے تھانے دار ہیں۔ یا جنگلات کے فارسٹر۔ اگر آپ یہ ہوں تو نہ بابا میں اکیلی عورت ایسے لوگوں کو رہنے دینے کی نہیں ان لوگوں کا کیا ہے۔ جہاں عورت دیکھی۔ وہاں ڈیرا ڈال دیا۔ کوئی انہیں پوچھنے والا ہی نہیں"

میں اس تک پہنچ گیا۔ بیٹ اتارا قلی سے سامان رکھوایا۔ بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے میں نے کہا۔

"آپ مجھ سے ڈریں نہیں ملازم ہوں نہ آفیسر۔ یونہی مسافر ہوں۔ اور لاہور جا رہا ہوں"

"میرا مالک بھی وہاں ہی رہتا ہے" اس نے کہا

کپڑے بدل کر میں باہر چلا آیا۔ اور سامنے والے پہاڑوں کا نظارہ کرنے لگا جو سلسلہ وار نا معلوم کہاں سے کہاں تک چلے گئے تھے جن پر شفق کا سنہری عکس اور ڈھلتے ہوئے سورج کی شعاعیں کچھ اس انداز سے پڑ رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے یہ تمام پہاڑ آن واحد میں سونے کے بنا کر رکھ دئے ہیں۔

انسان ایک مسافر ہے۔ اور دنیا ایک مسافر خانہ آج یہاں کل وہاں۔ میری طرح کئی آ رہے ہیں۔ کئی جا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ لاکھوں برسوں سے جاری ہے۔ ان ہی خیالات کی بلند پروازیوں۔ اور فطرتی مناظر میں کچھ اس طرح محو ہو گیا۔ کہ مجھے خیال نہ رہا میں کہاں ہوں۔ اور دنیا کہاں بس رہی ہے۔ پر مجھے چونکا دیا اس میٹھی اور پیاری آواز نے جو ایک لڑکی کی تھی۔ وہ دودھ سے بھی زیادہ سفید اور خوبصورت تھی وہ ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے میرے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔

"بابو جی دودھ لے لو۔ اماں نے کہا ہے۔ اسے پی لیجئے تھکاوٹ دور ہو جائے گی"

وہ لڑکی کیا تھی ہیرے کی ایک کنی جسے اندھیرے میں رکھا جائے۔ تو روشنی نمودار ہو اُٹھے۔ میرے دل میں تلاطم سا برپا ہو گیا ایک سورج چھپ چکا تھا۔ اور دوسرا نکل آیا تھا۔ شکل و شباہت میں بالکل اپنی ماں کی بدل۔ صورت۔ رنگ قد سب ایک ہی۔ اور ایک ہی وضع کا لباس۔ سرخ کرتا۔ سیاہ تنگ پاجامہ۔ سر پہ رومال اور لہریا۔ شاید یہی جانتا ہے کہ اس لڑکی نے مجھ ایسے خشک اور زاہدانہ خیالات کے رکھے پھیکے انسان کو اپنے پریم بھرے انداز اور حور پری کی سی صورت سے مسحور کر لیا اور میں بار بار لڑکی کو۔ چاندی کی صورت کو دیکھنے لگ گیا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھتا ہی رہوں اور وہ تھی بڑی ہی بھولی بھالی۔ کمسن۔ نادان جو میرے ایسے خود ساختہ عقلمندوں کی عقلمندی کا اپنی معصومیت سے مضحکہ اڑا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"جاؤ بی بی۔ آتا ہوں۔ ابھی دودھ رکھیں۔ میں پی لوں گا"

وہ چلی گئی۔ لیکن میں بھی وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اور کھچا ہوا اس کے پیچھے پیچھے برآمدے تک پہنچ گیا۔ جہاں میرا بستر بچھا تھا۔ گھر کی مالکہ وہی۔ میری طرف جو گھور کر دیکھنے لگی۔ میری جان ہی نکل گئی میں نے سمجھا کہ شاید ناراض ہو گئی ہے کیا ہ لیکن وہاں وہ بات نہ تھی۔ اپنے ہی پاپ کانپ رہے تھے کہ مہمان وہ بھی بن بلائے ہو کر میزبان کی ایک شریف کنواری کنیا پر آنکھیں ڈالنا ایک اخلاقی جرم تھا جسے انسانیت کسی بھی صورت گوارا نہیں کر سکتی۔ اور میرا یہ وہم یک لخت کافور ہو گیا۔ جب گھر کی مالکہ نے کہا۔

"بابو آپ لاہور جائیں گے نا؟"

"میں نے کہا۔ ہاں۔ کیا کچھ کام ہے؟"

کام دام تو کوئی نہیں۔ اور ہے بھی۔ اگر میرا سندیسہ ان تک پہنچا سکیں تو۔ یہاں چٹھی لکھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ اور اگر کوئی مل بھی جائے تو وہ بغیر پیسے لئے لکھنے کا نہیں۔ اور یہاں یہ چیز نہیں اگر ہوتی تو وہ باہر جا کر کیوں ٹکریں مارتے اور مجھے یہاں رلانے کو چھوڑ جاتے یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔

میں نے کہا "آپ جو کچھ کہیں گی میں خود مل کر ان تک حرف بحرف پہنچا دوں گا۔ مگر یہ تو معلوم ہو۔ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اور آپ تو رو رہی ہیں"؟

"یوں ہی جیو۔ آپ پہلے کھانا کھا لیں"

اس نے لڑکی کو آواز دی۔ لڑکی ایک مکی کی روٹی اور دودھ لے کر آ گئی۔ کہنے لگی۔

"دودھ کے لئے میٹھا نہیں ہے"

"کوئی مضائقہ نہیں یہی امرت ہے"

ہم غریبوں کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے اچھی اچھی چیزیں کھانے والے۔ جو روکھی سوکھی ہے آج اسے ہی کھا لیں مگر وہاں جا کر ہنسی نہ اڑائیں کہ آپ کے ہاں کھانے کو کچھ نہ ملا تھا"۔

میں ہنس پڑا اور کہا۔

"خوب اس سے بڑھ کر اور چیز بھی کیا لذیذ ہو سکتی ہے دودھ سے تو سب کچھ بنتا ہے۔ دنیا کی تمام نعمتیں اسی ایک دودھ کی بدولت ہیں"۔

وہ بھی ہنس پڑیں۔ اور میں نے دیکھا کہ لڑکی کے رخسار حجاب سے انتہائی سرخ ہو کر دھوکا دینے لگے۔ کہ لہو گرا کہ گرا۔

میں نے کھانا کھا لیا تو وہ بھی کھانے لگیں۔ گھر کی مالکہ بھی کام سے فارغ ہو کر مویشیوں کو چارہ وغیرہ دے کر میرے پاس فرش پر آ بیٹھی۔ لڑکی سو گئی ہو گی یا وہ بھی ہماری باتیں سن رہی ہو گی معلوم نہیں۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ روشنی بھی کمرے میں آ رہی

کی ہی تھی میں نے کہا

"اچھا پھر۔ کہاں رہتے ہیں۔ کچھ پتہ وتہ؟"

"ہاں۔ جہاں تصویریں چلتی پھرتی ہیں۔ ناچتی اور گاتی ہیں۔ ساری ساری رات تماشے ہوا کرتے ہیں

روشنی پکاتے ہیں۔ کیا کہا؟ میکلوڈ روڈ پر؟ کیا نام ہے ان کا؟

وہ جھجکی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اور کہا۔

بہت دھار جاتے ہیں نا۔ جو جل وہاں سے لاتے ہیں۔ اُسے کیا کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "گنگا جل"

"بس بس۔ یہی۔ جل چھوڑ کر باقی کے نام کو چھوٹا کر لیں۔ "گنگو"۔

"ہاں۔ ہاں۔ اُن سے کہنا۔ کئی مہینے گذر گئے۔ آپ نے یاد تک نہیں کیا۔ نہ کوئی خط لکھا۔ اتنی دور رہ کر اتنی دیر چٹھی لکھنے میں نہ کیا کریں۔ میں اداس ہو جاتی ہوں۔ آپ کے حق میں بیٹھ کر آپ کے سہارے زندگی کے دن گذار رہی ہوں اور بابو! ذرا آپ ہی خیال کریں۔ جس چکوری کا چاند میں چاندنی میں دور رہ کر اسے تڑپا رہا ہو۔ اس چکوری کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے۔ میں نہیں کہتی کہ وہ جان بوجھ کر وہاں جا بیٹھے ہیں۔ یا وہ میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ مگر کیا کریں مجبور ہو گئے ہیں۔ تنگ آ کر گئے ہیں۔ یہاں گذارا نہیں۔ یہاں ہوتے تھے تو کوئی دن گھر رہنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ بنت بیگار سرکاری لوگوں کے ڈیروں میں بوجھ اٹھانے کا کام۔ آج یہ نہیں وہاں۔ بلا مزدوری۔ آج جنگلات کا آفیسر ہے۔ تو کل مال ... پرسوں پولیس کا۔ اگلے دن اور کوئی۔ بس اسی طرح تانتا ان ... بندھا رہتا ہے ان لوگوں کے دوروں سے رعایا کو یہ فائدہ پہنچ رہا ہے کہ آئے دن لوگ گھروں سے بے گھر ہو رہے ہیں ان افسروں کے مظالم سے تنگ آ کر دور کسی دیس میں اپنی بے کسی کے دن گذارنے جا رہے ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہم غریبوں کی کہیں شنوائی نہیں۔ اور ان آفیسروں کو کوئی پوچھتا نہیں۔

اور بابو! ان سے کہنا۔ گھر آئیں۔ لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ اس کے بیاہ بر کا کوئی بند و بست کریں۔ نہیں تو خرابی ہی ہے۔ اور بدنامی۔ جنگل کا رکھوالا روز آ جاتا ہے۔ پٹواری بھی آتا جاتا یہاں ہی ستانے لگتا ہے۔ ایک دن دونوں میں ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔ ایشور نے بچایا ورنہ خون خرابہ ہو چلا تھا۔

اور بابو! اُن سے یہ بھی کہنا۔ کہ میں مجبور ہوں۔ میں آپ کے بغیر اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ حد ہو چکی ہے مجھے ڈر لگتا ہے جو بھی ڈیرہ کسی کا آتا ہے۔ نمبردار ہمارے ہی اتارتا ہے۔ میں اکیلی عورت اور نوجوان کنواری۔ وہ سرکاری آدمی خواہشات کے بندے گھور گھور کر دیکھنے سے جان ہی نکال لیتے ہیں۔ آپ آ جائیں۔ اپنا گھر سنبھالیں۔ چاہے جس طرح ہو۔ رہیں۔

اور ان سے یہ بھی کہئیں۔ کہ آ کر ساہوکار کا بھی حساب کریں لڑکا چار سال سے اس کے ہاں کام کر رہا ہے تنخواہ نہ مزدوری۔ اب تک اس کا قرضہ ادا ہوا کہ نہیں۔ اپنے نور نظر کی طرف خیال کریں۔ یہ دن اس کے کھیلنے کودنے کے ہیں۔ ہمارا اس نے کیا دیکھا ہمارے ہوتے۔ ماں باپ کے ہوتے وہ معصوم بچہ اپنی زندگی ساہوکار کی غلامی میں بسر کرے۔ حیف ہے ہماری زندگی پر اسے اس غلامی سے نجات دلائیں۔ اس کا دوش بھی کیا ہے۔ قرضہ چڑھایا ہوگا۔ آپ نے یا آپ کے باپ دادا نے۔ اس لئے اپنے لخت جگر کو بچائیں۔ اب اس حال میں ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ لگتے ہاتھ بابو! یہ بھی کہہ دینا بڑی مہربانی ہو گی آپ کی۔ کہ وہ آ جائیں۔ نہ اسی پر کرپا کریں ایک بار درشن دے جائیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں۔

اور بابو! ایشور کے واسطے اُن سے یہ بھی کہنا کہ جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں۔ آکاش منڈل میں بگلوں کی قطاروں پر قطاریں اڑتی چلی جاتی ہیں۔ گھٹائیں امڈ امڈ کر آنے لگتی ہیں۔ مور صدائیں لگاتے ہیں ایک عجیب سماں بندھ جاتا ہے۔ اس بہار کے موسم میں آپ کی یاد مجھے اُس مچھلی کی مانند کر دیتی ہے۔ جو پانی سے نکال کر ریت پر پھینک دی ہو مجبور بے اختیار کہہ اٹھتی ہوں۔ میرا ساجن کلیا پہ دیس میں ہے۔ اے پپیہا! تیری پی پی کی رٹ مجھے

اتھی نہیں بھاتی۔ کیوں جان کھائے جارہے ہو۔ بجلی چمکتی ہے۔ ہلکی ہلکی پھواریں برستی ہیں۔ بادل گرجتا ہے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آتے ہیں جاتے ہیں۔ اور جب آپ کو پاس نہیں پاتی تو آگ سی لگ جاتی ہے۔ ڈرتی ہوں، روتی ہوں اور اس قدر روتی ہوں کہ مینہ کی پھواروں کو بھی مجھے دیکھ کر رشک آتا ہے اور دعائیں دیتی ہوں ان کی جان کو کہ جن کے مظالم اور زبردستیوں سے تنگ آکر وہ خانماں برباد ہوئے گھر سے بے گھر، بال بچوں سے علیحدہ، مجھ سے دُور شاید کس حال میں پڑے ہیں۔ ذرا میری طرف سے انہیں پوچھ بھی لینا کہ بھولے سے کبھی یاد کیا ہے یا نہیں؟

اور بابوا! ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ چاندنی راتیں ہوتی ہیں۔ عالم نور کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خوبصورت اور جوان ہو جاتا ہے اور کیا کبھی ان راتوں کو بھی یاد کیا ہے یا نہیں جب یہاں ہوتے تھے تو بانسری بجا کر ایک دنیا کو اکٹھا کر لیتے تھے۔ پھر ساری ساری رات یہی شغل رہتا تھا۔ رونق ہوتی تھی۔ خوف کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اب کی راتوں میں تو کروٹ پہ کروٹ لیتے بار نہیں آتی۔ پھر چیتوں کی خوفناک دہاڑیں سنائی دیتی ہیں لوگ زخمیوں کو ڈرانے کے لئے آگ جلاتے ہیں۔ ڈھول بجاتے ہیں۔ تو میری جان ہی نکل جاتی ہے۔ ان سے کہنا میں مجبور ہوں جلدی آئیں۔ میرا ان حالوں زندہ رہنا مشکل ہے۔ اگر کہیں لڑکی کا بار اتارا کر جائیں۔ ایسا نہ ہو دل کی دل ہی میں رہے۔

اور بابوا! میں کیا کہوں۔ یہ بھی کہہ دینا۔ جب ہوائیں بادل کو اپنے آغوش میں لئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتی ہیں۔ دھند پڑجاتی ہے، سورج کا نام نہیں رہتا۔ دن کو بھی رات کا سماں ہوتا ہے۔ لڑکا کہیں آپ کہاں۔ لڑکی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مویشی نظر نہیں آتے بھیڑ میں گم ہو جاتی ہیں اور اپنے آپ کو اکیلا پاتی ہوں۔ ایسے عجیب موسم میں خوش قسمت لوگ ہی اکٹھے بیٹھ کر آنند خوشی میں گذارتے ہیں۔ لیکن مجھے تلاش ہوتی ہے۔ اپنے ساجن کی۔ جو کہ مجھ کمبخت زمانے کے ہاتھوں زبردستی علیحدہ کئے گئے ہیں۔ بس بابوا! رات زیادہ چلی گئی۔ اب سوجائیں۔ تھکے آئے ہیں آپ۔ یہ کہہ کر وہ سو گئی لیکن مجھے۔ مجھے اس روز سے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے۔

سوچتا ہوں۔ ایسے ایسے انسان بھی ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے سب کچھ میسر ہے اور پھر قسمت میں نہیں۔ اور ایک بات۔ وہ یہ کہ جب میں واپس پہنچا گنگو کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ کل ہی بچارہ بعارضہ انفلوئنزا ہمیشہ کے لئے سو گیا ہے۔ اُف سندیسہ پہنچاؤں کسے اور جب وہ سنیں گی تو۔ ان کا کیا حال ہوگا؟

بملا گپت

یاد

ساجن تمہاری یاد بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سا خوش بخت دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔ جسے تمہاری یاد کی الٰہی نعمت میسر ہے۔ پھر یہ بھی یقین جانئے ساجن اگر تمہاری یاد میرے روم روم میں رچی نہ ہوتی تو اس زندگی کی بھی کوئی قیمت تھی! رات بھر تمہاری جدائی میں تڑپتی ہوں۔ صبح اٹھتے ہی جس پیارے اور منور چہرے کا عکس میری آنکھوں میں چمک جاتا ہے وہ تمہارا ہی تو ہوتا ہے۔ اور ساجن! دن بھر کام کاج میں اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے میری نگاہیں تیرے ہی درشنوں کو ترستی رہتی ہیں اور یہ نگوڑی آتما ہے کہ ایک لمحہ بھی تمہیں یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر تمہاری یاد میرے دل میں نہ ہو تو میں شاید اس جہان میں زندہ بھی نہ رہ سکوں۔

ایم۔ اے عزیز

نوشتۂ تقدیر

(۳)

افراد ڈرامہ

باقر علی:۔ امجد کا باپ
زبیدہ:۔ امجد کی ماں
بڑی اماں:۔ زبیدہ کی ماں
اصغر:۔ امجد کا بڑا بھائی
امجد:۔ باقر علی کا دوسرا بیٹا
اسد اللہ:۔ امجد کا چچا
انور:۔ امجد کا ماموں (بڑی اماں کا بھتیجا)
زہرہ:۔ انور کی بہن
محمودہ:۔ زہرہ کی بیٹی
صادقہ:۔ محمودہ کی سہیلی
خادمہ

پانچواں سین

(شادی سے ڈیڑھ سال بعد)

زہرہ کے گھر کی نشستگاہ

زہرہ:۔ انور ابھی نہیں آئے۔ انہیں کہا تھا کہ اتوار کو صبح ہی آ جائیں ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

محمودہ:۔ اب تو آٹھ بج چکے ہیں ابھی تک کیوں نہیں آئے۔

زہرہ:۔ ممکن ہے ابھی چائے سے فارغ نہ ہوئے ہوں۔

محمودہ:۔ اچھی اماں۔ آج تو میری قسمت کا فیصلہ کرا ہی دیں۔

زہرہ:۔ دیکھئے وہ کیا مشورہ دیتے ہیں۔

(انور داخل ہوتا ہے)

انور:۔ باجی آداب۔

زہرہ:۔ جیتے رہو۔ بڑی دیر کر دی۔

انور:۔ کچھ دوست آ گئے تھے۔ باہر جانے پہ اصرار کرتے تھے میں نے معذرت کر دی۔

زہرہ:۔ اب محمودہ کی بچی بھی دو ماہ کی ہو چکی ہے۔ اور اسے کہتی ہوں کہ سسرال جائے مگر نام نہیں لیتی۔

انور:۔ بلقیس کو گود میں لے کر۔ کیسی موہنی صورت ہے محمودہ ہے، جب امجد بلقیس کو دیکھے گا تو تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔

محمودہ:۔ نہیں ماموں جان۔ بلقیس کے ابا کے دل میں تو رحم کی رتی نہیں۔

انور:۔ دیکھو۔ وہ سب تمہیں چاہتے ہیں۔ فقط امجد ہی ناراض ہوتا ہے۔ لیکن وہ سب اسے کوستے ہیں۔ پہلے امجد آیا تو اس وقت تم بیمار تھی اسے واپس بھجوا دیا۔ پھر بلقیس کے عقیقہ پر زبیدہ آئیں اور انہوں نے تمہیں بھیجنے کی تاکید کی اب دو ہفتہ سے تو ان کے خط پر خط آ رہے ہیں کہ وہ بھی بلقیس کی موہنی صورت دیکھیں۔

محمودہ:۔ یہ تو مجھ سے ہونے کا نہیں میں شادی کی زندگی سے باز آئی۔ مجھے طلاق لے دیجئے۔ میں گھر بیٹھوں گی۔ اور اپنی دکھی بہنوں کی سیوا کروں گی۔

انور:۔ جب تک امجد طلاق نہ دے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

محمودہ:۔ کیوں شرعی حکم کے مطابق عورت اپنے جہیز کا کچھ حصہ دے کر طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ میں تو سب جہیز انہیں

دیتی ہوں۔

انور:۔ وہ تو شرع کا قانون ہے۔ لیکن مسلمان تو اب رواج کے پابند ہیں۔

محمودہ:۔ تو کیا مردوں نے خدا کے دیئے ہوئے حقوق بھی غصب کر لئے؟

انور:۔ کچھ سمجھو۔

محمودہ:۔ میں آئندہ مردوں کی غلامی سے باز آئی۔ میری زندگی کا مقصد میرے سامنے ہے۔ بلقیس کو پڑھاؤں گی۔ اُسے مذہبی تعلیم کے علاوہ وکالت پڑھا کر اس کی اپنی زندگی عورتوں کے غصب شدہ حقوق کے حاصل کرنے کے لئے وقف کر دوں گی۔

انور:۔ مگر اس سے کیا ہوگا۔ جنہوں نے خدا کے حکم کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ دو نحیف آوازوں سے کیسے متاثر ہوں گے

محمودہ:۔ ایک دکھی دل کی آواز دنیا کو جگا دینے کے لئے کافی ہے۔

زہرہ:۔ میں تو کئی دن سے محمودہ سے کہہ رہی ہوں کہ اب تم صاحب اولاد ہو، اپنی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کرو۔ اور اپنا گھر جا کر آباد کرو۔

محمودہ:۔ آپ دونو بزرگ ہیں۔ میری بات اچھی طرح سے سن لیں۔ میں نے شادی کا ڈیڑھ سال دیکھ لیا۔ جس قدر میں نے مصیبتیں جھیلی ہیں اور جس بُرد باری سے وقت کاٹی ہے۔ وہ صرف میں ہی جانتی ہوں پچھلی دفعہ جب آپ مجھے چھوڑ آئے تو چار ماہ جس مصیبت سے کٹے بس تو بس ہی بھلی۔ امید صرف میرے سسر سے ختم کھلتے ہیں۔ اور وہ جب گھر موجود نہ ہوں۔ تو ایک کہرام مچ جاتا ہے اور مجھے اپنی زندگی بھی خطرے میں نظر آتی ہے۔ وہاں بھیجنے سے بہتر یہاں ہی خاتمہ کر دو۔

انور:۔ یہ تو معاملہ بہت پیچیدہ ہو گیا۔

(دروازہ پر دستک۔ نوکر تار لا کر انور کو دیتا ہے)

انور:۔ (جلدی سے تار پڑھتا ہے) باقر علی حرکت قلب کے بند ہونے سے فوت ہو گئے ہیں۔

محمودہ:۔ (بے اختیار روتے ہوئے) میرا آخری سہارا بھی جاتا رہا۔

انور:۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زہرہ:۔ مصیبتیں اکیلی نہیں آیا کرتیں۔

انور:۔ اب کیا صلاح ہے۔

زہرہ، محمودہ:۔ اب تو جانا ہی ہوگا۔

انور:۔ تیسرے کے بعد آنا ہوگا۔ میں تین روز کی رخصت لیتا ہوں

زہرہ:۔ کب چلنے کا خیال ہے

محمودہ:۔ ابھی چلنا چاہیئے۔ آپ نماز جنازہ میں تو شریک ہو سکیں۔ ابھی تو ٹرین کا بھی وقت ہے۔

انور:۔ اچھا میں نصف گھنٹہ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔ (محمودہ سے) تم تو سامان بھی ساتھ رکھ لو۔ کیونکہ تمہیں تو اب وہاں کچھ عرصہ ٹھہرنا بھی ہوگا۔

محمودہ:۔ (سر جھکا کر) بہت اچھا۔

(پردہ گرتا ہے)

چھٹا سین

(شام کا وقت۔ انور، زہرہ، محمودہ جنازہ کے وقت پہنچ جاتے ہیں۔ انور جنازہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اصغر جنازہ پر نہیں پہنچ سکا۔ تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ دوسرے دن اصغر بھی کلکتہ سے پہنچ گئے۔ اور تیسرے دن سب مہمان رخصت ہوتے ہیں محمودہ پیچھے ٹھہرتی ہے)

(اصغر، اسد اللہ، زبیدہ اور بڑی اماں)

اصغر:۔ چچا جان۔ یہ تو مصیبت کا ایک بوجھ سر پر گر پڑا۔ تیسرے کے بعد مہمانوں کو بھی اسی لئے رخصت کیا ہے کہ کچھ تدبیر سوچی جائے۔

اسد اللہ:۔ ہاں بزرگوں کا دم غنیمت ہوتا ہے۔

اصغر:۔ میں تو حیران ہوں کہ گھر کا انتظام کیسے چلے گا۔

اسد اللہ :۔ میں بھی اسی فکر میں ہوں۔

اصغر :۔ کیوں امّاں جان۔ اب فکر سے تو کچھ بننے کا نہیں صلاح حال کی فکر کیجئے۔ امجد تو کسی کو خاطر میں لانے کا نہیں۔ گھر کا انتظام کیسے ہوگا۔

زبیدہ :۔ مجھے تو کچھ ہوش نہیں۔

اسد اللہ :۔ امجد کو اب علیحدہ کر دیجئے۔

اصغر :۔ چچا جان۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑی اماں کو ہر وقت کوستا ہے۔ اس کے ہاتھوں محمودہ کی شامت آئی رہتی ہے۔ اور یہ اس وقت کا ذکر ہے۔ جب اباجان کا سایہ سر پر تھا اب اسے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ ان کے لئے وبال جان ہو جائے گا۔

اسد اللہ :۔ تو پھر

اصغر :۔ میرا تو خیال ہے چچا جان آپ یہاں ہی تشریف لے آئیں۔ گھر کا انتظام سنبھالیں اور امجد کے کاروبار کی نگرانی بھی کریں۔ یقین ہے کہ بے چون و چرا سب آپ کا حکم بجالائیں گے

اسد اللہ :۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

(امجد داخل ہوتا ہے)

امجد :۔ میرے بغیر کیا مشورے ہو رہے ہیں ؟

اصغر :۔ اب چچا جان کو گھر کا انتظام سپرد کیا ہے۔ یہی سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ ہر ایک کا فرض ہوگا۔ کہ ان کی تابعداری کرے۔

امجد :۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ نے ان کو ڈکٹیٹر مقرر کیا ہے۔

اصغر :۔ دیکھو امجد۔ حفظِ مراتب سے ہی انسان کی صحیح پہچان ہوتی ہے۔ اور پھر جب ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں تمہیں مذاق کی سوجھی ہے۔

امجد :۔ مذاق تو یہ ہے کہ والد صاحب کے بعد چچا کو ڈکٹیٹر مقرر کرنا۔ میں گھر کا انتظام خود کروں گا۔ وہ اپنے گھر کا انتظام کریں۔

اصغر :۔ دیکھو امجد تم انتظام کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اور پھر بزرگوں کی موجودگی میں چھوٹوں کو سرداری دینا قرینِ مصلحت نہیں۔

امجد :۔ خیر مصلحت وصلحت تو میں جانتا نہیں۔ چچا جی کو سب کچھ میرے مشورہ سے کرنا ہوگا۔

اسد اللہ :۔ میں ہر ممکن طریقہ سے تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن باقی لوگوں کے لئے میرا حکم ناطق ہوگا۔

امجد :۔ بس یہ درست ہے ہم دونو کا حکم۔

محمودہ :۔ تو میرے لئے کیا حکم ہے۔

اسد اللہ :۔ (چڑ کر) تمہارے لئے کوئی نیا ڈکٹیٹر مقرر کرنا ہے ؟

امجد :۔ تمہارے لئے حکم میں دیا کروں گا۔

اصغر :۔ (محمودہ سے) چچا جان بزرگ ہیں۔ وہ تمہاری بہتری کا خیال رکھیں گے۔ بلقیس کا اب کیا حال ہے۔

محمودہ :۔ ابھی بخار تو اسے کم نہیں ہوا۔ وہ پنگوڑہ میں بیہوش پڑی ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے بیٹھی ہوں۔

اسد اللہ :۔ (رعب سے) ایسی فضول باتیں کرنے سے کیا فائدہ

اصغر :۔ اچھا بڑی امّاں صبر کیجئے۔ اماں جان آپ بھی خدا پر بھروسہ کیجئے۔ مجھے صرف چھ دن کی رخصت مل سکی تھی۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

سب :۔ اچھا خدا حافظ۔ (اصغر کلکتہ روانہ ہو جاتا ہے)

بڑی اماں :۔ بیٹی محمودہ۔ تم تین دن سے برابر رو رہی ہو۔ آخر جانے والے کے ساتھ مرنا تو مشکل ہے۔ کچھ کھا لو بیٹی۔ تمہارے فاقے نے اسے بھی بیمار کر دیا ہے۔

محمودہ :۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ مرحوم میرے بڑے ہمدرد تھے

اسد اللہ :۔ (کڑک کر) تو ہم تمہارے دشمن ہیں۔

محمودہ :۔ میں نے مقابلہ تو نہیں کیا۔ صرف انہی کا ذکر کر رہی ہوں۔

زبیدہ :۔ کچھ تو کھاؤ۔ تھوڑا سا دودھ ہی پی لو۔ دیکھو بلقیس کا برا حال ہو رہا ہے۔ تمہاری شب بیداری اور رونے سے وہ ایسی بیمار ہوئی ہے کہ اس نے دو دن سے آنکھ نہیں کھولی۔

محمودہ:- اماں جان ڈاکٹر کو بلا لیں۔
امجد:- (غضبناک ہو کر) ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے چھوٹے بچوں کا علاج ڈاکٹر کیا جانے۔ اب رات کے گیارہ بج گئے ہیں صبح کسی عقلمند عورت کو دکھانا۔
اسد اللہ:- ہاں یہ درست ہے۔
امجد:- اب سب سو جاؤ۔
اسد اللہ:- ہاں یہ درست ہے
امجد:- اس کے بعد کوئی آواز نہ آئے۔
اسد اللہ:- ہاں یہ درست ہے۔
(اسد اللہ اور امجد اپنے اپنے کمرہ میں سونے جاتے ہیں)
زبیدہ:- بیٹی تھوڑی سی چائے پی لو۔ پھر آرام کرنا۔
محمودہ:- جی نہیں چاہتا۔ بلقیس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔
زبیدہ:- اب اسد اللہ اور امجد کو نئی نئی حکومت ملی ہے میں کچھ کر نہیں سکتی۔ ورنہ ڈاکٹر کو ابھی بلاتی۔
محمودہ:- یہ تو میری قسمت ہے۔ آپ بھی کئی دن سے بے آرام ہیں۔ اب ذرا آرام کر لیں۔
امجد:- (سونے کے کمرے سے اونچی آواز دیتا ہے) اب سو جاؤ کوئی آواز نہ آئے۔
بڑی اماں اور زبیدہ:- بیٹی یہ نرالی حکومت ہے۔ اب ہم سونے کو جاتے ہیں۔ تم بھی آرام کرو۔
(خوف کے مارے بڑی اماں اور زبیدہ اپنے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں)
محمودہ:- بلقیس، بلقیس، بولو تو سہی
(سر کی پٹی سر پر رکھتی ہے۔ اور رومال سے اپنے آنسو پونچھتی ہے)
محمودہ:- میری زندگی کے سہارے بولو بلقیس
(بچی کی حالت خطرناک ہو جاتی ہے۔ محمودہ دوڑ کر امجد کو بلا لاتی ہے۔ محمودہ اور امجد داخل ہوتے ہیں)
امجد:- رات کے دو بج چکے ہیں۔ مجھے کیوں بے آرام کیا۔

محمودہ:- ذرا دیکھیں۔ خدا را رحم کریں۔ ذرا ڈاکٹر کو بلوائیں۔
امجد:- نہیں ڈاکٹر کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔
محمودہ:- (ہاتھ جوڑ کر) رحم کرو۔
(بلقیس انگڑائی لیتی ہے۔ محمودہ نبض دیکھتی ہے)
محمودہ:- (رو کر) اب ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی۔
امجد:- کیوں تندرست ہو گئی۔
محمودہ:- ہاں اس نے تکلیفوں سے نجات پا لی۔
امجد:- (نبض دیکھ کر) یہ تو ختم ہو گئی۔
محمودہ:- ہاں معالج حقیقی نے اس کا علاج خود کر دیا۔
(محمودہ چلانا شروع کرتی ہے)
امجد:- دیکھو مجھے بھی تم سے کچھ کم غم نہیں۔ لیکن دنیا میں ضبط بھی کوئی چیز ہے۔ اگر تم نے رونا شروع کر دیا تو ابھی بڑی اماں اور اماں جان یہاں آ کر کہرام مچا دیں گی۔ گلی محلہ کے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ تمام رات آنکھوں میں کٹے گی۔ اس وقت بالکل خاموشی سے سو جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔
محمودہ:- (کچھ سوچ کر) بہت اچھا۔
(امجد اپنے کمرے کو جاتا ہے)
محمودہ:- بلقیس بولو گی نہیں۔ ہم دونوں نے تو عورتوں کو نجات دلانی تھی۔ اُٹھو ہمت کرو۔ مجبور عورتوں کو لوٹنے والے ظالم کا مقابلہ کرنا تھا۔ عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کرنا تھی لیکن تم نے تو ہمت ہار دی مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔
(تمام رات محمودہ بے حس لڑکی کے پاس بیٹھی کبھی باتیں کرتی کبھی خاموش رہتی۔ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو نہ نکلا۔ موت کا بھیانک منظر بھی اُسے ڈرا نہ سکا۔ سونے والے صبح اُٹھے۔ رونے والے رونے لگے۔ لیکن محمودہ پتھر کی مانند خاموش بیٹھی رہی بلقیس کی تجہیز و تکفین بھی ہوئی۔ دفن بھی کر آئے۔ گلی محلے والے رخصت بھی ہو گئے۔ لیکن محمودہ خاموش بیٹھی تھی)
امجد:- بڑی اماں۔ بلقیس کو دفن کر آئے۔
بڑی اماں:- بیٹا۔ اللہ کے سپرد

اسد اللہ:۔ (محمودہ سے) اس طرح خاموش بیٹھنے سے کیا فائدہ۔

امجد:۔ اگر اسی طرح تمہیں تنگ کرنا ہے تو گھر ہی چلی جاؤ۔

بڑی اماں:۔ (امجد سے) بس بس خاموش رہو۔ روتوں کو نہ رلاؤ۔

امجد:۔ بس جو میں کہوں اس پر عمل کرنا ہوگا۔

اسد اللہ:۔ یہ درست ہے۔ گھر کا انتظام بھی آخر کوئی چیز ہے

امجد:۔ کوئی خلاف ہونے لگا۔ تو میرے لئے ناقابل برداشت ہوگا بس اسے جانا ہی ہوگا۔

محمودہ:۔ میں "قل" پڑھانے کے بعد چلی جاؤں گی۔

امجد:۔ اتنی چھوٹی بچی کے "قل" کا کیا مطلب؟

اسد اللہ:۔ وہ تو معصوم تھی۔ اس کے قل کے کیا معنی؟

محمودہ:۔ میں نے اس کے چند نئے کپڑے بنائے تھے وہ "قل" پر دینے ہیں۔

امجد:۔ بس ہر وقت خیرات ہی سوجھتی ہے۔

زبیدہ:۔ (امجد سے) بس خاموش رہو۔ ایسی بدسلوکی کی مثال کہیں بھی نہیں ملے گی۔

امجد:۔ بس جو میں کہوں گا وہی ہوگا۔

زبیدہ:۔ (اسد اللہ سے) تم اسے کیوں نہیں سمجھاتے۔ یہی گھر کا انتظام ہو رہا ہے۔

اسد اللہ:۔ (آنکھیں بدل کر) محمودہ کیوں خاوند کا کہنا نہیں مانتی مجھے امجد سے سو فیصدی اتفاق ہے۔

امجد:۔ بس اسے جانا ہی ہوگا۔

اسد اللہ:۔ اسے ہر حالت میں جانا ہی ہوگا۔

محمودہ:۔ اچھا میں چلی جاتی ہوں بڑی اماں اور اماں جان آداب دعا کیجئے گا۔

زبیدہ:۔ نہیں بیٹی تمہیں ہرگز کوئی نہیں بھیج سکتا۔

بڑی اماں:۔ کسی کو کیا اختیار ہے کہ تمہیں یہاں سے بھیجے۔

امجد:۔ خاموش مجھے اختیار ہے اسے جانا ہی ہوگا۔ چچا جان اسے اسٹیشن پر چھوڑ آؤ۔

بڑی اماں:۔ تم بھی مظلوم اور ہم بھی مجبور۔ بیٹی کچھ کھانا لو کچھ سامان ساتھ رکھ لو۔

محمودہ:۔ سامان کی کیا ضرورت ہے۔

بڑی اماں:۔ کیوں۔

محمودہ:۔ دنیا چند روزہ ہے اماں۔ سامان کب تک ساتھ دے گا۔ آداب

(اسد اللہ اور محمودہ باہر آتے ہیں)

(زہرہ کے صحن میں اسی روز تین گھنٹے کے بعد)

زہرہ:۔ محمودہ تم اتنی جلدی آ گئیں؟

محمودہ:۔ نہیں میں تو نہیں آئی۔

زہرہ:۔ اور کون؟

محمودہ:۔ انہوں نے بھیجا ہے۔

زہرہ:۔ کیوں؟

محمودہ:۔ کہتے تھے تمہیں جانا ہی ہوگا "قل" سے پہلے ہی جانا ہوگا۔

زہرہ:۔ "قل" کیسے۔ باقر علی کے "قل" کے بعد تو ہم آئے تھے۔

محمودہ:۔ "قل" سے پہلے بھی تو لوگ چلے جاتے ہیں۔

زہرہ:۔ سامان کہاں ہے؟

محمودہ:۔ مسافر سامان کے بغیر آرام سے رہتا ہے

زہرہ:۔ بلقیس کہاں ہے؟

محمودہ:۔ کیسی بلقیس؟

زہرہ:۔ بلقیس! بلقیس!

محمودہ:۔ کون بلقیس؟

زہرہ:۔ کیا بلقیس کو امجد لا رہے ہیں۔

محمودہ:۔ (خوف سے) کیا۔ ا۔۔ م ۔۔ جد ۔۔۔ آ رہے۔

(محمودہ کا یہ جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ اور زمین پر گر پڑی)

زہرہ:۔ ہائے۔ قسمت

(زہرہ رو رہی ہے
پردہ گرتا ہے)

محبوبہ یاسمن

چاند اور چکور

۱۰ اگست ۱۹۴۵ء

میرے محترم ——— آداب

بھئی ڈرتے ڈرتے نہیں بلکہ پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ تمہارے نئے ارشاد کی تعمیل نہ کرسکوں گی۔ کاش تم مجھے یہ کہو کہ میں اپنی ریاضت اور عبادت تمہاری نذر کردوں۔ اپنی آرزوئیں اور ارمان تمہیں سونپ دوں اور وہ نسائیت جو عورت کا حقیقی جوہر ہے اسے تمہارا محکوم بنا دوں۔ مگر خدارا مجھے یہ نہ کہو۔ کہ میں تمہارے لکھے ہوئے خطوط تمہیں واپس لوٹا دوں۔ یہ مجھ سے نہ ہوسکے گا میری اداس تنہائیوں میں یہی خطوط ہیں جو مجھے تسکین دیتے ہیں۔ اپنے پاس رکھنے سے کیا فائدہ" پوچھتے ہو نا؟ آہ...... تمہیں کیا بتاؤں ان میں میرے لئے کیا کچھ موجود ہے۔ تم باور کرو یا نہ یہ میرے نادیدہ اتالیق ہیں۔ جب تم پاس نہیں ہوتے۔ انتہائی کرب و اضطراب میں گذرتی ہے۔ تڑپ اٹھتی ہوں۔ تب یہ خطوط دل کی تسکین بن کر روح کو تازگی بخشتے ہیں میں انہیں پڑھتی ہوں اکثر پڑھتی ہوں۔ اور محسوس کرتی ہوں کوئی مجھ نیند کی ماتی کو بیدار کررہا ہے۔ جگا رہا ہے۔ اور میرے سراپا کو جگاتا ہوا جادو بنا رہا ہے۔ جس پر میرا مستقبل ناز کرے گا میرے احساسات فخر کریں گے اور میں اپنی قلبی عقیدت تم پر نچھاور کردونگی لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ خط واپس نہ کرنے کے حیلے بنا رہی ہوں۔ اور تمہارے حکم کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں ٹال دینا چاہتی ہوں۔ بھئی تمہارے حکم کی اہمیت سمجھتی ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے وقار کا کتنا پاس ہے۔ مگر اس کے باوجود میں مجبور ہوں اور دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا حکم مجھے بے تابیوں کے آغوش میں پھینک دینا چاہتا ہے۔ کیا جھوٹ ہے؟ بتایئے میرے اچھے محسن بتایئے۔ کیا "وہ" آغوش میرے لئے آسودگی اور اطمینان مہیا کرسکتا ہے؟ ہاں میں بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ میری بیزاری تمہارے لئے سوہان روح سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ بخدا سچ کہو کیا تم چاہتے ہو کہ میری زندگی تشنہ تکمیل ہے جب میں کھلے خزانے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے خطوط میری نئی زندگی کے معمار ہیں اور یہ ایسے معمار ہیں کہ میرا انگ انگ ان سے پیار کرتا ہے والہانہ پیار۔ تو پھر تم مجھے کیوں دق کرتے ہو؟ کیوں مجبور کرتے ہو کہ میں آنسو بہاؤں۔ وہ آنسو کہ جن کے نہ بہانے کی تم التجائیں کرچکے ہو۔ وعدہ لے چکے ہو۔ کہ یہ انمول موتی ہیں مفت میں کیوں لٹاتی ہو——کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے خطوط واپس کرکے اپنا سب کچھ لٹا دوں۔ تمہارے ادب کی قسم۔ سچ کہتی ہوں کہ وہ خطوط میرے اندھیارے جیون میں چمکتے ہوئے تارے ہیں جن سے میری کائنات روشن ہے ہاں اگر یہ چاہتے ہو کہ میری دنیا تاریک ہوجائے تو کل ہی تمام خطوط واپس کردونگی لیکن مجھے یقین نہیں کہ تم وہ چاہو جو میں نہ چاہوں اور میں وہ چاہوں جو تم نہ چاہو۔ کیونکہ ہم آج اس سنگم پر پہنچ چکے ہیں جہاں دوئی کا تصور مٹ جایا کرتا ہے۔ یقین نہیں تو اپنے دل سے پوچھو اوہ۔ معاف کرنا بھئی۔ وہ تمہارے پاس ہے ہی کہاں؟ تلاش کرو وہ تو کب کا کھو گیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ البتہ کہیں ادھر ادھر تم ایک ٹوٹا ہوا دل پاؤ گے۔ اس سے پوچھو شاید وہ کچھ بتا سکے۔ مگر یاد رہے وہ دل نہایت دکھی اور دردمند ہے ذرا ادب سے ہمکلام ہوجیے گا۔ وہ ایسے اطمینان رکھیے تنگ نظری اور کم ظرفی اس کا شعار نہیں ہے اتنا وسیع ہے کہ ساری کائنات اس میں سما جائے ——— فرمایئے اب کیا ارشاد ہے۔ یہ منہ لبورنا کون مانے گا۔ صاف کہیئے کہ ہار گئے ———

طبیعت آج کچھ غیر معمولی طور پر اداس ہے۔ جانے کیوں!

جواب کی منتظر
تمہاری نیلوفر

---

۱۳ اگست ۴۶ء

اچھے "نٹ کھٹ" ——— آداب

رات خواب میں تم نے خوب ستایا۔ تڑپایا لیکن گدگدانے کی ایک کوشش نہ کی۔ جس سے ساری کوفت جاتی رہی تمہارا تڑپانا اور ستانا بھی گوارا ہو گیا۔ سچ جانو۔ رات ہی معلوم ہوا کہ روٹھے ہوئے کو منانے میں کیا مزا ملتا ہے یہ کیا طلسم ہے کہ ہوش میں تو تم کبھی روٹھتے نہیں۔ بس ہمیشہ خواب میں ہی روٹھتے ہو۔ ہاں دل چاہتا ہے۔ کہ ایک بار ہم دونوں ہوش میں بھی روٹھ جائیں۔ ایسے روٹھیں کہ پھر کبھی نہ منیں ——— مسکراؤ نہیں بھئی۔ آج صبح صبح ہی خط لکھ رہی ہوں۔ اس لئے بقول غالب ؎

بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

لیکن تم ٹھہرے نٹ کھٹ۔ دلوں کے راز معلوم کرنے والے بھلا تم سے یہ توقع کب کی جا سکتی ہے۔ کہ کچھ نہ سمجھو۔ لیکن خدارا یہ سب کچھ کہیں سچ نہ سمجھ لینا۔ جو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ میں روٹھنا نہیں چاہتی اور نہ منانا اور نہ ہی منے سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ بس

؎ اٹھا لو پاندان اپنا میں باز آئی محبت سے

ہائے یہ ادبی ذوق بھی بڑا ظالم ہے۔ عبارت میں شعر کو استعمال کر لینے کی ترغیب تو دے دیتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتا کہ کیا کہلوانا چاہتا ہے میں اور محبت سے باز آؤں! ——— بھئی محبت ہی تو انسانی زندگی کی صحیح روح ہے۔ اساس ہے کہ جس پر ہمارے اخلاق و کردار کی عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں مگر محبت میں خلوص، پاکیزگی اور بے لوث پن ہونا چاہئے۔ نفسانیت کے شیدائی محبت کے نام کو بدنام کر دیتے ہیں۔ لو ایک تازہ واقعہ سنو پڑوس میں آج ہنگامہ ہو گیا۔ میاں بیوی میں بنتی نہیں۔ میاں بیچارا ہے مزدور اور بیوی صاحبہ ہیں نئی روشنی کی۔ ناز نخرے والی۔ یہ تمنائیں ہوئے کہ اس سے کوئی رومان پرور محبت کرے۔ پیار بھری نظروں سے دیکھے اور دل میں چھپائے۔ میاں اس پر جان چھڑکتا ہے مگر اسے باہر کی چاٹ لگی ہوئی ہے آج صبح گھر سے تین گھنٹے غائب رہی۔ میاں بڑا سٹپٹایا۔ تلاش میں نکلا۔ سارا شہر چھان مارا۔ بالآخر باغ میں جا پکڑا۔ لایا۔ گھر لا کر اندھا دھند پیٹا۔ ذرا میاں بیوی کا مکالمہ سنئے۔

"مرتا بھی نہیں مردار۔ میری زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے۔" بیوی نے کہا۔

"تمہیں ساتھ لے کر مروں گا۔ اس سے پہلے امید رکھو میرے بعد تماشے کرنا چاہتی ہے نا۔ یہ میں کیسے ہونے دوں گا۔" میاں نے جواباً کہا۔

"میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ تم مجھے پسند نہیں۔ پھر مجھے زبردستی کیوں گھر میں ڈال رکھا ہے؟"

"لیکن تمہاری پسند اور ناپسند دیکھتا کون ہے پسند تو میری ہے۔ جو تمہیں بیاہ لایا۔ اور تمہارے ماں باپ کو اپنا مکان بیچ کر تمہاری قیمت ادا کی۔"

"ستیاناس میرے ظالم ماں باپ کا کہ جنہوں نے تم جیسے اجڈ، بے شکل اور جاہل کے پلے باندھ دیا۔"

اس پر میاں نے اسے بے پناہ پیٹا۔ کسی نے ان کی لڑائی میں دخل نہ دیا۔ محلے کی شریف بہو بیٹیاں اس عورت سے نفرت کرتی ہیں۔ تم اس مسئلہ پر روشنی ڈالو۔ کیا وہ نفرت کرنے میں حق بجانب ہیں؟ کسی آئندہ خط میں، میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں گی ——— ہمارے سماج کی یہ خامیاں کب دور ہوں گی؟ بے جوڑ شادیاں۔ لڑکیوں کی خرید و فروخت اور شادی شدہ عورتوں کی تاک جھانک۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟

ہمارے سماج میں ہمارے دلیں ہیں۔ کیوں، آخر کیوں؟
قدرے سکون پذیر
نیلو فر

---

۱۷ اگست

بھلا آدمی ——— نسیم

وہ سامنے چودھویں کا پورا چاند چمک رہا ہے۔ میں اُسے دیکھ رہی ہوں۔ بدستور دیکھ رہی ہوں۔ اور نہ جانے کب تک دیکھتی رہوں گی۔ میری اس خوش نگاہوں میں نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ منطق بلکہ میری نگاہیں ایک عام اداس نگاہوں کی طرح چاند کی چاندنی سے کچھ سکون پا رہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی میرے دل میں امنگ اٹھتی ہے۔ کہ اڑتے ہوئے چکور کو بھی دیکھ لوں۔ جس کی ساری جدوجہد چاند تک پہنچنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ کیا یہی وہ چاند ہے جس کے لئے چکور ساری ساری رات وسیع فضاؤں میں محو پرواز رہتا ہے؟ اگر یہی ہے تو مجھے چکور کے مذاق الفت پر شک آتا ہے کہ اس نے دنیا میں ایک ایسے محبوب کا انتخاب کیا کہ جس کا کوئی ثانی نہیں۔ یہی سوچتی ہوں کہ چکور تاریک راتوں میں کیا کرتا ہوگا۔ یا اس وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہوگی جب وہ اپنے چاند کے قریب تو پہنچ جائے لیکن یکایک کوئی آوارہ بدلی چاند کو اپنے دامن میں چھپا لے۔ چکور کا دل ٹوٹ جاتا ہوگا اس وقت اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنے بسیرے کی طرف لوٹ آتا ہوگا ہائے یہ مایوسی کس قدر درد انگیز ہوتی ہے ——— میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر چاند کے بس میں یہ ہو۔ تو وہ چکور کا دل کبھی بھی ٹوٹنے نہ دے اور نہ ہی کبھی گھنائے کسی بدلی کو اجازت نہ دے کہ اس کو چھپائے اور نہ ہی کبھی طلوع ہونے میں دیر کرے۔ کہ جس سے چکور کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے ——— اگر میں چاند ہوتی تو اپنے چکور کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتی بلکہ مہربانی کشش سے چکور کو اتنا قریب کر لیتی کہ قریب ہونے کی تمام تمنائیں جو چکور کے دل میں تڑپتی رہتی تھیں ایک دم پوری ہو جاتیں ——— مگر میں نہ ہی تو چاند ہوں اور نہ میرے چکور میں والہانہ محبت کے ایسے شدید جذبات ہیں کہ جن سے متاثر ہو کر میں سچ مچ چاند بننے کی دعائیں کروں۔ میں گراہ چست مدعی سست والی بات پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ سامنے والا چاند میری نگاہوں کے سامنے چمکتا رہے اور میں دیکھتی رہوں بدستور دیکھتی رہوں اور یوں ہی خط لکھتی چلی جاؤں شاید اس وقت میرا چکور بھی چاند کو دیکھ رہا ہو۔ اور ہماری نگاہیں فضا میں کئی بار مل چکی ہوں۔ لیکن نہیں وہ چاند کو نہیں دیکھ رہا اور نہ ہی ہماری نگاہیں فضا میں مل چکی ہیں۔ اگر مل چکی ہوتیں تو یہ اداس نہ رہتیں۔ لیکن یہ تو اب بھی اداس ہیں۔ چاند کو تقریباً دو گھنٹے دیکھنے کے بعد بھی اداس ہیں واقعی اپنے اور پرائے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بھلا پرائے کو کیا پڑی ہے کہ ان کی اداسیوں کو دور کرے اور جب اپنا بھی نا امید کر دے تو پھر یہ شعر لبوں پر آ جاتا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کیا شاعر کے تخیل سے تمہیں اتفاق ہے۔ کم از کم مجھے تو نہیں مرنے کے بعد چین کی توقع فضول ہے۔ جب یہاں کچھ نہ ملا تو وہاں کی امید پر دل کو جھوٹی تسلیاں دینا میرے نزدیک عقلمندی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ موت تمام غموں سے نجات دلا دیتی ہے لیکن اس کا کیا ثبوت کہ وہ خوشیوں کو بھی فراہم کرتی ہے؟ ——— ہوئی نہ وہی بات۔ چاند کو کسی آوارہ بدلی نے اپنے میں چھپا لیا۔ اب بتاؤ کہ میں خط کیسے لکھوں چاند کی روشنی میں خط لکھنے سے ایک خاص قسم کا لطف آ رہا تھا۔ اب انتظار کرتی ہوں کہ بدلی کو چاند، چکور اور مجھ پر رحم آ جائے ——— پورے بیس منٹ کے بعد چاند نے پھر اپنا چمکتا چہرہ دکھایا اس دوران میں میں یہی سوچتی رہی کہ اتنے دن بیت گئے مگر تمہیں آنا گوارا نہ ہوا۔ پہروں انتظار کیا۔ راہ دیکھی۔ پیغام بھیجا۔ خط لکھا لیکن تم ہو کہ چھوٹی سی بات کو پلے باندھ کر منہ پھلائے بیٹھے ہو۔

(باقی صفحہ ...)

گلزار احمد فدا

ابّا کے پاس

عید سے ایک دن پہلے

سب خوش تھے۔ بچّوں کو نئے نئے کپڑے پہننے، اچھے اچھے کھلونے لینے اور اپنے اپنے ابّا کے ساتھ عیدگاہ میں نماز پڑھنے کی خوشی تھی۔ جوانوں کو عید کے سنہرے اور دلفریب تحفوں کی دھن تھی اور بوڑھے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو عیدیاں دیتے، سلام لینے اور دعائیں دینے کے خیال میں مسرور تھے۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ آج سلیمہ بھی خوش تھی۔ آج اس کی آنکھوں نے ایک بھی آنسو نہ گرایا۔ ایک بھی آہ نہ کھینچی۔ وہ جلدی میں کپڑے سی رہی تھی۔ کئی بار سوئی اس کی انگلیوں میں چبھ گئی۔ لیکن اسے کسی بھی چبھن کی پروا نہ تھی۔ بس وہ یہی چاہتی تھی کہ کپڑے جلد تیار ہوجائیں اور جگر کے ٹکڑے اپنے آٹھ سالہ بچے کی تمنّا پوری کرسکے کتنے ہی دنوں سے وہ میٹھے چاولوں کی ہٹ کررہا تھا لیکن اپنی بے بسی اور غریبی کی وجہ سے وہ انور کی ہٹ کو پورا نہ کرسکی تھی۔ آج وہ خوش تھی کہ عید کے دن وہ ضرور میٹھے چاول پکائے گی۔ اور انور کو گود میں بٹھا کر بڑے پیار سے کھلائے گی وہ مسکرائے گا اور وہ اس کا منہ چوم لے گی۔ دور آسمان پر انور کے ابّا کی روح خوش ہوگی کہ اس کے بعد انور کو اس کی ماں کوئی دکھ نہیں ہونے دیتی۔ سلیمہ نے بڑی کوشش کی کہ آج اس کی آنکھیں کوئی آنسو نہ گرائیں۔ وہ ایک بھی آہ نہ کھینچے لیکن وہ ایسا نہ کرسکی۔

اگر آج انور کے ابا زندہ ہوتے تو اس گھر میں کتنی خوشی ہوتی کل وہ اپنے بچّے کو بازار لے جاتے، نئے نئے کھلونے خریدتے عیدگاہ میں نماز پڑھتے انور مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا لیکن آج ...... تب سلیمہ نے آنسوؤں کے ساتھ ایک آہ بھی کھینچ دی۔ اور ماضی کے حسین اور دلربا تصورات میں کھو گئی ——— اسے وہ دن یاد آیا جب انور کے ابّا نے پہلی بار اس کا گھونگٹ اٹھایا تھا اور وہ شرم وحیا سے زمین میں سما جانا چاہتی تھی۔ پھر انور کے ابّا کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ایک لطیف چھیڑ کے بعد تب اس کی گود میں چھپا لیا کتنی سہانی اور روپہلی رات تھی وہ ——— پھر اسے وہ دن یاد آیا جب انور پیدا ہوا۔ ان کے چھوٹے سے اور مختصر گھر میں مانو سارے جہاں کی مسرّتیں جمع ہوگئیں۔ انور کے ابّا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کتنے ہی دنوں سرخ رہا۔ اس سرخی کو دیکھ دیکھ کر وہ نہال ہوتی اور دعائیں مانگتی کہ یہ سرخی بڑھتی ہی چلی جائے کم نہ ہو مگر کارخانے کے ایک مزدور کے چہرے کی سرخی آخر کب تک؟ سب سے پہلے کارخانے کے مالک نے ہی مذاق کیا۔

"کیوں رے یوسف۔ آجکل انار بہت کھاتے ہو یا چہرے پر سیندور مل رکھا ہے۔"

یوسف کے چہرے پر مالک کے مذاق کی تلخی ایک لمحہ کے لئے اثر انداز ہوئی۔ لیکن پھر غائب۔ اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا وہ۔ مگر پاس کے ایک مزدور نے کہا۔

"حضور اب یہ ایک بچّے کا باپ ہے۔ سرخی بے وجہ نہیں آئی ہے چہرے پر۔ ان دنوں یوسف بڑا خوش ہے"

"جب تو یہ چھپا رستم نکلا"۔ مالک نے کہا "ہمیں خبر بھی نہ کی۔ کیوں رے یوسف؟"

یوسف نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ لبوں پر ہنسی بھی آگئی

اور چہرے کی سُرخی بھی قائم رہی ـــــ ہاں اس دن جب یوسف نے سلیمہ کو کارخانے کی یہ ساری بات چیت سنائی۔ تو اس نے انور کو چھاتی سے لگالیا۔ خوب پیار کیا۔ اور سلیمہ نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ بھی سُرخ ہو رہا ہے لیکن کارخانے کی ہڑتال کے چوتھے دن جب گھر میں کچھ بھی نہ رہا تو فاقے کے ایک ہی حملہ نے دونوں میاں بیوی کے چہرے کی سرخی چھین لی۔ تب سلیمہ کی آنکھوں نے دو آنسو اور گرا دیئے۔ سوئی ایک بار پھر اس کی انگلی میں چبھی۔ لیکن اس کے جگر کی چبھن، انگلی کی چبھن سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ برداشت کر گئی۔ اس نے چاہا کہ آج کے دن ماضی کا کوئی دوسرا تصور اُسے بے چین نہ کرے۔ وہ صرف کپڑے سیئے۔ خیالات میں نہ ڈوبے مگر وہ کوشش کے باوجود بھی ایسا نہ کر سکی۔ آخر اُسے وہ دن بھی یاد آگیا۔ جب سلیمہ فرطِ غم سے پورے دو دن رو بھی نہ سکی۔ سکتہ طاری ہو گیا۔ اور بیمار بچے کو گود میں لئے گم سُم بیٹھی رہی۔ ہاں وہ دن جب شہر میں فساد ہو گیا تھا۔ پولیس گولیاں چلا رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور انور تین دن سے بیمار تھا۔ اس کے ابا دوا لینے بازار گئے۔ دکانیں بند تھیں۔ واپس ہوئے تو دو سپاہی بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔

ایک نے پوچھا "تم کون ہو۔ ہندو یا مسلمان؟"

"مسلمان"

"سچ کہتے ہو؟"

"خدا کی قسم"

"جانے دو" دوسرے نے کہا "اپنا ہی بھائی ہے" ـــ

اور وہ دونو ایک طرف چلے گئے۔ کچھ فاصلے پر دو سپاہی اور ملے۔ پھر وہی سوال ہوا۔

"تم کون ہو۔ ہندو یا مسلمان"؟

"مسلمان"

"مسلمان ؟ مار دو گولی۔ کیا دیکھتے ہو۔ دشمن ہے۔ اپنا دشمن جاتی کا دشمن۔ قوم کا دشمن۔ اور کوئی دور نزدیک بھی نہیں اس وقت" دوسرے نے کہا۔

تب انور کے ابا خون میں لت پت زمین پر گر پڑے اور ہسپتال میں آخری بیان دے کر ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

سلیمہ کی آنکھوں نے اس بار اتنے آنسو گرائے کہ وہ بیحال ہو گئی بھری بھری آنکھوں سے وہ سوئی کو اچھی طرح دیکھ نہ سکی اور جذبات کے دباؤ نے ایک بار تقریباً نصف سوئی کو اس کی انگلی میں چبھو دیا۔ خون نکل آیا۔ آنسوؤں کے دو قطرے خون پر گرے اور آپس میں مل گئے۔

دروازہ کھلا۔ انور دوڑتا ہوا اندر آیا اور بولا۔

امی امی سب کہتے ہیں کل عید ہے۔ ارشد نے مجھے اپنی نئی ٹوپی بھی دکھائی۔ بڑی اچھی ہے وہ۔ کل پہنے گا۔ اور اپنے ابا کے ساتھ میلا دیکھنے جائے گا۔ مجھے ٹوپی کی ضرورت نہیں امی میرے ابا کہاں ہیں؟ تم کہتی ہو، بادلوں کے پیچھے چلے گئے۔ چاند اور تاروں میں رہتے ہیں اور میرے لئے ننھے تاروں کی بنی ہوئی ٹوپی لائیں گے۔ ہاں امی کل وہ ضرور آئیں گے نا۔ عید کے دن تم میٹھے چاول پکا رکھنا۔ اتنی دور سے آئیں گے وہ۔ ان کو بھوک بھی لگی ہوگی تم بھی روز کہتی ہو کہ جب ابا آئیں گے تب میٹھے چاول پکاؤں گی کل تو پکاؤ گی نا؟ کیوں میری امی؟ ـــ انور قریب ہو گیا۔ جب اس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھا۔ تو بے چین ہو کر بولا

"امی تم رو رہی ہو۔ اچھا میں میٹھے چاولوں کے لئے ضد نہیں کرتا۔ تم رو ؤ مت۔ میں نہیں کھاؤں گا میٹھے چاول۔ کل عید کے دن جو تم ایک پیسہ دو گی نا۔ اس کا میں گڑ لے لوں گا۔ منہ میٹھا ہو جائے گا۔"

"نہیں میرے بچے" سلیمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لئے کل میٹھے چاول ضرور پکاؤں گی۔ دیکھو کپڑے سی رہی ہوں سا بھی تیار ہوں گے۔ تم بھاگے بھاگے گوپال لالہ کے ہاں جانا اور کپڑے دے کر پیسے لے آنا۔ پھر کل میٹھے چاول پکائیں گے۔"

"اچھا میری امی" انور نے خوش ہو کر کہا۔ اور کھیلنے کے لئے پھر باہر چلا گیا۔ باہر اسے سعید ملا۔ وہ انور کا ایک دوست تھا۔ انہے

ابا کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ انور کو دیکھ کر سعید نے آواز دی۔ انور لپکا لیکن سعید کے ابا کی قہر آلود نگاہیں دیکھ کر ڈر گیا۔ ایک بھی قدم نہ بڑھا سکا۔ سعید نے ایک اور آواز دی اور جب تیسری بار پکارنے لگا تو اس کے باپ نے اسے جھڑک دیا۔ پھر بھی سعید نے ایک دوبارہ پیچھے مڑ کر انور کو دیکھا۔ جو حسرت بھری نظروں سے باپ بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا۔

"آؤ انور کھیلیں" انور کا دوسرا دوست جمیل بولا۔ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"کہاں چلو گے؟" انور نے پوچھا

"ہمارے گھر۔ آؤ میں تمہیں اپنا نیا فٹ بال دکھاؤں۔ جمیل نے کہا۔

"پر تمہارے ابا گھر پر ہیں؟ انور نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ اخبار پڑھ رہے ہیں" جمیل نے جواب دیا

"تب نہیں جاؤں گا بھائی" انور نے کہا

"کیوں"؟ جمیل نے پوچھا۔

"تمہارے ابا تمہیں جھڑک دیں گے اور مجھے بھی غصے سے دیکھیں گے" انور نے جواب دیا۔

"نہیں انور۔ وہ تو بہت پیار کرتے ہیں۔ چلو تمہیں بھی پیار کریں گے" جمیل نے کہا۔

"سچ"؟ انور نے پوچھا۔

"ہاں سچ" جمیل بولا۔

وہ دونوں گھر پہنچے۔ ابھی اندر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ جمیل کی اماں نے انور کے میلے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو غور سے دیکھ کر جمیل سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"میرا دوست انور" جمیل نے جواب دیا۔

"کیسے آیا ہے"؟ اماں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ کھیلنے۔ میں اسے نیا فٹ بال دکھاؤں گا امی" جمیل نے جواب دیا۔

"ٹھہر تو میں ابھی تیری چمڑی ادھیڑتی ہوں۔ پہلا فٹ بال بھی یوں ہی گم کیا تھا۔ اور دوسرا یہ چرانے آگیا ہے۔ چور کہیں کا۔ چل نکل یہاں سے۔ جمیل کی اماں نے غضبناک ہو کر کہا۔

انور سہم گیا۔ وہ جھڑکیاں برداشت نہ کر سکا۔ فوراً باہر چلا آیا۔ نہایت افسردہ اور غمگین اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یہ سوچتا ہوا۔ کہ رامو اور پاشا جب ہمارے گھر کھیلنے آتے ہیں تو میری اماں ان کو جھڑکتی نہیں بلکہ پیار کرتی ہے۔ پر جمیل کی اماں اور سعید کے ابا ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس نے اس مسئلہ پر بہت سوچا کافی دماغ لڑایا۔ لیکن اس کا شعور کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔ جمیل کی اماں کی بدسلوکی نے اسے بیتاب کر دیا تھا۔ اس کا ننھا سا دماغ اس بدسلوکی کے وجہ کی تلاش میں تھا کہ اس کے تیسرے دوست کریم نے سوال کیا۔

"کہاں چلے؟"

"اپنے گھر" انور نے جواب دیا

"آؤ کھیلیں انور۔ ہمارے گھر رامو، شامو اور پاشا سبھی آئے ہوئے ہیں۔ چلو تم بھی کھیلو" کریم نے کہا۔

"پر تمہارے ابا کہاں ہیں"؟ انور نے ذرا ڈر کر پوچھا۔

"اللہ میاں کے پاس" کریم نے جواب دیا۔

"اللہ میاں کے پاس" آسمان پر بادلوں کے پیچھے؟ کیا وہ بھی میرے ابا کے ساتھ چاند اور تاروں میں رہتے ہیں؟ انور نے ذرا اطمینان سے پوچھا۔

"چاند اور تاروں میں رہتے ہیں یا بادلوں کے پیچھے۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ پر میری اماں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اللہ میاں کے پاس رہتے ہیں اور ہم مرنے کے بعد ان سے مل سکیں گے" کریم نے جواب دیا۔

"کیا میں بھی اپنے ابا کو مرنے کے بعد مل سکوں گا"؟ انور نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں ضرور مل سکو گے" کریم نے جواب دیا

"تو پھر آؤ کریم۔ ہم تم دونوں مر جائیں۔ انور نے معصومیت

سے کہا۔

"ٹھیک تو ہے۔ پر مرو گے کیسے؟ میں خود مر کے اپنے ابا سے ملنا چاہتا ہوں۔ پر یہ نہیں جانتا کہ مروں گا کیونکر۔ ہاں ایک بار میں نے اپنی اماں سے پوچھا بھی تھا کہ لوگ کس طرح مرتے ہیں۔ پر اس نے مجھے جھڑک دیا۔ کچھ بھی نہ بتایا" کریم نے کہا۔

"تو میں اپنی اماں سے پوچھوں گا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ ضرور بتا دے گی۔ پھر ہم دونوں مر کے اپنے اپنے اباؤں کو جا ملیں گے۔" انور نے کہا۔

"بہت اچھا!" کریم خوش ہو کر بولا۔ اور وہ دونوں کھیلنے کے لئے ایک طرف چلے گئے۔

دروازہ کھلا۔

انور نے داخل ہوتے ہی اپنی امی سے پوچھا۔

"امی ایک بات بتاؤ گی"

"ہاں پوچھو" امی نے جواب دیا۔

"امی لوگ کس طرح مرتے ہیں؟" انور نے پوچھا۔

سلیمہ انور کے اس انوکھے سوال پر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اور بات کا رخ بدل کر بولی۔

"اچھے انور۔ کل میٹھے چاول پکانے ہیں نا۔ اس لئے تو یہ کپڑے اور گوپال لالہ کے ہاں بھاگے جاؤ اور مزدوری لے آؤ ان کی۔ سمجھے۔ کل عید ہے۔"

"بہت اچھا امی۔" انور نے جواب دیا۔ اور اپنی ماں سے کپڑوں کی گٹھڑی لے کر گوپال لالہ کے ہاں چل دیا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا۔ کل اس کی امی میٹھے چاول پکائے گی۔ اس خیال سے وہ بے حد مسرور تھا۔ راستے میں ایک جگہ قلندر بندر نچا رہا تھا۔ بہت سے لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انور کا بھی جی چاہا کہ تھوڑی دیر ٹھہر کر تماشا دیکھ لے اور اس کے قدم رکنے ہی والے تھے کہ اسے امی کے الفاظ یاد آ گئے "جلدی آئیو" وہ تیز ہو گیا۔ جمن نے تماشا دیکھنے کے لئے پکارا بھی مگر وہ نہ ٹھہرا۔ آگے نکل گیا۔ ایک دوسرے مقام پر بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ یہاں بھی انور کا جی چاہا کہ ان میں شامل ہو جائے۔ مگر اس کی سعادت مندی، ماں کے الفاظ اور فرض کے احساس نے رکنے نہ دیا۔ وہ چلتا ہی گیا۔

اتنے میں ایک گلی سے چند لڑکوں کی ایک ٹولی نکلی وہ سب "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ آپس میں مذاق کر رہے تھے ہنستے کھیلتے ہوئے وہ انور کے پاس پہنچے۔ ایک بولا۔

"کہو پاکستان زندہ باد"

"مجھے گوپال لالہ کے پاس جانا ہے۔ بھائی۔ یہ کپڑے لے کر۔ جانے دو مجھے۔" انور نے کہا۔

"نہیں جانے سے پہلے پاکستان زندہ باد کہو" وہی لڑکا بولا

"بھائی مجھے جلدی ہے۔ دق نہ کرو۔ مزدوری لینے جا رہا ہوں" انور نے کہا۔

اتنے میں ایک دوسری گلی سے چند لڑکوں کی ایک اور جماعت "اکھنڈ ہندوستان زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی آئی۔ انور اور پاکستانی ٹولی کی باہمی تکرار سن کر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور انور سے مخاطب ہوا۔

"کہو اکھنڈ ہندوستان زندہ باد"

"مجھے گوپال لالہ کے پاس جانا ہے بھائی۔ یہ کپڑے لے کر جانے دو مجھے۔" انور نے پہلا جواب دیا۔

"نہیں۔ پہلے اکھنڈ ہندوستان زندہ باد کہو" لڑکا بولا۔

اتنے میں دونوں ٹولیوں نے اپنے اپنے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ آپس میں تکرار ہو گئی۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ اور سب گتھم گتھا ہو گئے۔

ایک لڑکا آگے بڑھا اور انور سے کپڑوں کی گٹھڑی چھین کر ایک طرف کو بھاگ گیا۔ انور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ آگے ایک گندہ نالہ تھا۔ لڑکے نے شرارت سے گٹھڑی کو نالے میں پھینک دیا اور دوسری جانب بھاگ گیا۔

انور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گٹھڑی ڈوب گئی تھی پانی

تیز بہہ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا اب کیا ہوگا۔ گوپال لالہ تو ہمیں قید کرا دے گا۔ اب میں امی کو کیا جواب دوں گا۔ کل عید ہے اور میٹھے چاول بھی کیسے پکیں گے۔ لیکن یہ نالہ ہے۔ پانی کوئی بہت گہرا معلوم نہیں دیتا۔ گھڑی ابھی یہیں کہیں ہو گی۔ کیوں نہ میں کود کر گھڑی کو ابھی نکال لاؤں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر نالے میں پھینکا تاکہ پانی کی گہرائی کا جائزہ لے سکے۔ وہ نالے میں کودنے ہی والا تھا۔ کہ ایک راہگیر وہاں سے گزرا۔ نالے کے کنارے پر انور کو کھڑے دیکھ کر بولا۔

"کیوں رے چھوکرے۔ کیا مرنا چاہتا ہے جو نالے کے کنارے پر کھڑا ہے؟"

انور نے راہ گیر کی بات سنی اور سوچنے لگا۔ یہ آدمی کہتا ہے کیا مرنا چاہتا ہے۔ تو کیا نالے میں گر کر آدمی مر جاتا ہے؟ یقیناً مر جاتا ہے جب ہی تو اس آدمی نے کہا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر میرے لئے خوشی کی بات اور کیا ہو گی نالے میں کود جاتا ہوں۔ اگر گھڑی مل گئی۔ تو گوپال لالہ کے ہاں جاؤں گا۔ نہیں تو مر کے اپنے ابا کو جا ملوں گا۔ یہ تو کوئی بڑا نیک آدمی تھا جو مجھے مرنے کا راز بتا گیا۔

تب انور نالے میں کودنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پانی کی تیزی اور خوفناک روانی نے اسے ایک لمحے کے لئے روکا لیکن دوسرے لمحے اس نے چھلانگ لگا دی۔ فضا میں "اماں" "گھڑی" اور "ابا" کے الفاظ سنائی دیئے اور سکوت طاری ہو گیا۔ پانی کی سطح پر چند بلبلے اٹھے اور انور ڈوب گیا۔

دوسرے دن

عیدگاہ کے پاس ہی نالے میں ایک بچے کی لاش تیر رہی تھی۔ اس کے پاس ایک گھڑی بھی تھی۔ لوگ نماز پڑھنے آتے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بچے کی لاش کو دیکھتے اور گزر جاتے۔

دور — بہاں دور ایک غریب محلے میں۔ ایک عورت آج خوشی کے دن اکیلی بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ اور جس کے آنسو پونچھنے والا اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔

چاند اور چکور (صفحہ ۲۸ سے آگے) تم نے خط میں بھی کچھ بے رخی دکھائی ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ تم لاکھ پیچھا چھڑاؤ۔ مجھ سے دور بھاگنے کی کرو۔ مگر بخدا اب تمہاری شخصیت مجھ پر منکشف ہو چکی ہے۔ جو تمہارے کسی بھی مکر اور انکار سے چھپ نہیں سکتی تحریر کے ایک ایک لفظ میں خلوص، محبت اور ہمدردی مضمر ہے۔ پھر میں کیسے یقین کر دوں کہ میرا چکور مجھ سے واقعی روٹھ گیا ہے۔ منگل کی حسین صبح کو میں تمہارا انتظار کروں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپس کے تمام شکوے اس دن مٹ جائیں گے۔

بے چین
نیلوفر

قطعہ

کشن ہیلپوری

غرور اے سنگدل اتنا نہ کر حسن و جوانی کا شباب و شیب ہے مد و جزر دریا کے پانی کا!
سدا دن ایک سے کس کے رہے ہیں بحرِ عالم میں ڈبو دیگا بھنور پیری کا بیڑا نوجوانی کا

ڈاکٹر رازی

"پیٹاکی"

"گذر ینگے تو بڑے مزے سے دن! کافرہ نے آنے والی عشرتوں اور مسرتوں کا تصور کرتے ہوئے کہا ـــ" یہ پیر نابالغ میرے دام محبت میں پھنس گیا، تو زندگی سنور جائیگی اور بڑے مزے سے دن گذریں گے"

"دوش اناریکا...! پاگل ہوئی ہیں کی" بڑھیا نے اچانک پیچھے سے شانہ ہلایا اور خون آلود نگاہوں سے دیکھ کے پوچھا۔ "کیا بک رہی ہو ملعونہ؟ کون بوڑھا؟ کس کو محبت کے جال میں پھنسانا چاہتی ہو؟ کس کے ساتھ مزے سے دن گذاروگی؟ جلدی بکو! ورنہ ابھی گھر سے نکالتی ہوں"۔

"نہیں اماں! کچھ نہیں" ماہ پارہ نے جھینپ کے کہا ـــ "یونہی ایک خیال سا آرہا تھا۔ کہ اگر......"

"کہو کہو! ہم بھی تو سنیں۔ وہ کیا "خیال" اور کیسی "اگر مگر" تھی" بڑھیا نے دیدے پھاڑ کے کہا۔

"یہی، کہ اگر یہ بوڑھا، جس کا وہ محل ہے، ہمارے گھر کے سامنے، ساری ایطالیہ جسکی انگلیوں پر ناچتی ہے، ہمارے دیس کی باگ ڈور ہے جس کے ہاتھ میں" رشکِ پری نے جواب دیتے ہوئے کہا ـ۔ "اگر وہ میری محبت میں پھنس جائے، مری زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جائے، تو مسیح کے تقدس کی قسم! ہماری آئندہ زندگی شاہانہ طور سے گذرے گی، اور ہم حکومت اطالیہ کی شریکہ، حصے دار، نہیں نہیں، اس کے تخت کی مالک بن جائیں گی"

بڑھیا نے غضبناک آنکھیں حیرت واستعجاب میں بدل لیں۔ اور پوچھا۔ "ہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بھولی لڑکی! بچوں کی سی باتیں نہ کرو، ہم کیا۔ ہماری بساط کیا؟ وہ اتنا بڑا آدمی تم ایسی پاگلوں کو کیوں منہ لگائے گا، وہ تمہاری محبت کا محتاج نہیں"

"کیوں نہیں" عیارہ نے تیز نگاہیں ڈال کر کہا۔ "میں قوتِ عقل وفکر سے اس کو پھنسا کے رہوں گی۔ اس طرح، کہ تم انگشت حیرت چبانے لگو گی، دیکھو! میں ابھی خط لکھتی ہوں"۔

پیارے

"دکھیا کا سلام قبول کیجئے! معلوم نہیں، آپ کی آنکھوں میں کیا جادو ہے۔ کہ جب بھی آپ کو میں نے دیکھا ہے، مسحور سی ہو گئی ہوں، آپ کا قصر میری ٹوٹی پھوٹی کٹیا کے عین بالمقابل ہے، میری نگاہیں آپ کی تلاش میں، جام صہبا کی طرح ہر وقت گردش کرتی رہتی ہیں، اور جب بھی کبھی آپ نے اپنے دریچے سے جھانکا ہے میری متجسس آنکھوں نے آپ کے درشن کرنے میں ہمیشہ کامیابی حاصل کی ہے"

"پیارے! آج میری محبت کا پیالہ، جس میں صبر کا پانی بھرا کرتی تھی، لبالب ہو کے چھلکنے لگا ہے اب مجھے تاب جدائی نہیں، اور اسی بے صبری ہی سے تنگ آ کے آج یہ خط لکھنے کی جرأت کی ہے، کہ بہر خدا میری آرزوؤں کا خون نہ کرو، میری امیدوں کا گلا نہ گھونٹو، میری حسرتوں کو مٹی نہ دو، اور مجھے اپنی رفاقت کی عزت بخشو، پاپائے روم کی سوگند ہے، کہ میں اپنے حسن وشباب کو آپ کے قدموں پر نچھاور کر دوں گی اور ہمیشہ غلام بے دام

بنی رہوں گی، اُمید، کہ میرے ٹوٹے ہوئے دل
کی صدا، صدا بالصحرا ثابت نہ ہو گی!"

آپ کی ——— "پیٹاکی"

اسے خوبیٔ قسمت کہیئے یا حُسنِ اتفاق! کہ یہ خط "ڈکٹیٹر" کو اس وقت ملا، جب وہ خود "محبت کی گہرائیوں" میں غرق تھا، اسے پڑھتے ہی وہ پریم کے بکھرے ہوتے شیرازے کو اکٹھا کرنے لگا، وہ بار بار خط پڑھتا تھا اور لذت اٹھاتا تھا ابھی وہ اس کا جواب لکھنے بھی نہ پایا تھا، کہ اگلے روز اسی مہوش کا ایک اور خط مل گیا، اس سے اگلے روز ایک اور ——— بس پھر کیا تھا، خطوں کا ایک تانتا بندھ گیا، اور ناچار "بڈھے" کو جواب دیتے ہی بنی، کہ ———

پیاری

"تمہارے محبت ناموں نے زخمی دل پر مرہم
کا کام کیا، میں اس یاد فرمائی کے لئے تمہارا شکر
گذار ہوں، اور تم کو دلی مسرت کے ساتھ اجازت
دیتا ہوں۔ کہ تم "تنہائی" میں آکر میرے جلتے ہوئے
دل کو "ٹھنڈا" کیا کرو"

اس خط کا آنا تھا، کہ ماں بیٹی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ "دیکھا امی"! محشر خرام نے "کامیاب نگاہیں" ڈالتے ہوئے کہا ——— "میری تدبیر کا تیر کیسا نشانے پر بیٹھا! یہ لو، اطالیہ کو تہ و بالا کرنے والا میرے محبت بھرے خطوں کی تاثیر سے خود زیر و زبر ہو گیا"!

"مبارک ہو بیٹی"! بڑھیا نے اس حشر نظر کو چوم کر کہا "میں تمہیں اس فتحمندی اور کامرانی پر مبارک دیتی ہوں واقعی تمہارا ناخنِ تدبیر سخت اور پیچیدہ گرہ کو کھول کے رکھ دیتا ہے"

اس کے بعد "پیٹاکی" ڈکٹیٹر کے محل میں دو چار بار آئی گئی، اور اپنے ملائک فریبِ حسن اور سحر آگیں شباب کے طفیل اس "بڈھے ڈوچے" کو ہمیشہ کے لئے مسخر کر گئی!

تسخیرِ اطالیہ کا دعویدار، اب خود پیٹاکی کی زنجیرِ محبت میں گرفتار تھا، وہ سفر میں ہوتا یا حضر میں، ہمیشہ پیٹاکی کے خطوط اپنے پاس رکھتا، اور تنہائی میں ان سے دل بہلایا کرتا۔

حقیقت میں یہ "پیٹاکی" ایک شاطر بازاری، اور پرلے درجے کی عصمت فروش، بڑی مکار، [illegible] کو دامِ تزویر میں پھنسانا اور اس سے من مانی مرادیں [illegible] کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ تھا، بلا کی حسین [illegible] کی سی زلفیں، گلاب سے گال، بوٹا سا قد، [illegible] بید کی سی کمر، نرگس سی آنکھیں، کمان سی بھویں، تیر سی پلکیں، اُبھرا ہوا سینہ، چوڑی پیشانی، اس پر [illegible] وہ بھی "مغربی نمونے" کا! جو بھی اسے دیکھتا [illegible] ایمان کی خیر نہیں تھی، آہ! نہ ہوئے مہاں مجنوں، ورنہ ناممکن تھا، کہ وہ پیٹاکی کو دیکھتے اور پھر بھی لیلےٰ کا دم بھرتے آہ! نہ دیکھا پیٹاکی کو ہمارے مشرقی شعرا نے، ورنہ نہ جانے، اس کے حسن و شباب کی شان میں کتنے قصائد کتنی غزلیں، کتنے ترجیع بند، کتنی رباعیاں، کتنے مسدس اور کتنے خمسے حوالۂ قلم کئے جاتے۔

ناظرین! کیا آپ نے معلوم کیا کہ یہ "پیٹاکی" کون تھی؟ وہی "مسولینی" کی رفیقۂ حیات، محبوبۂ دلنواز! اور کون؟ جو حال ہی میں اپنے "عاشق" کے ساتھ پھانسی پر لٹک کے دادِ وفا دے گئی! آہ! اے مغربی عبارہ!

رنج و غم ہوں گے تری لاش اٹھانے والے

پھر وہی۔ (صفحہ ۳۷ سے آگے) کر لیتے۔ مگر اس کی بیوی کی اچانک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ گھر میں کھانے پینے کی کوئی بھی چیز موجود نہیں وہ بغیر جواب دیئے اٹھا اور ایک ٹھنڈی آہ میں "جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن" کہتا ہوا گھر سے نکل کر اس زندگی کے میلے میں گم ہو گیا۔ تاکہ اشیائے خوردنی مہیا کر سکے

عمر حزیں

پھر وہی

اب کے اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سب سہارے ٹوٹ چکے ہیں۔ اور اس کی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جو اسے ہر وقت بھائیں بھائیں کرتا نظر آتا ہے صرف خالی خولی لیکن لامحدود۔ زمین اور آسمان کے درمیانی خلا کی طرح۔ اسے یقین ہو چلا کہ اب یہ خلا اس کی زندگی کے لئے ابدی ہے اور شاید ازلی بھی۔ وہ ہمیشہ مایوسی سے ہمکنار رہا۔ زندگی کی پیہم شکستوں نے اسے امید سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ وہی امید جو انسانی زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے "دنیا بر امید قائم" وہ حیران تھا کہ ایسا مقولہ موجودہ زمانہ پر کیسے صادق آتا ہے۔ امید کے بغیر بھی تو زندہ رہا جا سکتا ہے وہ خود بھی تو امید سے کورا اور ایک تھکی زندگی گذار رہا تھا۔ پھر اس ادھورے مقولہ کو کیوں بین الاقوامی حیثیت دی جائے۔ شاید اس مقولہ کا رد عمل بھی زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے یاس نہ ہو تو امید کی قیمت؛ اور اب وہ خوگر یاس ہو چکا تھا۔ زندگی سے فرار کی کوئی صورت نہیں۔ وہ یہ سوچتا تو اس کا دل دھک سے بیٹھ جاتا۔ کیا اس کی زندگی انہی طویل الجھنوں میں ختم ہو کے رہ جائے گی۔ کیا وہ اپنے فطری حق سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ وہ قنوطی بن جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی تو مشکل ہے۔ بلکہ اس کے ماحول نے قریب قریب ناممکن بنا دیا تھا۔ قنوطیت زبانی تو اختیار کی جا سکتی ہے عملاً ذرا ٹیڑھی بات ہے۔ دنیا کا ہر عمل ٹیڑھا ہے۔ کچھ یونہی مخفی مسائل حاصل ہونے کے لئے مختلف پیچ در پیچ راستوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جو ہر انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اس جیسے انسان جو زندگی کی تلخیوں سے مقابلہ تو کجا فرار کی راہ بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ خیالات کا تانتا کچھ ایسے جمتا کہ وہ یاسیت کے آئینہ میں اپنا ماضی صاف صاف دیکھ سکتا۔ اس کا تصور اس قدر شدید ہوتا کہ اس کی زندگی کا معمولی سے معمولی واقعہ بھی اپنی پوری وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے ہوتا۔ وہ سوچتا کہ انسان ایک حال میں کیوں نہیں رہتا۔ جیسے زمین و آسمان اور خود خدا بھی تو روز ازل سے ایک جیسا ہے۔ اس کی خدائی۔ اس کی رحمت۔ اس کی زحمت اس کا قانون۔ اس کی قدرت سب میں ہمیشگی کارفرما ہے۔ پھر انسان خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق۔ اشرف المخلوقات کیوں تبدیل ہوتا رہتا ہے اس کے خیالات جذبات، اس کے عمل۔ اس کا ماحول کیوں ہمیشگی لئے ہوئے نہیں۔ کیوں اس کا حال ماضی سے مطابقت نہیں کھاتا۔ کتنے بے تکے سوالات تھے اس کے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ زندگی نام ہی ہے حرکت کا۔ ایسی حرکت جو ایک مقام ایک ماحول سے دوسرے مقام اور ماحول کی طرف لے جاتی ہے اگر زندگی ایک جیسی ہی رہے تو ٹھہرے پانی کی طرح گدلی ہو جائے زندگی کا ٹھہراؤ تو ہلاکت ہے۔ جس میں ماضی تو ماضی حال کا احساس بھی گدلا ہو جاتا ہے۔ وہ جھنجھلا اٹھتا ان خیالات سے۔ زندگی کی حقیقتوں سے پھر وہ منکر کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور کی ذہنی تلخیوں۔ فطری محرومیوں اور معاشرتی کجرویوں نے اسے قنوطیت کی حد تک پہنچا دیا ہو۔ اس کے جذبات زخمی۔ روح بے جان اور دل محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہو کر رہ گیا تھا۔

خیالات کی اس رو میں اسے محسوس ہوا کہ وہ زندگی کے پہلے مقام پر کھڑا سانس لے رہا ہے۔ جہاں سے اس نے زندگی کی دوڑ شروع کی تھی۔ جب اسے کتنی طمانیت تھی اس

زندگی کا دائرہ کتنا اطمینان بخش تھا۔ اس کے خیالات کس قدر بلند و ارفع تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد معین تھا۔ اس کے ادبی رجحانات مخصوص تھے۔ محبت۔ نفرت۔ انسانی نفسیات جنسی رجحانات کے تجزیے اسے کسقدر مرغوب تھے وہ چاہتا تھا کہ تمام خیالات کو یکدم اُگل دے۔ اس آتش فشاں سے لاوا پھوٹ کر ماحول کی پراگندگی کو اپنے میں بھسم کر لے۔ مگر اس کے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ اس کو جلد ہی ان خیالات سے دستکش ہونا پڑا۔ کیوں؟ مجبوراً نہیں! دراصل اس میں بغاوت کی اہلیت ہی نہ تھی۔ اس وقت ان سماجی ڈھکوسلوں سے بغاوت کتنی ضروری تھی اس نے جانتے بوجھتے نظرانداز کر دیا۔ اور اب افسوس سے حاصل؟ اب تو اس کی زندگی کی گاڑی راستہ کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے زخمی ہو چکی تھی اور محض چھکڑا ہو کر رہ گئی تھی جیسے کسی نہ کسی صورت منزل پر پہنچنا ہی ہے۔ بس ایک ہی حال میں زندگی کے ٹیڑھے راستہ پر ہچکولے کھاتی۔ لڑکھڑاتی! تمناؤں کے کچلے ارمانوں کی لڑکھڑاہٹ۔ وہ سنبھل بھی نہ سکتا تھا۔ اب کہ وہ مجبور تھا۔ اس کے سر پہ ایک خاندان کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ جسے وہ "میں کہاں یہ وبال کہاں" کا نام دے رہا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا داری کتنی کٹھن ہے۔ اس کی چکی میں کس طرح انسان کی فطری صلاحیتوں کا کچومر نکلتا ہے اور پھر اس دنیا داری میں کس کس کے ناز نہیں اٹھانے پڑتے۔ یونہی بے سوچے سمجھے شاید زندگی کا مقصد ان نازبرداریوں میں پنہاں ہو۔ مگر وہ مطمئن کیوں نہیں تھا؟ کیا اس کے خیالات کی روانی بند ہو چکی تھی۔ کیا اس کے جذبات کا تلاطم مٹ چکا تھا۔ بات کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے خیالات کے راستے مسدود ہو چکے تھے اسے اتنی فرصت ہی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ وہ حیات و ممات کے فلسفہ پر غور کر سکے۔ زندگی کے شخصی اور اجتماعی نظریہ کی وضاحت کر سکے۔ یار لوگوں کے تمسخر اور استہزا کا بھی نشانہ

بن رہا تھا جب کہ خیالات میں روانی ہو اور روانی میں زور ہو جس کا قلم روزمرہ حقائق کا تجزیہ کر سکتا ہو۔ اگر وہ ایسے چپ ہو جائے تو یہ سراسر ادب کی بے ادبی ہے اور وہ واقعی "بے ادب" کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مگر کیوں؟ ایسا کیوں ہے۔ وہ ادیب ہو کر بھی کیوں بے ادب ہو رہا ہے۔ شاید وہی زندگی کی پیہم شکستوں کا احساس! سماجی الجھنیں۔ اقتصادی مجبوریاں۔ ذہنی تلخیاں۔ اور جانے موجودہ ماحول کی پیدا کردہ کتنی ایسی بیماریوں نے اس کی ہیئت ہی بدل دی تھی۔ اور اب وہ محض ایک انسان ——— چلتا پھرتا ہڈیوں کا ڈھانچہ ——— ہائیں آپ مسکرا رہے ہیں! کیا بے سروپا قصہ ہے۔ میونسپلٹی کا اشتہار ہے یا محض دل کی آواز! اپرا پاگنڈہ ہے یا محض جرنلزم! کچھ بھی ہو اسے تو جو کچھ کہنا ہے۔ بلا روک ٹوک کہتا ہے۔ کسی کو مرعوب کرنے یا اپنی ادبیت کو مشتہر کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ واقعی یہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے ہیں۔ جنہیں وہ ایک ایک کر کے دنیا کو دکھا رہا ہے۔ اس کی ذہنی خلفشار کچھ تو سوسائٹی کے نام نہاد اصولوں سے پنپنے کی مرہون منت ہے اور کچھ اس کا تنگ اور متعفن ماحول۔ خود اس کے گھر کی چار دیواری میں سماج کی فرسودہ "باتیں" ظاہری و باطنی رواداری سے دُور عملی رنگ میں موجود تھیں! جنہوں نے اُسے اپنے صحیح مقام سے بھی کوسوں دور پھینک دیا تھا۔ اور وہ کچھ ایسے ہی زندگی سے اُکتا سا گیا تھا۔ اور پھر سے ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے۔ وہاں پھر سے اسے سکون رفتہ حاصل ہو سکے۔ پھر وہ کسی بے وفا پر مرنے لگے۔ پھر اس کی وہی زندگی ہو جائے تو ——— تو شاید اس ماحول کی پرسکون وادیوں میں پھر سے اس کے دل کی آگ لاوے کی شکل ابل پڑے وہ آگ جسے زمانہ کے سرد ہاتھوں نے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ایسے ہی خیالات میں وہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ وقتی طور پہ جانے اس کے خیالات اس سے بھی شدید تر ہو کر بھیانک صورت اختیار

(بقیہ صفحہ ...)

رام لال مہتہ

نئی دنیا کی نئی دنیا

پندرھویں صدی کے خاتمہ پر بہت کم لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زمین گیند کی طرح گول ہے اور حضرت انسان یورپ کے علاوہ دوسرے براعظموں سے نا آشنا تھا بحرہ روم کے گرد و نواح کے ممالک ابھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے اور انہیں ملکوں کے ساتھ دنیا کی بحری تجارت روبہ ترقی تھی۔ لیکن ہندوستان اور جزائر شرق الہند ایسے مراکز تھے جہاں سے یورپی تاجر اپنے ممالک کے لئے مصالحہ اور اشیا خوردنی فراہم کیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ ملک بھی سمندری تجارت میں مشہور ہو چکے تھے۔

جب ترکوں نے ۱۴۵۳ میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا اور عیسائی لوگوں کو غلام بنا لیا۔ تو بحری تجارت کا راستہ یورپی تاجروں کے لئے بند کر دیا گیا لیکن ہندوستان اور جزائر شرق الہند کا مصالحہ (لونگ الائچی، دارچینی، کالی مرچ، سونف، ہلدی، زیرہ وغیرہ) یورپی خوراک کا ایک ایسا اہم جزو بن چکا تھا کہ اس کی تجارت بند نہ ہو سکی۔ اس بنا پر کہ بحرہ روم کا راستہ بند ہو چکا ہے یورپی اقوام ہندوستان جانے کا دوسرا راستہ تلاش کرنے پر کمربستہ ہو گئیں۔

کرسٹوفر کولمبس جینوا کا باشندہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا گول ہے۔ مغرب کی طرف سے جا کر مشرق کی طرف آدمی پہنچ سکتا ہے اس نے بمشکل تمام ہسپانیہ کے بادشاہ اور ملکہ کی مدد سے تین چھوٹے جہاز تیار کئے اور پے لوس (سپین) کی بندرگاہ سے ۱۴۹۲ کے اگست میں بحری سفر ٹھیک مغرب کی جانب شروع کر دیا۔ بحر اوقیانوس کو ان دنوں "تاریکی کا سمندر" یا "خوف کا سمندر" کہا کرتے تھے کیونکہ اس پر انسان نے ابھی قابو نہ پایا تھا۔ جب اس سمندر میں جہازرانوں نے دیکھا کہ ہوائیں شمال مشرق کی طرف سے چل رہی ہیں تو وہ سمجھ گئے کہ واپسی ناممکن ہے۔ لیکن کولمبس کو یہ وہم دامنگیر تھا کہ مغرب سے چل کر مشرق پہنچا جا سکتا ہے جہازرانوں اور ان کے ساتھیوں نے کولمبس کے خلاف بہت شور و شر کیا کہ گھر واپس جانا چاہیئے ورنہ وہ کولمبس کو ہلاک کر دیں گے لیکن اس نے نہایت عاجزی سے سمجھایا کہ تھوڑا سا سفر اور طے کر لیں۔ تب جہازران مان تو گئے لیکن گھر پہنچنے کی امید کو خیرباد کہہ بیٹھے۔ ایک رات کچھ ایسا ہوا کہ درختوں کے پتے اور ٹہنیاں پانی میں تیرتی نظر آئیں دل کو ڈھارس ہوئی کہ منزل قریب ہے اور وہ خشکی پر پہنچا ہی چاہتے ہیں دوسرے دن صبح دو آدمی اکٹھے چلا اٹھے "خشکی" "خشکی" "خشکی"۔ دور اُفق پر ایک زمین نظر آئی۔ جسے گورے آدمی کے پاؤں آج تک چھو نہ سکے تھے۔ آگے بڑھے تو لہلہاتے کھیت نظر آئے۔ ساحل ریتلا تھا۔ اور اس پر ننگے وحشی لوگ کھڑے تھے۔ وہ جہازوں کو اور گورے آدمیوں کو چمکتے ہوئے زرہ بکتر میں ملبوس پا کر ہراساں ہو گئے۔ وہاں جہاز کھڑے کر دئے گئے۔ کولمبس نے ساحل پر اتر کر ہسپانوی جھنڈے کو شاہ سپین کے نام سے لہرایا اور نئی دنیا پر قابض ہو گیا۔ کولمبس اور اس کے ساتھی بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے ہندوستان کے بحری راستے کی جستجو میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن وہ غلط تھے۔

یہ سفر دس ہفتوں میں ختم ہو گیا جو آجکل پانچ دن میں طے ہوتا ہے۔ کولمبس نے اس خشکی کے خطہ کو ایک جزیرہ سمجھا۔ اور اس کا نام سان سلوے ڈار رکھ دیا۔ نیز اس نے یہ خیال

کیا کہ اس کے نزدیکی جزیرے دراصل ہندوستان کا قرب وجوار ہے اس لئے ان کا نام جزائر شرق الہند رکھ دیا

ان کا ایک جہاز تباہ ہو چکا تھا۔ کولمبس اور اس کے آدمی پھر جانے کے لئے بیتاب تھے تاکہ اہل سپین کو نئی دنیا کی نئی باتیں بتائیں دو جہازوں کو خوراک اور تازہ پانی سے بھر لیا اور نئی دنیا کے عجائبات مثلاً کچھ سیدا اور ربڑ کے بنے ہوئے زیور اور دیگر اشیا بطور سوغات اور چند حبشی بھی ساتھ لے جانے لگے۔

جنوری میں اپنا واپسی سفر شروع کیا اور بہت ہشیاری سے جنوب مغربی ہواؤں کے درمیان پہنچ کر سیدھا سپین پہنچا کولمبس کو ایک بہادر تصور کیا گیا اور نئی دنیا کی نئی باتیں اہل یورپ میں آگ کی طرح پھیل گئیں۔ اب باقی یورپی اقوام بھی نئی دنیا پہنچنے کے لئے بیتاب ہو گئیں۔

لیکن کولمبس اس خطہ کو ہمیشہ ہندوستان سمجھتا رہا اس کے خواب وخیال میں نہ تھا۔ کہ اس خطے اور ہندوستان کے درمیان دنیا کا سب سے بڑا سمندر حائل ہے۔

بلوا پہلا یورپین تھا جس نے اس سمندر کو دیکھا۔ وہ اور اس کے ساتھی وسطی امریکہ کے بخار زدہ لبستیوں جنگلوں اور جھاڑیوں میں اپنی مہمیں کرتے رہے۔ ایک اونچے پہاڑ پر پہنچکر ایک بڑے سمندر پر نظر پڑی یہ دنیا کا سب سے بڑا سمندر تھا۔ ۱۵۱۳ میں بلوا نے خاکنائے پانامہ کو معلوم کیا جب اسپین کے باشندوں کو اس خاکنائے کا علم ہوا تو کافی تعداد میں وہ یہاں آبسے۔

کارٹیز ایک زبردست ہسپانوی لڑاکو تھا۔ ازٹیکز کی قوم میکسیکو کے جنوبی حصہ میں سطح مرتفع پر آباد تھی۔ جو مہذب تھی خوبصورت ہندوانہ طرز کے خوبصورت مندر اور محل سونے چاندی اور جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ جب ہسپانوی سپاہی اپنے گھوڑوں پر سوار ایک عجیب شان سے میکسیکو میں داخل ہوئے۔ وہ چمکدار زرہ بکتر میں ملبوس تھے ان کی بندوقیں خوفناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ بلوا اور اس کے فوجیوں نے دھوکے سے بادشاہ کو پکڑا اور ان کی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔

۱۵۳۰ میں پی زارو ایک ہشیار ہسپانوی فاتح نے خاکنائے پانامہ کی تحقیق کی اور جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی جستجو میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسے کامل امید تھی کہ کارٹیز کی طرح وہ بھی کسی پرانی تہذیب کو یہاں دیکھ پائیگا۔ اور مال ودولت میں کھیلیگا آخر کار کافی کھوج کے بعد کوہ انڈیز کے وسط میں اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایک ایسی راجدھانی معلوم کر لی کہ جس کا بادشاہ بہت بہادر اور طاقتور تھا۔ اس ملک کا تمدن بھی میکسیکو کے مندر تمدن کے طرز پر تھا۔ لوگ کاشتکار تھے اونچے اونچے مندر آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ پر شکوہ محلات اور عالیشان عمارتیں تھیں۔ اور شہر کی ہر عمارت سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے بھری پڑی تھیں۔ اتنی بڑی طاقت کو ہسپانیوں نے کیسے تباہ کیا اس کے لئے قارئین کو جنوبی امریکہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ ہسپانوی لوگ دولت کے لالچ میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے جھوٹ دھوکہ، ڈاکہ زنی، مکروفریب سے اس شاندار تہذیب کا خاتمہ کر کے ہی دم لیا تاہم ان سیاحوں کے دلیرانہ کارنامے بہت نمایاں ہیں۔ انہوں نے بخار زدہ جنگلوں، جھاڑیوں، پتھریلی گھاٹیوں پہاڑیوں اور ایسے میدانوں کو سر کیا کہ جس جگہ پانی تک نہ ملتا تھا اور اپنے سامان، ساتھیوں اور گھوڑوں کے ہمراہ ان علاقہ جات کے بیچوں بیچ نئی دنیا کی معلومات میں اضافہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان معلومات کی خاطر بے شمار قربانیاں دیں۔

جب یورپی اقوام کو نئی دنیا معلوم ہو گئی تو وہ ایک ایک کر کے اس کوشش میں لگ گئیں کہ اپنے لئے کچھ نوآبادیات حاصل کریں۔ جب وہ اپنے مطلب میں کامیاب ہو گئے تو وہ وہاں بس گئے۔ کچھ قومیں نئی دنیا کی زمین پر آزاد رہنا چاہتی تھیں کچھ آپس میں سیاسی تعلقات برقرار رکھنے کی خواہشمند تھیں تو امریکی قوم نے متحد ہو کر امریکہ کی جنگ آزادی لڑی اس میں امریکہ کو فتح ہوئی اور اس دن سے امریکہ آزاد ہے۔ ایسے ہی جنوبی امریکہ میں بھی سپین و پرتگال کے ساتھ درجنوں جھگڑے

چکے گزرے ہیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی کی نئی دنیا اور آج کی نئی دنیا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج کولمبس کو نئی دنیا معلوم کئے ہوئے ۵۰۰ سال ہو گزرے ہیں۔ آج نئی دنیا کی دنیا ہی نئی ہے۔

آج سمندروں کو ہر جانب سے اور ہر قسم کے جہازوں سے عبور کیا جا سکتا ہے۔ آج کا شناجہاز بھی کولمبس کے لکڑی کے جہاز سے کئی گنا بڑا ہے۔ انسان نے سمندر پر پورا قابو پالیا ہے۔ اور انہیں سڑکوں، ریلوں اور موٹر کاروں کی مدد سے خشکی پر مکمل فتح حاصل ہے۔ ہوا کو بھی مٹھی میں کر لیا ہے بحر اوقیانوس جسے کولمبس اور اس کی پارٹی نے کئی ہفتوں میں عبور کیا تھا اب ہوائی جہاز کے ذریعہ صرف چند گھنٹوں کا سفر رہ گیا ہے۔

کولمبس کے وقت شمالی اور جنوبی امریکہ میں کوئی یورپین آباد نہ تھا۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ہسپانوی، پرتگالی انگریز، فرانسیسی، ولندیزی اور دیگر یورپین اقوام فخر سے امریکہ کو مادر وطن کے نام سے پکارتی ہیں۔ ان سیاحوں تاجروں، سوداگروں، سائنس دانوں اور مشنریوں نے نئی دنیا کی دنیا کو بالکل ہی بدل ڈالا ہے۔

کولمبس تو جانتا نہ تھا لیکن اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ امریکہ کے دونوں براعظم شمالی قطب سے جنوبی قطب تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی آب و ہوا اور پیداوار ہے۔ دنیا کے چند بڑے دریا بھی اسی خطۂ زمین میں بہتے ہیں۔ دنیا کے بہت وسیع میدان اور اونچے پہاڑ و گھنے جنگلات کا وجود بھی انہیں دو براعظموں میں ہے۔ کوئلہ، لوہا، چاندی، تانبا، پٹرولیم، گندم، مکی، اور روئی، نئی دنیا میں تمام براعظموں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔

نئی دنیا۔ دنیا کا سب سے مالدار براعظم ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اضلاع متحدہ امریکہ میں دنیا کا ۶۲ فیصدی سونا موجود ہے اور کوئی انسان وہاں غریب نہیں اور اس وقت ماہرین اقتصادیات کو ایک عجیب معمہ درپیش ہے اور وہ یہ کہ قومی ضروریات کی پیداوار اتنی بڑھ چکی ہے کہ فالتو پیداوار کی کھپت کے لئے گنجائش ناممکن ہے اس لئے قومی پیداوار اس طریق سے کم کی جائے گی کہ بیروزگاری نہ بڑھ سکے اضلاع متحدہ امریکہ میں ہر چوتھا آدمی ایک موٹر کار رکھتا ہے۔ اور ہر شخص کی روزانہ آمدنی ایک ہندوستانی کی روزانہ آمدنی سے اکاسٹھ گنا زیادہ ہے۔

آئندہ شمارہ کی جھلک

بملا گپت —— رہنے دو مردوا کو

محبوبہ یاسمین —— عندلیب بیزار

حمیرا خاتون —— بھکارن

نرگس —— آدرش گھرانہ

دیاکشن گردش —— ٹراجن کا محاصرہ

محمد شبیر —— قصیدہ اور مرثیہ

اخگر عسکری —— غلط فہمی

اقبال تمنائی —— چور کے خطوط

عبدالعزیز علائی —— چھلاوہ

حمید نظامی —— این۔ بولین کا خواب

طالب گورگانی —— شیاما

عشرت کاشمیری —— ندامت

حنیف ہاشمی —— کالیداس

دولت رام گپت —— مجبوری

عزیز کاش —— گل و بلبل

موہن یاور —— تنگی

محمد عمر (نور الٰہی)

آج عید ہے

ارکان

ایرج .... ایک سوداگر
سلمہ .... ایرج کی بیوی
چنبیلی .... خادمہ
منصور .... ایرج کا دوست
منشی جی .... 〃 〃 〃
حامد۔ سپاہی، کانسٹیبل وغیرہ غیر معروف ارکان ! !

عید کا آفتاب ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔ دیر سے اٹھنے والے بھی آج سویرے نیند کو خیرباد کہہ رہے ہیں اس بیداری کی رو میں ایرج اور سلمہ کی نیند بھی بہہ جاتی ہے دونوں جاگ اٹھتے ہیں۔ اور اپنے اپنے پلنگوں پر پڑے عید کا پروگرام مرتب کرتے ہیں

ایرج = بیگم! آج عید ہے۔

سلمہ = ہوں!

ایرج = میں کہتا ہوں آج عید ہے

سلمہ = ہاں!

ایرج = سمجھی نہیں میرا مطلب شاید

سلمہ۔ آج عید ہے خوب! بھلا یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کون نہیں جانتا کہ آج عید ہے میاں یا تم مجھے کودن سمجھتے ہو یا آپ گھامڑ ہو۔

ایرج۔ کون کہتا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ آج عید ہے۔ مگر تم ساری بات سن لیتی تو معلوم ہوتا کہ میرا مطلب کیا ہے۔

سلمہ۔ تمہارا مطلب کیا ہے۔ یہی کہ خرچ کم اٹھے ناک بانسے پر دمڑی نہ جائے۔

ایرج۔ یہ بھی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کفایت شعاری عورتوں کا زیور ہے۔ قرض اٹھا کر عید منانا اور پھر سال بھر بیٹھے کے آگے پانی بھرنا کہاں کا ایمان ہے۔ مگر میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔

سلمہ۔ فضول خرچ ٹھہرایا۔ پھوہڑ بنایا۔ اب کچھ اور کہنا باقی ہے۔ تو وہ بھی کہہ ڈالو۔

ایرج۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ آج عید ہے برس برس کا دن۔ آزمائش کے طور پر آج ۳۶۵ دنوں کے معمول سے الگ رہیں۔

سلمہ۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔ معلوم نہیں آج عید ہے۔ پہیلیاں بجھنے اور سننے کا میرے پاس

وقت نہیں۔

ایرج۔ مطلب یہ ہے کہ سال بھر میں کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ جب کسی نہ کسی بات پر ہماری جھوٹ نہ ہوتی ہو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آج عید ہے اور آج کے دن ہم کوشش کریں۔ کہ یہ دانتا کلکل نہ ہونے پائے۔

سلمہ۔ تم ایک دن کے لئے چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سال بھر ہی امن چین سے گزرے۔ اور ہر روز عید ہو۔ مگر خدا نے تمہیں کھوپری ہی اوندھی دے رکھی ہے۔ بغیر لڑے جھگڑے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

ایرج۔ خیر اس بات کو جانے دو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال آج عید ہے۔ اور کسی قسم کی بدمزگی میری یا تمہاری جانب سے نہیں ہونی چاہیئے۔ تاکہ آج سچے معنوں میں عید ہو جائے آج یہ قربانی دیں کہ ایک دوسرے کا دل دکھانے سے باز رہیں۔

سلمہ۔ میرے لئے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر تمہیں جبر کرنا پڑیگا۔ اپنے پر اور اپنی عادت کو قربان کرنا پڑے گا۔

ایرج۔ بیگم دیکھنا "آج عید ہی بنائیے فساد نہ بنجائے۔"

سلمہ۔ تو ان باتوں کو کل پر اٹھا رکھو۔ سب سے بہتر روک تھام یہ ہے کہ نہ تم میری شکل دیکھو نہ اپنا مکھڑا مجھے دکھاؤ تم بھی "آج عید ہے" گاتے پھرو۔ اور میں بھی "آج عید ہے" الاپتی رہوں

ایرج۔ کیوں نہ دونوں عید کا چاند بن جائیں اور سال بھر بعد آ سلام کریں!

سلمہ۔ یہ تو تم خدا سے چاہتے ہو۔ اگر اتنے ہی بیزار ہو تو قصہ پاک کرو۔ جہاں دو سو آدمی ہر روز کھانا کھاتے ہیں۔ وہاں مجھے بھی میکے سے دو چپاتیاں مل ہی جائیں گی!

ایرج۔ بیگم! تم تو پوری طلاق کا اہتمام کر رہی ہو "آج عید ہے" اور ایسی باتیں زبان پر لانا مناسب نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نماز کے بعد میرے چند دوست میرے یہاں کھانا کھائیں گے۔

سلمہ۔ تمہارے چند دوستوں کی تعداد کیا ہوگی!

ایرج۔ یہی چار پانچ۔

سلمہ۔ تو تمہارے نصف درجن دوست ہمارے یہاں کھانا نہیں کھا سکتے۔

ایرج۔ کیوں؟

سلمہ۔ اس لئے کہ "آج عید ہے"۔ اور تمہارے دوستوں کی شکم پروری کے علاوہ مجھے اور بھی کام ہیں۔ اگر یہ درست ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جم سکتی۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ ایک آدھ گھنٹے میں پانچ آدمیوں کا کھانا نہیں تیار ہو سکتا۔

ایرج۔ "آج عید ہے"۔ اور عید کے دن ہر گھر میں اتنا پکتا ہے کہ دو چار مہمانوں کے لئے کھانا نکل آنا کوئی بڑی بات نہیں بیگم! ایک دفعہ عید کے دن میں تمہارے میکے گیا۔ کوئی بیس دوست میرے ہمراہ تھے۔ اور وہاں سے اتنا کھانا نکلا کہ چالیس کے لئے کافی تھا۔

سلمہ۔ میرے میکے میں ہوئے اللہ رکھے شاہی ٹھاٹھ اور یہاں یہ حساب ہے کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھائے مگر یہ تو کہو اس بات کا تم نے ذکر تک نہیں کیا مجھ سے۔ تمہیں شرم نہ آئی یہ بھیڑ ساتھ لیجاتے اور میرے میکے کی لاج کے لاگو ہوتے۔

ایرج۔ بیگم آج عید ہے۔ اور یہ بات کل پر اٹھا رکھو۔ اور کوئی ایسا انتظام کرو۔ کہ میری بات رہ جائے۔

دیکھو نا! بیگم میں نے کل ان سے وعدہ کرلیا۔ اور اب ...... ـــــ

سلمیٰ۔ اور اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ آج عید ہے اور بیسّ کے قریب میری سہیلیاں ہمارے یہاں کھانا کھا رہی ہیں۔

ایرج۔ تمہاری بیسّ سہیلیاں کھا سکتی ہیں۔ اور میرے چار دوست نہیں کھا سکتے۔

سلمیٰ۔ جی! کیونکہ میری سہیلیوں کی اطلاع تین مہینے پہلے سے ہو چکی ہے۔

ایرج۔ مجھے کیوں نہ بتایا؟

سلمیٰ۔ اسی لئے کہ ضرورت نہ تھی ہنڈیا اور چولھے کے اختیارات میں مرد کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

ایرج۔ تو انہیں کیا کہوں۔

سلمیٰ۔ کوئی بات بنا کر ٹال دو۔

ایرج۔ جھوٹ بولوں

سلمیٰ۔ کیا مضائقہ ہے سعدی بھی وقت بے وقت جھوٹ بولنے پر آمادہ ہیں تو تمہیں دریغ ہے اب میں باورچی خانے جاتی ہوں۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ آج عید ہے۔

ایرج۔ سب کہتے ہیں آج عید ہے!

سین دوم

ایرج کے دوست دیوان خانے میں اس کے منتظر ہیں:

منصور۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر ابھی تک بھیا ایرج محل سرا سے نہیں آئے۔ شاید بھول گئے کہ آج عید ہے۔

منشی۔ یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔ خدا خیر کرے۔ آج بہت دیر ہوئی۔ اور یہ ان کے معمول کے خلاف ہے۔

منصور۔ معمول کے خلاف تو ہے منشی جی! مگر آج کا دن بھی تو معمول کے خلاف ہے۔ آج عید ہے اور یہ دن سال بھر کے بعد آتا ہے۔

منشی۔ عید سال بھر کے بعد آئے یا دو سال کے بعد مگر میاں آتی ہمیشہ رہی ہے اور حضور نے آج تک اتنی دیر کبھی نہیں لگائی

منصور۔ ہو گا کوئی گھر کا بکھیڑا۔ اُلجھے ہوں گے کسی بات میں۔ منشی جی! گھریلو زندگی بھی تو جھاڑیوں میں آشیانہ بنانا ہے۔ جھولیاں بھر پھول لینگے تو دو چار کانٹے بھی چُبھ ہی جائیں گے کسی وقت۔

منشی۔ جو کہتے ہو برحق ہے۔ گھر میں امن چین ہے تو ہر روز روز عید ہے۔ اور جو گھر میں جوتیوں دال بٹتی ہو۔ تو کچھ تو حضرت عید محرم سے کم نہیں۔ اور ایسا ہی فرمایا ہے حضرت امام اقبال نے:

منصور۔ (ہنستا ہے) ارے منشی جی برس برس کے دن تو بے تکی ہانکنے سے پرہیز کیا کرو۔ جناب اقبال کو انفرادی جھمیلوں سے کیا واسطہ۔

منشی۔ میاں منصور واللہ، آپ سے بات کرنا تو بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔ بات ہوئی ہوئی پر مین میکھ نکالنا کہاں کی بھل منسی ہے۔ حضرت کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت سما سکتی ہے۔

منصور۔ ارے منشی جی! خدا آپ کے دماغ کو سنبھالے یہ کثرت میں وحدت تو ہوئی مگر یہ وحدت میں کثرت کیا معنی رکھتی ہے!

منشی۔ بس جناب بس میں اس قسم کی گفتگو برداشت نہیں کر سکتا۔ بڑی بڑی محفلوں میں گیا ہوں۔ گھنٹوں باتیں کی ہیں۔ مگر قسم لے لو جو کسی محفل سے نکالا گیا ہوں۔ (ایرج آتا ہے)

منصور۔ بھیا تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ شاید تمہیں دھیان نہیں رہا۔ کہ آج عید ہے۔

ایرج۔ مجھے اور یاد رہے آج عید ہے۔ اور آج کی عید تو میں بھول نہ بھولوں گا۔

منشی۔ میں نے کہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا۔ کہ آج عید ہے۔

ایرج۔ تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا۔ منصور ارے میاں مجھے اطلاع تو دی ہوتی۔

منصور۔ منشی جی کی باتوں میں کچھ ایسا بہل گیا کہ دھیان ہی نہ رہا۔

ایرج۔ منشی جی اپنے رنگ کے ایک ہیں شہر بھر میں۔

منشی۔ سُنا میاں منصور سچ کہا ہے کسی نے

قدر جوہر جوہری داند!
قدر زر زردار کو معلوم ہے!

(ایرج اور منصور ہنستے ہیں)

منصور۔ منشی جی آپ کی لیاقت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟ مگر ذرا استعمال میں رخنہ پڑ جاتا ہے۔

منشی۔ اچھا بتائیں آج عید ہے اور دن بھر آپ کیا کریں گے۔ اور کیا نہ کریں گے۔

ایرج۔ یہ تو منشی جی نے پتے کی کہی۔ کہو بھیا منصور آج کیا پروگرام ہے۔

منصور۔ پروگرام تو بنا بنایا ہے۔ سب سے اول چلیں گے عید گاہ میں نماز ہوگی۔ اور ملاقات، پھر آئیں گے آپ کے یہاں اور کھانا کھائیں گے۔ کچھ پتنگ بازی ہوگی۔ پھر منی جان کا گانا سنیں گے۔ اس کے بعد مقبرہ میں چائے ہوگی۔ ٹھیک چھ بجے سٹار سینما اور پھر رفیق صاحب کے ہاں کھانا۔ اس کے بعد شما بیز ما بسلامت اپنی اپنی گاڑی اور اپنا اپنا گھر۔

ایرج۔ اس پروگرام میں ذرا ترمیم کی ضرورت ہے۔

منشی۔ سراسر لغو اور خلاف شرع۔ صرف عید گاہ جانا اور آپ کے ہاں کھانا کھانا ٹھیک باقی سب بے ہودہ۔ ۴ بجے وعظ سنیں اس سے فارغ ہو کر درگاہ خواجہ گیسو دراز میں چلیں۔ چراغاں دیکھیں۔ اور رفیق صاحب کے دستر خوان پر پہنچ جائیں۔

منصور۔ اسے آپ عید کہتے ہیں۔

ایرج۔ منشی صاحب کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں اور بس۔ پروگرام منصور بھیا آپ کا ٹھیک ہے مگر مشکل یہ ہے کہ میرے یہاں کھانا مصلحت کے خلاف ہے۔ چنانچہ سعدی......

منصور۔ سعدی کو رکھئے الگ۔ اس سے سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ آپ نے پہلے کہا ہوتا۔

ایرج۔ مگر اس حادثہ کی کسے خبر تھی۔

منصور۔ خیر سے باشد؟

منشی۔ اللہ اپنا رحم کرے ہُوا کیا آخر۔

ایرج۔ گھر میں طاعون ہو گئی۔

منصور۔ خدا فضل کرے بھائی شکر ہے۔ میں نے پان نہیں کھایا، ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔ اجازت دیجئے۔

ایرج۔ تو آپ باقی احباب سے بھی معذرت کر دیں۔

منصور۔ ضرور ضرور آداب تسلیم (جاتا ہے)

منشی۔ بندہ بھی رخصت ہوتا ہے۔ خدا رحم کرے۔ جاں نثار ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں بال بچے دار

ہوں۔ اور کوئی سہارا نہیں۔ پھر بھی اگر ضرورت پڑے تو اطلاع دیں۔ خدا فضل کرے۔ اور آج عید ہے۔

سین سوم

(سلمہ عید کی تیاریوں میں مصروف ہے!)

سلمہ۔ نگوڑی اجلی ابھی تک نہیں آئی۔ وہ عید گاہ کیا پہن کر جائیں گے۔

چمبیلی۔ آ بھی آتی ہوگی۔ میں اسے بڑی تاکید کر کے آئی ہوں۔ حمام گرم ہے۔ میاں کے نہاتے نہاتے پہنچ جائیگی۔

سلمہ۔ ماما سے پوچھو کھانا تیار ہے۔

چمبیلی۔ جی ہاں پہلے ہی پوچھ آئی ہوں۔ میاں آ گئے۔

(ایرج آتا ہے)

ایرج۔ شام کیا ہے؟ بہت دیر ہو گئی۔ دیکھو حمام جلتی بھی ہے یا نہیں۔

سلمہ۔ خیر! ملی تو کیا اور نہ ملی تو کیا۔

ایرج۔ ملی تو کیا اور نہ ملی تو کیا خوب! کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔

سلمہ۔ مسلمان تو ہو۔ مگر عید کی نماز تو ان کے لئے ہے جنہوں نے کوئی قربانی کی ہو۔ نہیں تو یہ نماز کس برتے پر۔ منشی جی نے ایک دن احفظ کا ایک شعر گایا تھا۔

ایرج۔ کیا؟

سلمہ۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

ایرج۔ کیوں قربانی نہیں کی۔ دیکھو بکرے ذبح ہوئے ہیں!

سلمہ۔ یہ تو ہوئی ایرج انسان کی قربانی مگر ایرج خاوند نے قربانی نہیں کی۔

ایرج۔ وہ کس طرح ہوتی ہے بیگم۔

سلمہ۔ سنا نہیں!

بیوی جو بات کہہ دے اسے مان جائیے
قربان ہوشیوالی پہ قربان جائیے

(دونوں ہنستے ہیں)

ایرج۔ بیگم اگر تمہارا فتویٰ چلے تو عید گاہ سنسان ہو جائے۔ اور گنتی کے چند بڈھے خاوندوں کے سوا کوئی نظر نہ آئے۔ اچھا بیگم میں غسل خانے جاتا ہوں۔ کپڑے اندر پھینک دینا۔

سلمہ۔ اری چمبیلی! اجلی ابھی تک نہ آئی۔ میاں غسل خانے میں داخل ہو گئے اور کپڑے ندارد۔

چمبیلی۔ اللہ جانے کیا بن گئی۔ بدبختی اب تک نہیں پہنچی۔

سلمہ۔ جمن کو کہو بھاگا بھاگ جائے اور کچھ نہیں تو میاں کا ایک جوڑا ہی لیتا آئے۔

ایرج۔ چمبیلی میں نہا چکا کپڑے پھینکو جلدی۔

سلمہ۔ اتنی جلدی نہا چکے۔

ایرج۔ اور کیا۔

سلمہ۔ صرف سر پر ہی صابن لگایا ہوگا۔

ایرج۔ اور کیا جلد کپڑے پھینکو اکڑ رہا ہوں سردی سے۔

سلمہ۔ واہ! یہ بھی کوئی نہانا ہے۔ سارے بدن پر صابن لگاؤ۔ آج عید ہے۔ چمبیلی کہو!

چمبیلی۔ جمن گیا ہے موٹر کی چال آیا ہی سمجھو۔

ایرج۔ بیگم صابن ختم ہے۔

سلمہ۔ یہ لو (ٹکیہ کے گرنے کی آواز)

ایرج۔ ہائے ہائے!

سلمہ۔ کیا ہوا۔

ایرج۔ ٹکیہ عین سر پر پڑی۔ بھنا گیا ہوں۔ چکر آ رہے ہیں!!

سلمہ۔ خیر! آج عید ہے۔ ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ گرم پانی ڈالو سر پر۔

ایرج۔ کچھ نہیں بنتا چوٹ شدید ہے۔

سلمہ۔ تو یہ لو سپرٹ کی بوتل خوب سر پر ملو۔

ایرج۔ عید کے دن لوگ عطر لگاتے ہیں۔ خوشبو دار تیل ڈالتے ہیں۔ میرے لئے سپرٹ کی بوتل

سلمہ۔ تو صبر کرو۔ یہ بھی ایک قربانی ہے۔

ایرج۔ کپڑے تو پھینکو یہ سب قربانیاں میرے سر کے لئے ہیں۔

سلمہ۔ کپڑے ابھی نہیں مل سکتے۔

ایرج۔ کپڑے نہیں مل سکتے کیوں؟

سلمہ۔ اس لئے کہ دھوبی کا انتظار ہے۔

ایرج۔ کپڑے نہیں تھے۔ تو مجھے غسل خانے میں کیوں دھکیل دیا۔

سلمہ۔ تاکہ تم اطمینان سے نہا سکو۔ قربان ہونا سیکھو

ایرج۔ بیگم گرم پانی ختم ہے۔ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ دیکھنا کہیں غسل عید غسل میت نہ ہو جائے۔

سلمہ۔ میاں حوصلہ سے کام لو۔ آج عید ہے۔ حوصلہ کرنا بھی قربانی میں داخل ہے۔

ایرج۔ ہائے ہائے آج عید ہے۔ اور میرے لئے یہ قیامت کی سردی۔

سلمہ۔ میاں یہ غلط ہے۔ قیامت کے دن سردی نہ ہوگی!

ایرج۔ ارے قیامت تو آتے ہی آئے گی۔ مگر آج کی عید میرے لئے قیامت ہو گی چائے تیار رکھنا۔ کوکو نہ پیونگا۔ ذرا برانڈی مل جائے۔ تو اچھا ہے۔

سلمہ۔ کیا بچوں سی ایسی حرکتیں ہیں۔

(چمیلی کپڑے لے کر دوڑی آتی ہے)

یہ لو کپڑے لے آئی چمیلی بس اتنی سی بات کے لئے گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ توبہ ہے دوپہر سر پر آئی۔ ابھی حصے بکھرے پڑے ہیں۔

ایرج۔ لیجئے! اچکن میں ایک بھی بٹن نہیں۔

سلمہ۔ تو دوسرا پہن کر چلے جاؤ۔

ایرج۔ نہیں آج عید ہے۔ اور عید کے لئے یہی اچکن موزون ہے۔

سلمہ۔ تو بٹن نہ سہی۔

ایرج۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ بغیر بٹن کے اچکن کیا ہوگی۔ چھپانے سے ٹانک دونا۔

سلمہ۔ اری چنبیلی لا سوئی میری تلے دانی۔

چنبیلی۔ مگر بیگم اس میں کوئی بٹن نہیں ہے۔

سلمہ۔ تو جمن سے کہو لپک کر جائے۔ اور بٹن لے آئے۔

چنبیلی۔ بیگم جمن تو حصے پہنچانے گیا ہے۔ اور پھر آج عید ہے۔ منیاری بند ہے۔

سلمہ۔ تو میاں شال اوڑھ لو۔ اچکن کے اوپر۔

ایرج۔ اور سنو یہ پاجامہ بھی میرا نہیں۔ گھٹنوں سے اوپر جا رہا ہے۔ اچھی خاصی نکر معلوم ہوتا ہے۔

سلمہ۔ (ہنستے ہوئے) تو اچھا ہوا لوگ کہیں گے خان صاحب پورے شرعی ..... ہو گئے ہیں۔

ایرج۔ اچھا! لاؤ شال جو دیکھے گا کیا کہے گا۔

سلمہ۔ تمہاری شال دیکھنے کے علاوہ لوگوں کو اور بھی کام ہیں۔ اور جو کسی بے فکرے نے پوچھا بھی تو کہہ دینا پنڈا بھیگا ہے۔

ایرج۔ اور آج عید ہے۔

سلمہ۔ عید کو بیمار پڑنے کی تو مناہی نہیں۔ جاؤ۔ سدھارو خیر سے نہیں تو جماعت نہ ملے گی!!

سین چہارم

(لوگ بازار میں باتیں کر رہے ہیں)

قدرت کے کھیل ہیں بھائی کہیں ماتم ہو رہا ہے
تو کہیں نقارے بج رہے ہیں۔

—— اور ابھی کل چنگے بھلے تھے۔ انسان کی زندگی بھی
ہوا کا جھونکا ہے۔ آیا نکل گیا۔

—— بڑے کنبے والے تھے۔ مرحوم سات لڑکیاں
اور چار لڑکے اللہ رحم کرے

—— میاں ایرج کے ایسا نہیں ملے خندہ پیشانی آدمی
محلہ بھر میں ڈھونڈے نہ ملے گا۔

—— تو اب عید پڑھنے کے بعد جنازہ ہو گا۔

—— لوگوں کا کام کاج سے فارغ ہونا تو ضروری
ہے۔

—— ارے بھائی اشرف خدا جھوٹ نہ بلائے سامنے
سے میاں ایرج تو نہیں آ رہے۔

—— توبہ کرو بھیّا! وہ تو رات کا ٹھنڈا ہو چکا۔ پلیگ
ہو گئی تھی بے چارے کو

—— معلوم تو ایرج ہی ہوتے ہیں۔ مگر شال کیوں
اوڑھے ہیں۔ ذرا آواز تو دو۔

—— اور جو پریت ہو تو مجھے ہی چمٹ جائے۔ واہ
بھئی خوب صلاح دیتے ہو۔

—— اجی چھوڑو ان باتوں کو۔ لو میں آواز دیتا
ہوں۔ اے بھیّا ایرج! ذری اِدھر آئیو!

ایرج۔ بھائی عید مبارک ہو۔

—— اچھے تو ہو۔

ایرج۔ شکر ہے خدا کا۔

—— اور یہ شال کیوں اوڑھ رکھی ہے۔ میاں

ایرج۔ ذرا تپ چڑھی ہے۔

—— جا کہاں رہے ہو۔

ایرج۔ جہاں سب کو جانا ہے۔

—— اتنے مایوس نہ ہو میاں اللہ کے رحم پہ نظر
رکھو!

ایرج۔ مایوس ہونے کی کونسی بات ہے۔ عید گاہ نہ
پہنچ سکے تو مسجد تو کہیں گئی نہیں۔ آئیے میاں
ذرا عید مل لیں

—— اس سے تو معاف ہی رکھئے پاس کھڑے
ہو کر باتیں کر لیں۔ اسے ہی غنیمت سمجھئے نہیں
تو جانتے ہو۔ جسے پلیگ کی تپ چڑھی ہو
اس کے پاس تو کوئی پھٹکتا تک نہیں۔

ایرج۔ مجھے پلیگ کی تپ؟

—— خدا کرے جھوٹ ہو اب جاؤ بھیّا! نہیں تو
جماعت نہ ملے گی۔

(سب بھاگ جاتے ہیں)

حامد! نکلتا ہے

حامد۔ کون ایرج؟

ایرج۔ جی ہاں! حامد عید مبارک۔

حامد۔ واللہ تمہیں مل کر میری خوشی کی حد نہ رہی۔
میں نے تو کچھ اور سُنا تھا۔ مگر یہ شال کیوں
اوڑھے ہو۔

ایرج۔ کچھ حرارت سی ہے۔

حامد۔ اللہ رحم کرے دیکھو میاں زبانِ خلق نقارۂ
خدا ہوتی ہے۔ پلیگ نہ ہو گی۔ مگر آثار وہی
ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ گھر جا کر چارپائی پر پڑ رہو۔

ایرج۔ ذرا ہاتھ تو ملائیے۔

حامد۔ اس کے لئے میں تیار نہیں خدا حافظ۔

(بھاگ جاتا ہے)

ایرج۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں جیتے جی مر گیا

ہوں یا مجھ سے چھونا موت کو بلانا ہے۔ اب
عید گاہ جانا بے سُود ہے۔ مسجد ہی میں نماز
ہو جائے۔

سپاہی۔ حضور کا نام ہے نامرزا ایرج۔

ایرج۔ ہاں کیوں کہتے ہو۔

سپاہی۔ حضور یہ حکم ہے تعمیل کرواد سے ہوں

ایرج۔ بھلے آدمی آج عید ہے۔ کل آنا۔

سپاہی۔ نہیں حضور مجبوری ہے یہ رہا حکم نامہ۔

ایرج۔ (پڑھتا ہے) نوٹس بنام ایرج۔ چونکہ تمہیں
پلیگ کا مرض ہوا ہے۔ یا تمہارے گھر میں کسی
کو ہوا ہے لہذا عافیت عامہ کے لحاظ سے
تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم بلا حصول سارٹیفکیٹ
ڈاکٹری کسی مجمع عام میں نہ جاؤ مسجد ہو کہ جلسہ
سینما ہو وغیرہ۔ افسر محکمہ امراض وبائی۔

سپاہی۔ بس حضور اتنی سی بات ہے۔

ایرج۔ تم لاکھ تعمیل کراؤ مگر میں عمل نہیں کرسکتا جو ہوگا
دیکھا جائیگا۔

سپاہی۔ سلام حضور۔

ایرج۔ سلام۔

سپاہی۔ اور حضور آج عید ہے۔

ایرج۔ کہتے تو ہیں آج عید ہے۔ مگر میری جو گت بن
رہی ہے یہ تو ہولی کا رنگ دکھا رہی ہے۔ تم
مکان پر آنا۔

سپاہی۔ حضور سلامت رہیں۔ اگلی عید پر حاضر ہونگا۔
پلیگ والے گھر میں کون آوے ہے.....
سلام حضور۔

ایرج۔ یہ آج کیا مذاق ہو رہا ہے۔ سعدی صاحب
کی نصیحت تو خوب رنگ لا رہی ہے۔ اچھا
میاں ایرج چلو مسجد۔

کانسٹیبل۔ ٹھیریئے آپ مسجد کے اندر نہیں جاسکتے

ایرج۔ کیوں یہ تو خدا کا گھر ہے ہر مسلمان کا حق
ہے۔ کہ مسجد میں جائے۔

کانسٹیبل۔ مگر اس مسلمان کا نہیں جو پلیگ زدہ ہو۔

ایرج۔ مسلمانوں کو خبر ہوگئی۔ کہ اسلام خطرے میں
ہے۔ تو تمہیں نوچ کر رکھ دیں گے۔

کانسٹیبل۔ کوئی مسلمان نہیں چاہتا۔ کہ آپ مسجد
میں جائیں۔

ایرج۔ تمہیں کس نے کہا۔

کانسٹیبل۔ یہ دیکھو مفتی صاحب کی درخواست اور
صاحب بہادر کا حکم۔

ایرج۔ اس کمبخت مفتی کو کیا ہوا مگر یہ کہاں کا نمائندہ
ہے۔ عام مسلمان کبھی معترض ہوسکتے ہیں؟

کانسٹیبل۔ دریافت کئے لیتے ہیں۔ میں مسجد کے دروازے
سے پوچھتا ہوں آپ سن لیں۔

ایرج۔ یہ ہوئی نا بات۔

کانسٹیبل۔ حضرات میرزا ایرج صاحب مسجد میں داخل
ہونا چاہتے ہیں۔ کیا آپ رضا مند ہیں۔
(آوازیں ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ اللہ اکبر
اللہ اکبر اللہ اکبر۔

کانسٹیبل۔ فرمائیے جناب اب۔

ایرج۔ سعدی نے کہا کہ مصلحت......

کانسٹیبل۔ حضرت سعدیؒ کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ اور
اگر ہڈیوں کی خیر چاہتے ہیں تو ناک کی سیدھ
گھر چلے جائیے۔

ایرج۔ کہتے ہیں آج عید ہے۔

سین پنجم

(چنبیلی حصے واپس لے کر آتی ہے)

سلمہ۔ چنبیلی حصے پہنچا آئی سب کے یہاں؟
چنبیلی۔ جی ہاں لے آئی۔
سلمہ۔ لے آئی؟ کیا کہتی ہے نگوڑی۔
چنبیلی۔ جی ہاں لے آئی۔ سب نے واپس کر دیئے۔
سلمہ۔ کیوں ہیں نے تو سب کے رکھو لئے۔
چنبیلی۔ آپ نے رکھ لئے وہ نہیں رکھتے۔
سلمہ۔ اس کا کارن؟
چنبیلی۔ کل بتاؤں گی۔ آج عید ہے۔
سلمہ۔ کہتی کیوں نہیں مردار! نہیں تو گدی سے زبان کھینچ لوں گی۔
چنبیلی۔ بی بی وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو کھانا اُٹھا کر بھیج دیا۔ آخر ہم بھی بال بچے والے ہیں۔ برس برس کے دن اپنی بلا دوسرے کے سر ڈالنا کہاں کی شرافت ہے کھانا کہیں بھاگا جاتا تھا۔ جب اصل خیر ہوتی دیکھا جاتا اور کوئی بی بی کھانے پر بھی نہیں آئیں گی۔
سلمہ۔ بس بس ناشدنی اتنی بکواس کہاں سے سیکھ آئی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ کہ سب ناراض کیوں ہو گئیں؟

(ایرج آتا ہے)

ایرج۔ اِس لئے کہ آج عید ہے۔ اور شہر کا شہر ناراض ہو رہا ہے۔ کچھ ایسی ہوا چلی ہے۔ کہ کوئی سید سے مُنہ بات کرنے کا روادار نہیں
سلمہ۔ میاں نماز ہو گئی؟
ایرج۔ ہاں قضاء ہو گئی۔
سلمہ۔ کیوں؟
ایرج۔ اِس لئے کہ کسی نے مسجد میں گھسنے نہیں دیا۔
سلمہ۔ تو کیا ہم کافر ہو گئے؟
ایرج۔ اس سے بھی بدتر۔ ہاتھ ملاتے گھبراتے ہیں۔ اور کنی دبا کر نکل جاتے ہیں۔ یہ صورت ہے شہر کی۔
سلمہ۔ یہ بُری ہوئی۔ سات لڑکیاں چار لڑکے آیندہ کا حال خدا جانے۔ یا اللہ رحم کر ہم غریبوں پر۔
ایرج۔ اور آج عید ہے۔
چنبیلی۔ بیگم میری سلام میں چلی،
سلمہ۔ اری تجھے کیا ہوا؟
چنبیلی۔ دیکھو نا حضور [illegible] آنکھیں دیکھی ہیں میں [illegible] نہیں لگا سکتی۔
سلمہ۔ اری تیرے ایمان کو [illegible]
چنبیلی۔ آپ کافر ہوئے۔ تو یہاں کا اَن پانی حرام ہے نوکری کرنی ہے۔ دوزخ تک ساتھ نہیں دیتا۔
سلمہ۔ میاں کی باتوں پر جاتی ہو ان کا کوئی کبھی سر پیر بھی ہوتا ہے۔ اصلیت کھُلے گی۔ تو پتہ چلے گا۔
ایرج۔ اچھا میری باتیں بے معنی ہیں۔ ذہنیت کا قصور ہے۔ ذرا باہر جاؤ تو پتہ چلے۔
سلمہ۔ مجھے ڈر ہے میاں۔
ایرج۔ مگر کس بات کا ڈر۔
سلمہ۔ یہی کہ تم سڑی تو نہیں ہو گئے
جمن۔ اری چنبیلی میاں سے کہو باہر منشی جی آئے ہیں۔
ایرج۔ میں سڑی ہو گیا ہوں۔ مجھے پلیگ کی تپ چڑھی ہے۔ اور آج عید ہے۔

سین ششم

منشی۔ بڑا دُکھ ہوا یہ سُنکر اور آج عید ہے۔
ایرج۔ ہونا چاہیئے۔

منشی۔ خدا کی مرضی مشیت ایزدی۔
ایرج۔ مشیت ایزدی دیکھئے منشی جی آج عید ہے اور ہمارے لئے اچھا خاصہ محرم بن گیا ہے چالیس آدمیوں کا کھانا پکا پڑا ہے۔ اور کوئی کھانے والا نہیں ملتا۔
منشی۔ کیا عرض کروں کلمہ کفر نکل گیا زبان مبارک سے ممکن ہے اس میں آپ کا بھلا ہی ہو...
ایرج۔ مگر ہم نے کسی کا قصور کیا کیا ہے؟
منشی۔ اب جانے دیجئے توبہ اللہ میاں سے شکوہ اقبال ہی کو زیب دیتا ہے۔ صبر کیجئے!
ایرج۔ ہاں! کہو تو کیا ہم نے کسی کا باپ مارا ہے جو ایک دم شہر بھر نے ہمارا بائی کاٹ کر دیا ہے۔
منشی۔ حضور ایسے موقعوں پر ایسا ہو ہی جاتا ہے میں نے سب سامان ٹھیک کر لیا ہے۔ ہاں خرچ ذرا معمول سے زیادہ اُٹھے گا۔ آپ جانتے ہیں آج عید ہے۔
ایرج۔ کیسا سامان؟
منشی۔ یہی تجہیز و تکفین کا۔ گورکن قبر کھود رہا ہے۔
ایرج۔ کس کی تجہیز و تکفین کس کی قبر؟
منشی۔ حضور مرحوم کی۔
ایرج۔ کون مرحوم میں نہیں سمجھا۔
منشی۔ حضور جس نے آپ کے گھر میں وفات پائی۔
ایرج۔ کیا بکتے ہو منشی جی ہمارے گھر میں خدا کا فضل ہے سب چنگے بھلے ہیں۔
منشی۔ تو پلیگ کس کے دشمنوں کو ہوئی؟
ایرج۔ دشمنوں کو نہ دوستوں کو۔
منشی۔ تو یہ پلیگ پلیگ کیا ہو رہی ہے؟
ایرج۔ ہاں یہ پلیغ کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ یہ میرا تخلص ہے۔
منشی۔ آپ نے منصور کو خود تو کہا تھا۔
ایرج۔ وہ تو صرف کھانا ٹالنے کی غرض سے کہا تھا
منشی۔ تو یہ بات ابھی تردید ہو جاتی ہے فکر نہ کریں۔
ایرج۔ اور جو منوں کھانا جمع ہو رہا ہے۔
منشی۔ کھانے والے بھی آ جائیں گے۔
ایرج۔ تو میں سمجھوں گا؟ کہ آج عید ہے!!

"طعنہ"

آفتاب ملک

نمبردار کی لڑکی رادھا چشمے پر جب آئے!
حُسن انگڑائیاں لے کر جاگے عشق مُوا سو جائے!
کنول کنول پر مستی جھومے کلی کلی مسکائے!
اور فضا بھی میٹھے سپنوں سے بھر جائے!
زلفیں سنبل آنکھیں نرگس بات کرے بل کھائے!
دیکھ کے یہ پھولوں کی ڈالی ہر بھنورا للچائے!

پچھلے مہینے اِک پردیسی اس چشمے پر آیا
چپکے چپکے بھولی بھالی رادھا کو پھسلایا!

اب کیوں رادھا اِس چشمے پر جل نہیں بھرنے آئے
جس لڑکی کو بابو روکے جیتے جی ہی مر جائے!

کوثر سیمابی

سلوٹیں

گامی سلیم۔ کلّو اور میرے ماموں اب بھی میرے لئے معمّہ ہیں۔ مگر میں اس معمّہ کو سلجھانے کی کوشش نہیں کرتی۔ ہاں صبح صبح جب کبھی اپنے بستر کو دیکھتی ہوں۔ تو مجھے ماموں کے بستر کی سلوٹیں یاد آجاتی ہیں

میری ماں نے جب اس دُنیا کو چھوڑا۔ تو میں اس وقت چودہ برس کی تھی۔ میرے سرپرست ماموں ہی تھے۔ پڑوسن رضیہ بھی کبھی میرے ہاں آیا جایا کرتی اور مجھے روتے میں ڈھارس دیتی۔ میری ماں غریب تھی۔ کوئی اثاثہ نہ چھوڑا لیکن صرف چند طلائی زیورات اور چند گنتی کے پارچات۔ بس یہی جائداد تھی۔ مکان تو خود آبا جان اپنی زندگی میں بیچ گئے تھے۔ اور کرایہ پر رہائش اختیار کرلی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میری ماں کو بے شمار صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔ ایک ماموں تھے۔ سو وہ بھی ہمارے ہی چوٹھے چھچے کے شریک — تمام عمر لنڈورے ہی رہے۔ اگر وہ کچھ کما سکتے۔ تو شاید دن پھلے آ جاتے۔ ماں اکثر کہا کرتی تھی۔ بیٹا نجمہ تمہارے ماموں کی عادتیں اچھی نہیں۔ انہیں لڑکی کون دے گا۔ اور جب میں ماں سے ان کی عادتوں کے متعلق پوچھتی تو وہ جھڑک دیتی۔ لیکن یہ زمانہ بھی جلد گذر گیا۔ وہ مجھے ماموں کے سہارے چھوڑ کر جنت سدھار گئیں۔ اور میں تنہا رہ گئی۔

اب گھر کا حلیہ ہی بدل چکا تھا۔ اب میں آزاد تھی۔ اور بالکل آزاد۔ مجھے منع کرنیوالا کوئی نہ تھا۔ آئینہ دیکھنا بالوں کو سنوارنا، برآمدہ میں گھنٹوں کھڑے رہنا اور سڑک پر گذرنے والوں کو تاکنا میرا روز کا معمول تھا۔ یہ میری اٹھتی جوانی کے دن تھے۔ آئینہ کے سامنے جب میں نے پہلی بار اپنے حسین چہرے اور ابھرے ہوئے نارنگی نما سینہ پر نگاہ ڈالی تو شرما سی گئی۔ اور ایسا محسوس کیا کہ میں جوان ہوں۔ لیکن یہ وہم صرف آئینہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ وہ جوان چھوکرے جن کی کمروں میں لوچ۔ اداؤں میں نسوانیت جھلکتی تھی اب میرے ماموں کے ساتھ ہمارے ہاں آنے جانے لگ گئے۔ انکی سڈول پنڈلیاں اور چوڑے چکلے سینے دیکھ کر مجھ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتے اور کچھ آنکھوں سے اشارے بھی کرتے۔ میں انہیں دیکھ کر بھاگ جاتی۔ وہ ان کے ساتھ گھنٹوں بند کمرے میں گپیں ہانکتے۔ شور مچاتے اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ واہی تباہی بکتے۔ یہ سلسلہ بہر دل جاری رہتا جب وہ چلے جاتے تو بستر پر بے شمار سلوٹیں دکھائی دیتیں اور میں ان سلوٹوں کو گھنٹوں دیکھتی رہتی۔ گو میرے لئے وہ سلوٹیں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ تاہم پھر بھی نہ جانے انہیں کیوں معمّہ سا سمجھتی اور سوچتی کہ آخر یہ سلوٹیں کیوں پڑ جاتی ہیں۔ اور یہ بڑے چھوکرے اس طرح کیوں بے تکلف اندر گھس آتے ہیں۔ بھلا شریف گھروں میں کوئی ایسے جوان چھوکرے لے آتا ہے۔ یہ ماموں بھی عجیب

ہیں۔ ذرا بھی غیرت نہیں۔ میں جوان ہوں۔ آخر خیالات بدلتے اور جوانی مچلتے دیر ہی کب لگتی ہے۔ اور یہ جب آتے ہیں۔ تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ انہیں شرم بھی نہیں آتی۔ آخر ایسی آزادی کیوں دے رکھی ہے۔ میں دل ہی دل میں کڑھتی اور ان چھوکروں کو کوسنے سناتی۔

لیکن ان کا کیا قصور ہے۔ ماموں ہی تو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ۔۔۔؟ اماں کی موجودگی میں کیا مجال کہ کوئی یوں گھس آئے۔ ایک دن بھولے سے کہیں تو آیا اور باتوں باتوں میں کہیں مجھے بھوکی بھوکی نظروں سے دیکھ بیٹھا اور اماں کی نگاہ پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اماں بپھر ہی تو گئیں اور وہ کوسنے سنائے کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا اگر ذرا دیر ٹھہر جاتا۔ تو بس جوتیوں سے چٹیا لال ہو جاتی۔ مگر آج یہ بازاری لونڈے شہر کے غنڈے، شہدے۔ باجے گاجے۔

ان میں ایک نہایت ہی شریر طبع تھا سلیم۔ گورا چٹا۔ دبلا پتلا۔ پست قامت وہ اکثر کہتا کہ مجھ سے شادی کر لو لیکن میں منہ چڑا لیتی اور وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتا۔ اگر کہیں ۔۔۔ اکیلی دکیلی سیڑھیوں میں مل جاتی تو وہ مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ پہلے تو مجھے اس سے گھن آتی۔ اور اس کی عینک تلے شوخ نگاہیں میرے دل میں دھڑکن سی پیدا کر دیتیں۔ اور یہی جی چاہتا کہ اس کے ایسا دھکا دوں کہ وہ پکنی کھاتے کھاتے ۔۔۔۔۔۔ سیڑھیوں سے نیچے گر جائے اور میں کھل کھلا کر ہنسوں۔ لیکن جونہی وہ مجھے اس انداز سے چھیڑتا اور گدگداتا کہ میری رگ رگ میں بجلی سی دوڑ جاتی اور اس وقت یہی جی چاہتا کہ یوں ہی گدگداتا رہے اور میں چٹان کی طرح کھڑی رہوں، اس وقت تو مجھے سچ مچ یقین ہو جاتا۔ کہ میں جوان ہوں ۔۔۔ مگر ۔۔۔ آہ یہ سلسلہ بھی قائم نہ رہا۔ اب ماموں کا سہارا بھی ٹوٹ چکا تھا اب [illegible] سب ساتھ چھوٹ گئے۔

بقیہ [illegible]

ناولیں پڑھتی۔ جب ناولوں سے جی اکتا جاتا تو انہیں طاقچہ میں پٹخ ماموں کے کمرے میں دوڑ جاتی۔ ان کا بستر اسی طرح پڑا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اور سلوٹیں اب بھی اسی طرح موجود تھیں۔ یہ ان کی آخری سلوٹیں تھیں مگر ۔۔۔ آہ ماموں اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ اور میں لاوارث ۔۔۔ بے بس!

تنہائی کی راتیں بھی کس قدر بھیانک ہوتی ہیں۔ موسم سرما کی دراز راتیں کروٹیں بدلتے گذر جاتیں۔ رہ رہ کے اس شریر چھوکرے سلیم کا خیال آتا۔ کہ جب مجھے سیڑھیوں میں کھڑے گدگدایا کرتا تھا۔ میں بیتاب ہوتی۔ اور بے بس ہو کر اپنے سینہ کو اپنے ہی ہاتھ سے مسوس کر رہ جاتی جوانی دن سے دن زندگی پُر بار سی محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی ماموں کو کوستی کہ وہ گھر میں چھوکرے کیوں آنے دیتے تھے کبھی اسے کوسنے سناتی۔ جس نے مجھے جوان ہونے کا احساس دلایا۔ اور پھر ماموں کی وفات کے بعد مجھے میرے حال پر چھوڑ گیا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس کی چھیڑ چھاڑ اور مستور لذت کی ابتدا مجھے بھا گئی۔ اور میں اب تکلف کی حدوں کو توڑ کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ انہی خیالات کی گہرائیوں میں گھنٹوں ڈوبی رہتی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میں سیڑھیوں سے اتر رہی ہوں۔ اور وہ اوپر چڑھ رہا ہے۔ جونہی وہ میرے قریب آ گیا۔ میرے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی۔ اس نے یکدم مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اس زور سے بھینچا کہ میری انگیا کی نازک ڈوریاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اور میں مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ لیکن ہوش آنے کے بعد ۔۔۔ میں اور وہی شب تنہائی۔

دو چار زیورات تھے۔ وہ بھی بیچ بیچ کر کھا لئے اور اب فاقوں پر نوبت آ پہنچی۔ پڑوسن رضیہ نے ہزار بار کہا۔ بچو آخر کہاں تک یوں اکیلے چل سکو گی۔ کوئی سہارا ہی ڈھونڈ لو۔ دیکھو [illegible] لیکن پھر بھی خوشحال ہوا [illegible]

سے کھیلتی ہوں۔ آخر استانی کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے پچاس پچپن۔ رشید بھلا کیا چھوڑ کر مرا تھا۔ اس سے تو سال بھی نہ کٹ سکا۔ جوان تھی۔ آخر جوانی میں بھی کوئی بھوکا مرتا ہے۔ تم تو جوان ہو۔ کہو تو سب انسپکٹر سے ملا دوں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کون سب انسپکٹر۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اوں تم کیا جانو گھر سے نکلو تو۔؟ دیکھا یہ ہار یہ وہی تو کل لائے تھے۔ کہو۔ یہ ہار خوبصورت ہے ناں؟

ہاں ہاں۔ ہار بڑا قیمتی ہے رشو۔ میں نے ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر انہوں نے کیسے دیا تمہیں؟

بڑی نادان ہو بجی۔ کیا تم جوان نہیں.....؟

"مطلب؟"

مطلب۔۔ ! عجیب لڑکی ہو تم۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

میں جھینپ سی گئی اور جھنجلا کر بولی۔ تم تو بجھارتیں ڈالتی ہو رشیہ۔ صاف صاف کہو۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی۔

ہاں اب کیسے سمجھو۔ ماموں کے چھوکروں سے کھیل کھیل کر اتنی بڑی ہو گئی اب لگی گھونے میں ڈالنے۔ ہاں ابھی دودھ کے دانت ہیں ناں۔۔۔

یہ کیا کہتی ہو وہ موئے بھلا مجھ سے کیوں کھیلنے لگے موئڈی کا۔ کہیں اچھال چکا سمجھ رکھا ہے مجھے۔۔۔؟

آگ کہتے سنا تو نہیں بہنا۔ لیکن تم سچ مچ آگ لگا رہی ہو۔

وہ کچھ ڈر سی گئی۔ بات بدل کر بولی۔ میرا مطلب یہ تو نہ تھا۔ کہ وہ چھوکرے تمہارے ہی لئے آتے تھے۔

" بھاڑ میں جائیں وہ چھوکرے! اب تو میں فاقوں سے مری جا رہی ہوں۔ کہو اب گذر کیسے ہو گی۔ تمہیں اپنا ہی سمجھ کر تو پوچھ رہی ہوں۔ تم جانتی ہی ہو کہ کون کمانیوالا ہے یہاں۔ آخر مٹی چاٹے۔ جان تو نہیں بچتی۔ مجھے تو ہار بھی دینے والے دے جایا کرتے ہیں۔ اور مجھے ایک وقت کی روٹی بھی کوئی دینے سے رہا۔ اور ادھر کرایہ ادا کرنے کیلئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

تنہا! ابھی کام بن سکتا ہے۔ پگلی سب انسپکٹر ہی موا کہیں رہ گیا ہے۔ یہ مرد عقل کے اندھے۔ پاگل۔ جوانی ہو تو دنیا قدموں پر جھک سکتی ہے۔ تم تو یونہی بڑی بڑی جوانی کھو دو گی۔ پانی بہتا رہے تو گندا نہیں ہوتا۔ طوفان آنے ہی سے کسی ماحول کی فضا صاف ہو سکتی ہے۔ سمجھی۔ مگر یاد رہے جوانی بیچ کر ہی کچھ ملتا ہے تجھے۔

" لیکن کوئی پوچھے بھی جوانی کا بھاؤ؟"

کیا کہتی ہو۔ کبھی کوشش بھی کی۔ تو یہ ہار بھی تمہیں خوبصورت دکھائی دے گا۔ یہ کہکر اس نے اپنے گلے سے ہار اتارا اور میرے گلے میں ڈال دیا۔ رضیہ چلی گئی۔ تو میں نے رضیہ کا دیا ہوا ہار گلے سے اتار کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔ میں یہ ہار نہیں پہنوں گی۔ موا سب انسپکٹر اور پھر گھنٹوں تنہا اس مسئلہ پر سوچتی رہی۔ کاش وہ چھوکرا ہی مل جائے اور اب تو میں ضرور شادی کے لئے مان جاؤنگی۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اور میں تمام کمرے کا جائزہ لینے کے بعد برآمدہ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ نیچے سڑک پر لوگ گذر رہے تھے۔ امیر۔ غریب۔ جوان خوبصورت لیکن کوئی اوپر نظر اٹھا کر نہ دیکھتا کہ کوئی کس تمنا سے ان کو کھڑی تک رہی ہے۔ بجھو جوان حسین و جمیل۔

ایک دن جب میں برآمدے میں کھڑی سڑک پر گذرنے والوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی تو نیچے سیڑھیوں میں آہٹ سی پیدا ہوئی۔ اور ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی آ رہا ہے۔ سمجھی کہ ظالم مکان کا مالک کرایہ لینے آیا ہو گا۔ لیکن کرایہ کے لئے رقم کہاں سے آئے گی یہ خیال آتے ہی کچھ ڈر سی گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اس

وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ شریر چھوکرا سلیم میرے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ کون ہے سلیم! میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اس نے آتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ اور میں سہم کر ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ جھٹ میری جانب بڑھا۔ اور بولا۔ ڈرتی کیوں ہو۔ کہو اب بھی خفا ہو گی مجھ سے۔

میں کچھ جواب نہ دے سکی گویا جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔ عالم بیخودی میں ایسا دکھائی دیا کہ دریا میں سیلاب آیا کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی کنارے پر آ لگی۔ ہوا کے شوخ انداز نے سطح آب پہ لہروں کا جال بچھا دیا۔ ہزاروں سلوٹیں پیدا ہوئیں اور مٹ گئیں بکھیا ہوا کی وہ منحوس سلوٹیں اب بھی نہیں بھولتیں — نہ جانے کیوں ؟ !

"عالمِ نو"

یوسف سرائیلی

حُسنِ ساقی ہے نیا، بادہ نیا، جام نئے
پھر سے دیتی ہے چمک برق کی پیغام نئے
دیکھ سکتا ہے جہاں میں نئے آغاز بہت
ڈھونڈ، ممکن ہو اگر دہر میں انجام نئے
توڑ دیتی ہے خردمند کے عزموں کو شکست
جُراتِ عشق فقط کرتی ہے اقدام نئے
تو جو ساقی ہے تو تقریب گذشتہ سے گزر
منتظر ہیں ترے، کب کے مئے آشام نئے
تنگئے فکر سے ملت کے تمدن کو نکال
اُٹھ کہ باقی ہیں ترقی کے ابھی بام نئے
تو شکاری ہے قضا کا، تری تقدیر ہی راز!
فکر سے، رات کے تاروں میں بچھا دام نئے

"اِنقلاب"

خلیل تنویر

ساغرِ گُل میں چھلکتی تھی مئے لالہ صفت!
دخترِ رز کے ایاغ،
رنگِ لالہ وسمن
محو جلوہ ریزئ فصلِ بہار،
میری دنیا تھی ستاروں سے حسیں
آرزوؤں میں تلاطم سو بسُو،
اور کسی دوشیزۂ مستِ شباب
کی طرح میری اُمنگیں تھیں جواں،
—— پہلو بدلا وقت نے، انگڑائی لی ——
شش جہت میں تیرگی بڑھنے لگی،
رنج و غم کے سائے بھی تاریک تر ہونے لگے،
مطلعِ اُمید پر رقصاں سحابوں کا ہجوم،
تھرتھراتے، ٹمٹماتے سے تمنا کے نجوم،
اور میں
وقفِ آلامِ حیات،
مضطرب، بےچین، افسردہ، حزیں
—— کائناتِ دل میں آیا ایک ایسا انقلاب ——

محمد شبیر

اُردو نثر کی تدریجی ترقی!

جہاں تک موجودہ تحقیقات کا تعلق ہے۔ اُردو کا مولد دکن ہے جس کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ دیر عرصہ تک ادبا کا رجحان اکثر و بیشتر شاعری کی طرف رہا۔ نثر کی طرف ان کی بالکل توجہ نہ تھی۔ بلکہ اردو نثر میں اظہار خیالات کو ذلت اور کمتری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کی توجہ فارسی کی طرف زیادہ تھی جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک اردو کو نثر کا لباس نصیب نہ ہو سکا۔

چونکہ کسی زبان کے مکمل ہونے کیلئے نظم و نثر دونوں کا وجود لابدی ہے۔ اس لئے طبعی طور پر اردو میں بھی نثر کا ظہور لازمی تھا۔ چنانچہ دکن جو اُردو کا مرکز اوّل ہے۔ نثر کے سلسلہ میں وہاں سے صوفیائے کرام نے چند ایک مذہبی رسائل جاری کئے۔ ان حضرات میں خواجہ گیسو دراز اور علم الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی طرز تحریر میں فارسیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اصل میں ان دنوں فارسی کا طوطی بول رہا تھا۔ اور جیسا کہ اردو شاعری میں اکثر و بیشتر فارسی کا اتباع کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اردو نثر بھی فارسی نثر کے نقش قدم پر چلنے لگی۔ ہندوستان میں فارسی نثر نگاری کے لئے ظہوری اور بیدل بہت مشہور تھے۔ ان کی طرز تحریر کو معیاری تصور کیا جاتا تھا چنانچہ انہی کی طرز جو مقفیٰ اور مسجع تھی۔ اردو میں بھی رائج ہونے لگی!

اُردو میں باقاعدہ نثر کی ابتداء کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سہرا فضلی کے سر ہے۔ فضلی اردو نثر کے باوا آدم ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فارسی کی ایک مشہور کتاب روضۃ الشہداء کا ترجمہ دہ مجلس کے نام سے شائع کیا یہ ہرچند اس کتاب کو عام فہم زبان اور ایک جدید طرز میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کے سامنے اس کا کوئی نمونہ نہ تھا جس کا اعتراف خود انہوں نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ لہذا وہ خود ہی اس کے مخترع ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ کہ زبان سلیس، سادہ اور عام بول چال کے مطابق ہو تاہم ظہوری اور بیدل کا رنگ نمایاں ہے۔ عبارت رنگین مقفیٰ اور مسجع ہے۔

اردو نثر میں دوسری کتاب نو طرز مرصع کا نام سننے میں آتا ہے۔ جسے میر محمد عطا حسین تحسین نے امیر خسرو کی کتاب چہار درویش سے ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی عبارت بھی اس عہد کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ عبارت بیحد رنگین اور فقرات میں وزن اور قافیہ کا التزام پایا جاتا ہے۔ مغلق اور پیچیدہ گوئی مترجم کا شعار ہے۔ تمام کتاب عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ سے مملو ہے۔

میر و سودا کا زمانہ اُردو شاعری کا سنہری زمانہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک اُردو نثر کا تعلق ہے ان کا زمانہ بھی بدستور ملّا ظہوری اور بیدل کا پرتو پیش کرتا ہے چنانچہ سودا کے کلیات کے شروع میں اردو نثر کا جو نمونہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اس میں قافیوں کے التزام میں مطلب فوت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ترتیب بالکل نہیں صرف و نحو کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ فقرات رنگین اور تشبیہ و استعاروں کی بھرمار ہے اور بقول مولانا آزاد" معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُردو نثر اس عہد میں اس بچے کی مانند ہے جس نے نیا نیا چلنا سیکھا ہے۔ جو کبھی اٹھتا ہے

اور کبھی پھر گر پڑتا ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر مقامات پر پورے پورے فقرات فارسی کے ہیں۔

مرزا قتیل اور سید انشاء کی دریائے لطافت اگرچہ فارسی میں ہے لیکن ضمنی طور پر اس میں مختلف اہل حرفہ کی بولیاں اور ان کے رسم و رواج کا ذکر اردو میں ہے دلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو باتیں مابہ الامتیاز ہیں ان کا ذکر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ ہنسی مذاق کی باتیں ہیں۔ طرز تحریر دلچسپ اور عام فہم ہے۔

اُردو نثر کی ترویج کے سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے اردو نثر نگاری باقاعدہ شروع ہوتی ہے۔ اور پھر ایک انوکھی آن بان کے ساتھ، یہ انگریزی عملداری کا صدقہ تھا۔ اور اس کا سہرا ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے سر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انگریزوں نے سوچا کہ ہم نے اسی ملک میں حکومت کرنا ہے اور کسی ملک پر اس وقت تک کامیابی کے ساتھ حکومت نہیں کی جا سکتی جب تک اُس کو باشندوں کی خُو بُو اور ان کے تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور مذہب سے واقفیت حاصل نہ کی جائے۔ اور ان تمام سے پورے طور پر واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس ملک کی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز حکام کے لئے اردو دان ہونا لازمی ٹھہرا۔ اور فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اردو سے ایک والہانہ شیفتگی رکھتے تھے۔ اس کے افسر اعلےٰ مقرر ہوئے۔

کسی تعلیمی ادارے کے لئے نصاب تعلیم کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ اس کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ہندوستان کے اُن مقامات کا دورہ کیا۔ جہاں فصیح اُردو بولی جاتی تھی۔ یا جہاں کی اردو سند مانی جاتی تھی۔ انہوں نے خود اس زبان کو سیکھا۔ اور دوران سفر میں اُدبا اور نثاروں کی ایک جماعت فراہم کی جن میں میر امن دہلوی، میر بہادر علی حسینی۔ حیدر بخش حیدری مرزا کاظم علی جوان، للو لال جی منظر علی خان ولاؔ اور میر شیر علی افسوس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے بہت سا لٹریچر کالج مذکور کے لئے تیار کیا۔ اس کالج کی خدمات اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اور تاریخ ادب اردو کا یہ باب ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہیں سے اُردو نثر نگاری میں اصلیت اور سادگی کے عناصر داخل ہوئے۔ رنگین۔ مقفےٰ اور مسجع عبارت جو قبل ازیں قابلیت اور ہمہ دانی کا معیار تھی۔ اب بتدریج متروک ہونے لگی۔

میرامن نے نو طرز مرصع، کا ترجمہ سلیس اردو میں 'باغ و بہار' کے نام سے کیا اس کی زبان بے حد شیریں اور فصیح ہے۔ اصل میں میر امن کو بقول سرسیدؔ اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے۔ جو میر تقی میر کو غزل میں۔ ان کی نثر اپنے اندر ایک انوکھی سج دھج رکھتی ہے۔ میر شیر علی افسوس نے آرائش محفل لکھی لیکن زبان قدرے مشکل اور پرانا رنگ نمایاں ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا ترجمہ پیش کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے قصہ لیلیٰ مجنوں طوطا کہانی اور آرائش محفل لکھی۔ ان کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ علاوہ ازیں دیگر نثاروں نے بہت سی کتابیں مثلاً قصہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی، شکنتلا، ناٹک، سنگھاسن بتیسی بتیال پچیسی اور ان کے علاوہ اردو صرف و نحو کی چند کتابیں لکھیں۔

دِلی اور لکھنؤ بھی نثر کی ابتداء کے سلسلہ میں فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ دِلی میں علماء نے اس کی طرف توجہ کی چنانچہ شاہ رفیع الدین صاحب نے قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ان کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن

شریف کا ترجمہ اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے شایع کی۔ ان کی زبان سلیس اور با محاورہ ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ نے بھی متعدد مذہبی رسائل تصنیف کئے۔ جن میں تقویت الایمان، رسالہ توحید اور صراط مستقیم خاص طور پر زیادہ مشہور رہیں۔ ان کی زبان سلجھی ہوئی اور با محاورہ ہے۔

لکھنؤ میں رجب علی بیگ سرور اور فقیر محمد گویا دونوں اپنے اپنے رنگ میں یکتا ہیں۔ نواب فقیر محمد گویا نے انوار سہیلی کا پہلا اردو ترجمہ بستان حکمت کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کی زبان نہ تو مقفیٰ اور مسجع ہے اور نہ ہی اتنی رنگین مگر بایں ہمہ اسے سلیس بھی نہیں کہا جا سکتا عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ بکثرت ہیں۔ جس کی وجہ سے بسا اوقات عبارت گنجلک ہو جاتی ہے۔ بہر حال اپنے وقت میں اسے لوگوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔

مرزا رجب علی بیگ سرور کی معرکۃ الآراء تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ اور یہیں سے اردو نثر میں ناول اور افسانہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک معمولی حسن و عشق کی داستان ہے۔ اور واقعات بھی چنداں انوکھے نہیں زبان بے حد پیچیدہ اور رنگین ہے۔ کم و بیش تمام فقرات مقفیٰ اور مسجع عبارت میں ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سرور کے زور بیان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی دوسری تصانیف سرور سلطانی، شرر عشق، شگوفہ محبت اور شبستان سرور ہیں۔ لیکن ان سب کی زبان بھی وہی ہے جو فسانۂ عجائب کی ہے۔

مرزا غالب نے جہاں قلمرو شاعری میں ایک خاص جدت اور طباعی کا ثبوت دیا۔ اور ایک محدود حلقے کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک وسیع میدان صاف کیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو نثر میں بھی انہوں نے اپنی طبعی جدت کو بروئے کار لاکر ایک نئی راہ نکالی۔ مانا کہ وہ خود بھی کبھی کبھی رنگین، مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنے کے عادی تھے۔ لیکن بالآخر یہ طریقہ چھوڑ کر ایک نئی طرز کی طرح ڈالی آپ کی نثر میں آورد کا عمل دخل بالکل نہیں۔ سلاست و روانی کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی زبان با محاورہ اور عام فہم ہے تاہم اس میں مبتذل الفاظ کو بار نہیں ملتا۔ مرزا کے خطوط آج تک قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ اپنے اس کارنامے کی وجہ سے اردو نثر کے مصلح اول کہے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے وہ پرانا، درفرسودہ طریق جو سراسر تکلف اور تصنع سے پر تھا چھوڑ کر اصلیت اور سادگی کا نمونہ پیش کیا۔ نثر نگاری کا پرانا طریقہ اب لوگوں کو برا معلوم ہونے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیندہ کے لئے انہی سے بلتی جلتی طرز نے ادباء کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ان کی نثر کی بہار عود ہندی۔ اور اردوئے معلیٰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں تیغ تیز، نامۂ غالب اور لطائف غیبی یہ رسائل بھی انکی یادگار ہیں۔

چھاپہ خانہ کا معرض وجود میں آنا بھی اردو کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ بہت سی کتابیں جو اب تک گوشۂ گمنامی میں تھیں طبع ہونے لگیں۔ ۱۸۳۶ء میں میر محمد باقر صاحب نے دلی سے سب سے پہلا اخبار نکالا۔ انگریزی کتابوں کے تراجم ہونے لگے۔ دلی کالج نے اردو نثر میں بیحد اضافہ کیا۔ پروفیسر رام چندر اور مولانا امام بخش صہبائی کی نگرانی میں بہت سی کتابوں نے اردو کا لباس پہنا۔ منشی نولکشور کے مطبع کی خدمات کو کون نہیں جانتا۔ پرانی اور نئی صدہا کتابیں آپ کے یہاں سے شایع ہوئیں۔ انگریزی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ اخبارات اور رسائل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۸۳۲ء میں دفاتر کی زبان فارسی کی بجائے اردو مقرر ہوئی۔

مغربی اثرات نے جہاں ہماری تہذیب و تمدن، رسم و رواج نشست و برخاست اور لین دین میں ہلچل پیدا کی اس کے ساتھ ہی ہماری زبان میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

لوگ کاروباری زبان کو زیادہ پسند کرنے لگے۔ نمود و نمائش تکلف و تصنع۔ رنگینی و مشکل پسندی اور تشبیہہ و استعاروں کی پیچیدگیاں موقوف ہوئیں اور ان کی جگہ سلاست، روانی سادگی اور بے تکلفی نے لے لی۔ فوق الفطرت باتیں مذاق بے دستور کی جانے لگیں۔ چنانچہ دلی میں سر سید اور ان کے رفقا کار کی تصنیف اس کا بین ثبوت ہیں!

مرزا غالب نے اردو نثر میں جہاں ایک جدید طرز کی طرح ڈالی تھی۔ سر سید نے اس طرز کو بام ثریا پر پہنچا دیا۔ آثار الصنادید آپ کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جلاء القلوب، تحفۂ حسن، کلمۃ الحق، راہ سنت وغیرہ بھی بہت مشہور ہیں نثر نگاروں میں سر سید کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے یہاں زور بیان کے ساتھ ساتھ صفائی اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے وہ اپنے خیالات و مضامین کے اظہار کے لئے عام فہم اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رنگینی، تکلف اور بناوٹ کا عمل دخل نہیں۔ مولانا حالی انہیں اردو نثر کا مورث اعلےٰ قرار دیتے ہیں وہ مشکل سے مشکل مضامین کو اپنی خاص طرز سے سادہ اور عام فہم بنا دیتے ہیں۔ ان کے رفقائے کار بھی قریب قریب انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ اپنی طرز کے موجد ہیں اور خود ہی خاتم ہیں۔ بہتیروں نے کوشش کی کہ آپ کے انداز بیان کا چربہ اتاریں۔ لیکن یہ ایک بھونڈی نقالی ثابت ہوئی۔ آپ کی نثر میں جادو معلوم ہوتا ہے جو قلوب کو تسخیر کر لیتا ہے۔ آپ کی زبان نہ تو پھیکی سیٹھی اور نہ ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ بلکہ اس میں برمحل تشبیہہ و استعاروں کے ساتھ ساتھ زور بیان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان کے یہاں مغلق اور عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ کا دخل بہت کم ہے۔ وہ تکلف تصنع کو ناپسند کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے یہاں واقعیت اور سادگی غیر تو شکر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے اردو میں ایک پاکیزہ لٹریچر پیش کیا ہے۔ تنقیدی مضامین کی ابتدا بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ مولانا شبلی نے آپکو خدائے اردو قرار دیا ہے۔ آپ کی تصانیف بیحد ہیں لیکن آب حیات، نیرنگ خیال اور دربار اکبری تو جواہرات سے تولنے کے لائق ہیں۔ علاوہ ازیں اسکول کے بچوں کے لئے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جو نہایت سادہ سلیس، روزمرہ اور بامحاورہ زبان میں ہیں۔ جن کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کی عبارت سے اگر ایک لفظ نکال کر اس کے بجائے کوئی دوسرا رکھنا چاہیں۔ تو نہیں رکھ سکتا اور غالباً یہ بات ایک ادیب کے انتہائی کمال پر دلالت کرتی ہے۔

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی بھی اپنے رنگ میں یکتا ہیں۔ ان کی تصانیف اگرچہ بہت زیادہ ہیں لیکن مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید اور حیات سعدی تو اپنی نوعیت کے لحاظ سے آج تک خاص و عام میں انتہائی قبولیت اور شہرت رکھتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائیگا۔ آپ کی کتابوں کو زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ یہ سچ ہے۔ کہ آپ کی نثر میں مولانا آزاد کی سی رنگینی اور شوخی نہیں اور نہ ہی ڈپٹی نذیر احمد جیسا ظرافت کا چٹخارہ تاہم سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ زوردار ہے۔ وہ اپنے مطلب کو مانگل آسان پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں پیچیدگی اور صنائع بدائع کی بھول بھلیاں نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے اخلاقی ناولوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ابن الوقت، توبتہ النصوح، مرآۃ العروس وغیرہ بہت زیادہ مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے مذہبی لٹریچر کی صورت میں امہات الامہ ترجمۂ قرآن اور مطالب القرآن پیش کیں۔ آپ عربی۔ فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں غیر مانوس الفاظ آجاتے ہیں۔ ورنہ عموماً ان کی عبارت سادہ اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں ظرافت کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور گاہے گاہے انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کر جاتے ہیں۔

اردو دُنیا مولانا شبلی نعمانی کے احسانات سے کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ آپ نے تاریخی لٹریچر پیش کر کے اردو نثر کو گراں مایہ کر دیا ہے بحیثیت مؤرخ آپ کا رتبہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اعلےٰ و ارفع ہے آپ نے تاریخ و فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھا اور اسی معیار کے مطابق اپنے تبحرِ علمی کو الفاروق، المامون، الغزالی اور سیرت نعمان کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ علاوہ ازیں آپ کے یہاں تنقیدی لٹریچر شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی صورت میں موجود ہے اگرچہ آپ کی تحریر میں مولانا آزاد کی سی چاشنی نہیں تاہم اس میں ایک خاص کشش ہے۔ وہ سادگی اور صفائی کے قائل ہیں اور اپنے اظہارِ مطالب کے لئے حسبِ حال اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں۔ نمود و نمائش، تکلف و بناوٹ کو ان کے یہاں بار نہیں۔

علاوہ بریں انجمن ترقی اردو اور دار المصنفین اعظم گڑھ کی بدولت آپ زر سے لکھی جائیں گی۔ ان دونوں اداروں نے سینکڑوں کتابیں چھاپ دی ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مولانا عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو بہترین ناقد ہیں آپ نے اردو میں تنقید کا صحیح مذاق پیش کیا ہے۔ آپ کی طرزِ تحریر سادہ اور پُر از مطلب ہے۔ زبان کو جس قدرت کے ساتھ آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

سید سلیمان ندوی کی تصانیف بھی اردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہیں۔ خصوصاً شعر الہند، سیرت صحابیات، سیرت عائشہؓ اور سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ آپ شبلی کے جانشین ہیں۔ مولانا سید علی بلگرامی تمدن ہند اور تمدن عرب کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر ایک بے بدل ادیب ہیں۔ انہوں نے رسالہ مخزن کا اجرا کیا اور اپنی تمام عمر اردو کو مالامال کرنے میں بسر کی۔ آپ کی تحریر میں ایک خاص دلکشی ہے۔ اسلوب بیان ہموار اور دلنشین ہے۔ آپ کے مضامین [illegible] ہیں۔ [illegible] سلف بیکر سرایک رنگ میں موجود ہیں۔

خمخانۂ جاوید لالہ سری رام ایم۔ اے کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو شاعری اور شاعروں کے متعلق اپنے رنگ میں جامع و مانع ہے۔ طرزِ تحریر میں سلاست اور محاورہ بندی [illegible] کتنے ہی ہیں علاوہ ازیں احسن مارہروی، رشید احمد صدیقی، حامد اللہ افسر، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم بلند پایہ ادیب ہیں جن کی تصانیف اور مضامین سے اردو کا دامن پُر ہے اور پھر اب تو ادبا کی تعداد اتنی کثیر ہو چکی ہے کہ ان کا شمار ناممکن ہے ملک کے اطراف و جوانب سے اخبارات اور رسائل کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا ہے جس میں ہر رنگ موجود ہے اور مغربی اثرات تمام دکمال نظر آتے ہیں زندگی کے [illegible] واقعات، جذبات کا من و عن [illegible] سیاسیات، اقتصادیات اور مذہب سبھی کچھ موجود ہے۔ [illegible] کو اگر لیں اور پھر اس میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل کا شمار کریں تو حیرت ہوتی ہے لیکن افسوس [illegible] کچھ [illegible] اور بعض تعصب [illegible] بعض حضرات [illegible] اور دار [illegible] اور اپنی علمیت [illegible] کے لئے عربی [illegible] نامانوس الفاظ [illegible] جا رہے ہیں [illegible] احتیاج [illegible] جدید [illegible] سکی [illegible] قسم کے [illegible] الفاظ [illegible] نامانوس [illegible] ثقیل ہیں [illegible] سکتے ہیں اور نہ ہی [illegible] عیب پیدا ہو سکتا ہے بلکہ تحریر [illegible] پیچیدہ [illegible] پڑھنے والا [illegible] لگتا ہے اسی طرح بعض افراد [illegible] تنگ نظری کو بروئے کار لا کر سندی وسنسکرت کے ثقیل اور بوجھل الفاظ سے زبان کو ناقابل فہم بنا رہے ہیں۔ مثلاً آدرش، آدرشیہ، آدرش، نوید ان، دشتے، کنتو، پرنتو، پردھان [illegible] سادھارن، [illegible] اسی قسم کے سینکڑوں الفاظ جو کبھی نہ [illegible] آئے تھے اب بے تکلف اخبارات یا دیگر لٹریچر میں موجود ہیں یہ زبان کے ساتھ کھلی دشمنی ہے۔ اگر آپ اپنی تحریر و بیان یا تقریر [illegible] زبان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ [illegible] مشکل اور ناقابل فہم الفاظ کا استعمال کر کے اسے ایک معمہ یا پہیلی بنا دیں جہاں تک ہو سکے اسے سادہ اور آسان بنانے کی کوشش کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے بہرہ ور ہو سکیں اور یہ ایک عالمگیر شہرت حاصل کرے۔

تشنۂ تکمیل

صفحہ ۱۶ سے آگے

تو بیٹھ نہیں سکتے ٹکڑیوں کا ایک ٹھٹھا بھی آسانی سے چیر سکو گے میں کوشش کروں گا کہ کسی اچھی جگہ تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ لیکن جو شخص اپنا راستہ منقطع کر چکا ہو اسے کون بھٹکا سکتا ہے نہ معلوم انہوں نے ماموں کو کیا کہا۔ بہر کیف میں اس دن ان کے پاس ہی رہا۔ انہوں نے خوب کھلایا پلایا۔ جال کے پیچھے دانے بکھیرے گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا جادو میرے سر چڑھ گیا لیکن دوسرے دن خدا جانے انہیں کتنی خفت اٹھانا پڑی ہوگی جس قدر جلد جادو چڑھا تھا اتنی ہی جلد اتر بھی گیا۔ میں قصبہ سے رخصت ہو چکا تھا۔ کچھ نہ پوچھئے کہ دس سال جو باہر گذارے گئے میرے لئے کس قدر قیمتی ہیں۔ عملی زندگی کے تلخ حقائق نے مجھے دریا کا وہ پتھر بنا دیا ہے جسے پانی کے تھپیڑوں اور چٹانوں کی ٹھوکروں نے گول بنا دیا ہو۔ میں نے معمولی مزدور سے اپنی کتاب زندگی کا نیا باب کھولا۔ ایک پنجابی ٹھیکیدار کی خدمت نے مجھے تین سال کے بعد میٹ بنا دیا۔ اس ٹھیکیدار کو میں اپنی سرگذشت سنا چکا تھا۔ اس نے نہ صرف میری ترقی میں دلچسپی لی بلکہ شب کے خالی وقت میں پڑھنا لکھنا بھی سکھا دیا۔ مزدور کی حیثیت میں مجھے بارہا اس زندگی کا تجربہ ہوا جو انسانوں سے حیوانوں کے کام کراتی ہے۔ جو انسانوں کی قدر و قیمت پرکاہ سے زیادہ نہیں سمجھتی۔ خیال تو فرمایئے کہ دیودار کا ایک درخت جس کا گھیرا چالیس فٹ سے کم نہ ہوگا گرایا جا رہا تھا۔ جڑ کے قریب کا تنہ کٹ چکا تھا۔ بڑے بڑے اور موٹے موٹے رسّے درخت کے گردوں سے بندھے ہوئے تھے جنہیں مزدور کھینچ رہے تھے تاکہ درخت اسی طرف گرے جس سمت اسے گرایا جا رہا تھا۔ لیکن قضا و قدر کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے۔ مشیت کچھ اور فیصلہ کر چکی تھی۔ زور کا دھماکا ہوتا ہے اور درخت مخالف سمت میں اس حالت میں گرتا ہے کہ رسّہ پکڑے ہوئے مزدوروں کو چالیس چالیس فٹ اونچا اچھال دیتا ہے اور ارد گرد کی چٹانوں پر اڑتے ہوئے شاخوں، ٹہنیوں اور پتوں کے ساتھ بکھیر دیتا ہے صرف چند لمحات میں چار انسان پیٹ کی آگ بجھاتے بجھاتے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ بیس آدمی چند ماہ کے لئے بستر پکڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور آٹھ دس ہمیشہ کے لئے لنگڑے لولے بن جاتے ہیں اور پھر ان مقہور انسانوں کے لئے نہ پنشن ہے نہ الاؤنس۔ چند دن جنگل کی فضا میں موت کی ہیبت پھیل جاتی ہے اور اس کے بعد پھر دوسرا درخت دوسرے آدمی گرانا شروع کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی مزدور کا ڈھلوان پہاڑی سے پیر پھسلتا ہے اور وہ اس پتھر کی طرح جسے پہاڑ کی تکونی چوٹی سے نیچے پھینک دیا جائے وزنی شہتیر کے نیچے دبا ہوا لڑھکتا ہوا نیچے پہاڑی نالے میں اس شان سے پہنچتا ہے کہ اعضا جدا جدا ہو چکے ہوتے ہیں۔ گردن کا منکا ڈھلک چکا ہوتا ہے اور راستے کی رگڑ نے نعش کا حلیہ بگاڑ دیا ہوتا ہے۔ کمپنی کے ٹھیکیدار زیادہ سے زیادہ ہمدردی یہ کرتے ہیں کہ کفن کے لئے چند گز کھدر بلا قیمت دے دیتے ہیں۔ بسا اوقات حریص اور شائیلاک ٹائپ ٹھیکیدار کفن کی قیمت بھی مرحوم مزدور کے حساب میں درج کر لیتے ہیں کیا انسانی تہذیب ترقی کر چکی ہے؟ کیا انسان قدرت پر فتح پا رہا ہے؟ کیا مادی ترقیوں نے جہنم کو بہشت بنا دیا؟ ان سوالات کے جواب شہروں کی ہما ہمی میں نہیں بلکہ ان پہاڑی جنگلوں کی چند انچ چوڑی پگڈنڈیوں پر مل سکیں گے جہاں شہری انسان قدم بھر نہیں چل سکتے چہ جائیکہ وزنی شہتیر لے کر ان خون آشام راستوں پر چل سکیں۔

مزدور کی حیثیت میں تجربہ نے مجھے سکھایا کہ مزدور بھیڑوں کے گلے ہیں جنہیں چرواہا جدھر چاہتا ہے ہانک دیتا ہے کمپنی کی مقررہ اجرت مزدور کو نہیں ملتی۔ اگر فی سلیپر ڈھلان چار آنے مقرر ہے تو مزدور کو ڈھائی آنے سے زیادہ نہیں ملتے کچھ کمیشن ٹھیکیدار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کچھ میٹ اینٹھ لیتا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ حساب کی پیچیدگیوں میں دس فیصدی مزدوری اور بھی مار لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگلات کے چران ڈھلان کے مزدور پو پھٹنے سے لیکر رات گئے تک کام کرتے ہیں لیکن بڑی بڑی کلہاڑیوں سے زخمی ہونے کے باوجود درختوں سے اور درختوں کے ساتھ

گننے کے باوجود وہ ہمیشہ مقروض رہتے ہیں۔

سادگی، شرافت اور ایمانداری کا نام سادہ لوحی ہے۔ جو مزدور حساب نہیں جانتے جو اپنے ٹھیکیداروں سے لڑتے جھگڑتے نہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ جو زیادہ باتیں کرنا جانتے ہیں۔ منشیوں اور میٹوں سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ اپنی گانٹھ کے پکے ہوتے ہیں۔ انہیں نہ حساب کی بھول بھلیاں ستاتی ہیں، اور نہ ان کی اُجرت ہی ماری جاتی ہے۔ کاش یہ لوگ متحد ہوتے کاش ان کی محنت کے مطابق انہیں اجرت دی جاتی۔ غربت اور جہالت کی چکی انہیں پیس رہی ہے۔

میں نے اپنا کام دیانتداری سے کیا اور اپنا حق بلند آواز سے مانگا پھر پنجابی ٹھیکیدار میری پشت پر تھا۔ سال بھر میں کھا پی کر دو سو روپے میرے پاس جمع ہو گئے۔ بہت سے مزدوروں سے جان پہچان ہو چکی تھی۔ مقدور بھر کوشش کرتا تھا۔ کہ اپنے بھائیوں کے کام آؤں۔ ان کے دُکھ درد میں شامل ہو سکوں۔ اور ان پر جب مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں تو سینہ سپر ہو جاؤں۔ دوسرے سال ہی میرے ساتھیوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا میٹ بن جاؤں۔ لیکن ایک تو لکھنا پڑھنا بخوبی نہ آتا تھا دوسرے میٹ بن جانے کے لئے ضروری تھا۔ کہ ٹھیکیداروں کے ہتھکنڈوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ ٹھیکیدار میٹ کے گرد اپنا جال پھیلاتے ہیں۔ اور میٹ مزدوروں کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔ میں چاہتا تھا۔ کہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو۔ ٹھیکیدار اور میٹ کا حساب صاف رہنا چاہیئے۔ حساب کی صفائی بھی اس درجہ ضروری نہیں۔ جسقدر نیت کی صفائی چاہیئے۔ میرا پنجابی ٹھیکیدار یُوں تو اچھا آدمی تھا۔ لیکن اس کی ناک کا بال اُس کا راجپوت منشی تھا۔ جو عقل سے کم اور لاٹھی سے زیادہ کام لیتا تھا۔ جس آسامی نے حساب میں یا ادائیگی میں دیر کی تو میاں صاحب کی لاٹھی حرکت میں آجاتی تھی۔ تیسرے سال مجھے اس درجہ تجربہ ہو چکا تھا۔ کہ میں میٹ بن سکوں۔ ہمدرد پنجابی ٹھیکیدار نے سفارش کی اور میں مشہور ٹھیکیدار رسیلا رام کا میٹ بن گیا۔ چھ سال تک میٹ کا کام کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ مزدور جس قدر میرے تحت کام کرنا پسند کرتے تھے اس قدر کسی دوسرے میٹ سے خوش نہ تھے۔ حساب صاف۔ پائی کا پھیر نہیں۔ وقت پر پیسے۔ راشن کا مکمل انتظام چھ سال کے بعد کھا پی کر دو اڑھائی ہزار روپے جمع ہو چکے تھے معیارِ زندگی بلند ہو چکا تھا۔ اپنے پرایوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ حالات نے مجھے بنایا۔ خورشید نے روح پھونکی۔ ذہنی مشقت پسندی اور راستگوئی نے سہارا دیا۔ پنجابی ٹھیکیدار نے علم کی مشعل روشن کی۔ مزدوروں نے اپنا میٹ چنا اور آخر میں کمپنی نے ٹھیکیدار بنا دیا۔ لوگ ٹھیکیدار بنتے ہیں لیکن میں بنایا گیا۔ بھئی انگریز خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ مردم شناس ضرور ہیں۔ جس کمپنی میں میں کام کرتا تھا۔ اس کا انگریز مینجر مسٹر ایلیٹ میرے کام سے واقف تھا۔ جب کبھی گھومتا گھامتا میری طرف آنکلتا۔ مجھے ضرور کچھ نہ کچھ کہتا کبھی کہتا "ہیلو حامد۔ تم خوب کام جانتا۔ یورپ میں ہوتا بڑا آدمی بنتا۔ ہم بھی کام مانگتا"۔

اسی مینجر کی سفارش کا نتیجہ ہے کہ کمپنی نے مجھے ٹھیکہ دیدیا نہ معاہدہ۔ نہ ٹنڈر۔ پانچ ہزار روپے بغیر کسی ضمانت کے پیشگی مل گئے موجودہ حالت آپ جانتے ہی ہیں کہ کیا ہے۔ اب زیادہ تر حساب کتاب کا کام رہتا ہے۔ دو تین سو مزدور روزانہ میرے ٹھیکے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ کا فضل شامل حال ہے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں"۔

یہ کہکر حامد سانس لینے کو رُکا۔ دُور مشرق میں چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھا۔ اور پھر زمین پر پڑے ہوئے تنکے کو اٹھا کر دانت کُریدنے لگا۔

میں نے اس کے افسانے کو کامل سکوت کے ساتھ سُنا اور جب وہ آخر میں دانت کُریدنے لگا۔ تو میں نے کہا "آپ نے خورشید کے متعلق نہیں بتایا کہ پانچ روپے دینے کے بعد وہ پھر بھی کبھی آپ سے ملی تھی کہ نہیں؟"

"ہاں معاف کیجئے" حامد نے تنکے کو پرے پھینکتے ہوئے کہا "میں تو بھول ہی گیا۔ بات یہ ہے کہ مصروفیت دل کی پکار پر کان دھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں دل کے درماں کے لئے رات وقف تھی۔ نہ معلوم کتنی راتیں حسین تصورات میں بیت چکی ہیں۔ دو ایکبار اس سے مل چکا ہوں۔ ہر ملاقات نے ہمیں قریب تر کر دیا ہے اس کی خانہ زاد بہن واسطہ ہے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے۔ خورشید میں اگر کوئی عیب ہے تو یہ ہے کہ اب جبکہ میں تحفے پیش کرنے کے قابل بن چکا ہوں۔ وہ تحائف قبول نہیں کرتی۔ بڑی مشکل سے سونے کا ایک تعویذ قبول کیا ہے۔ جو اس کے بازو پر بندھا رہتا ہے۔ اس کا قرض یعنی دہی پانچ روپے بمعہ سود ادا کرنے کی کوشش کی۔ مگر بہ سود۔ یہی کہا جاتا ہے کہ وقت پر وصول کیا جائیگا۔ اس کے والد سے اچھے تعلقات ہیں۔ ان کی روپے پیسے سے بھی مدد کرتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خورشید کی نسبت کسی دوسری جگہ نہ کر سکے۔ ورنہ خورشید غریب کا انکار کب تک چلتا۔ وہ یقیناً مجھے اپنی دامادی کا شرف بخشیں گے۔ لیکن وہ ذرا زن مرید واقع ہوئے ہیں اپنی اہلیہ کو ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک ان کی اہلیہ محترمہ کا تعلق ہے عجیب کینڈے کی عورت ہے۔ اس کی "نہیں" نے مجھے اور خورشید کو ناہدانہ زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ میرا نیا مکان یوں خالی خالی نہ رہتا۔

میرے ماموں ممانی خدا رکھے ان کی دعائیں میرے لئے وقف ہیں۔ ممانی جان بچپن میں پانی پی پی کر جس قدر کوسنے مجھے اور میرے والدین کو دیا کرتی تھیں۔ وہ قصیدوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میرے والد مرحوم فرشتہ قرار دیئے جا چکے ہیں۔ اور والدہ مرحومہ جنتی۔ پرسوں ہی کی بات ہے کہ ممانی جان سے خورشید کی والدہ کی بات چیت ہوئی۔ جب میری ذات میں کوئی اور نقص نہ نکلا۔ تو مجھے بدصورت قرار دیکر امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ......

شکل و صورت اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ خدا نے ایسی ہی بنا دی تو کیا کروں۔"

"لیکن آپ اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی تو نہیں ہیں" میں نے قطع کلامی کی۔ "جی ہاں! بجا ارشاد ہوا۔ لیکن حیلہ گر را بہانہ بسیار۔ خورشید کی والدہ کا اصولِ انتخاب ہی غلط ہے۔ شادی میں نے ان سے نہیں کرنی ہے کہ وہ مجھے اپنی پسند میں شامل نہ کریں۔ خورشید سے بھی پوچھ لیتیں۔ اگر جواب نفی میں ہوتا تو بھی بات تھی۔ دراصل ذات پات، شکل و صورت کے اعتراضات جہالت کا نتیجہ ہیں۔ خورشید کی والدہ بے شک ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے اور اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کوئی بڑے باپ کا بیٹا اور اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو وہ شریف نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کی کمزوریوں کو میں جانتا ہوں۔ میں نے ابھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اپنی ہونے والی ساس کے بھائی کو اپنے ساتھ گانٹھ لیا ہے۔ وہ وعدہ کر چکے ہیں کہ خواہ کچھ ہو وہ ضرور کامیاب ہونگے۔ بھائی کا بہن پر کتنا اثر ہوتا ہے عنقریب آپ پر ظاہر ہو جائیگا۔ اور..... اس کے بعد حامد کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ کہ ناصر صاحب فاریسٹر آ گئے۔ اور موضوعِ بحث بدل گیا۔

میرے دوست! سنا آپ نے کہ کالے گورے کی تمیز نے دو تڑپتے ہوئے دلوں کو کس درجہ بیقرار کر رکھا ہے۔ ایک میٹھا سپنہ تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حامد اپنی کشتِ تمنا کو ہرا بھرا دیکھ سکے گا۔ گو آپ ایسے رسم رواج کے بندے، نسلی تعصب کے کیڑے اس کے راستے میں مشکلات کے روڑے اٹکائیں گے۔ مگر معاف کیجئے گا جناب! آندھی تنا ور درختوں کو اکھیڑ پھینکتی ہے۔ وقت کا طوفان ان تمام آلائشوں کو بہالے جائے گا۔ جن سے انسانیت کا جسم داغدار ہے۔

ہیں!! کیا، بس چلے۔ اچھا۔ خدا حافظ"

نیا پرانا ادب

صفحہ ۸ سے آگے

اب وہی جذبات نگاری یا جذبات کی تخیلی عکاسی، یہ بھی اتنی بُری چیز نہیں۔ لیکن اس میں ہیجانی کیفیت کا غالب آجانا اور جنسی ناموس اور متانت و حیاداری کا لحاظ نہ رکھنا ایسی بغاوت ہے جو ادبی عصمت اور قوتِ متخیلہ ہی کی قبر نہیں بناتی بلکہ اس کے زہریلے جراثیم سماجی زندگی، خانگی زندگی بلکہ اخلاقی خودکشی تک عامل اور کاری ہوا کرتے ہیں۔

ادب تو رہا ایک طرف،

رچرڈس کہتا ہے :۔

وہ نظمیں جو جوش دلانیوالی ہیں ممکن ہے کہ خراب اور ناقابل التفات ہوں۔ ایک نظم میں اصلی چیز اس کی خاص صفت یعنی کیفیت اور کمیت ہے نہ کہ خشونت اور بغاوت ؛

ورڈزورتھ نے کہا :۔

عذا روح کی گہرائی قبول کرتا ہے۔ اس کی طوفانی کیفیت نہیں۔

ہمیں یہ شک ہوتا ہے کہ آجکل جو خشونت اور جذباتی ہیجان بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب کہیں ہماری رعنانہ جذباتی زندگی میں خاموش مؤثرات سے پیدا ہوئی عُسرت یا نامداری تو نہیں"۔

انگلستان کے ایک ادبی مؤرخ کا قول ہے :۔

"انہی حالات میں (انگریزی) شاعروں کی ایک روز ....

...... افزوں تعداد موجود ہے جو نئی سپرٹ سے ....

...... ہمدردی رکھتے ہوئے بھی گذشتہ عہد کی عظیم الشان روایات کی عزت کرتے ہیں اور انکے دلدادہ ہیں۔ مصنفوں میں والٹر ڈی لا میئر، جان ڈرنک واٹر اور ڈبلیو ایچ ڈیوس جیسے حضرات ہیں۔ جن کا کلام خفا اور حُسن سے شدت کی مختلف مقداروں میں تخلیقی یا وہبی طاقت حاصل کرتا ہے"۔

یہی مصنف بعض جدت پسند حضرات کے متعلق لکھتا ہے :۔

"نئی اسپرٹ کا پتا از نسٹ ڈوسن اور آرتھر سائمنس کے ہاں بھی چلتا ہے لیکن ان کا آرٹ بدیسی ہے"۔ جیسا ہمارے ہاں آرٹ کا حال ہے"۔

رڈیارڈ کپلنگ کے مشرق اور مغرب کے ایک ہوجانیکا یا نہ ہوسکنے کا نہیں اس نے جو کچھ کہا حقیقت اور معقولیت کے خلاف تھا اور ہے، فرانس تو انگلستان کے مغرب یا مشرق میں نہیں۔ بجز بیس تیس میل ہی کا تو فاصلہ درمیان میں ہے مگر دیکھئے کہ ان دونوں ملکوں کے لوگوں کے رہنے سہنے کے طور طریق، اخلاق اور شعار میں کتنا بُعد ہے۔

انگلستان سے ہم نے اور ہم سے انگلستان نے بہت باتیں لی ہیں۔ لیکن ذاتی تشخص اور خودداری گنوا دینا اور قومی غیرت سے ہاتھ دھو بیٹھنا اور بات ہے جو کبھی گوارا نہیں ہوسکتی،

تحریر بہت لمبی ہوگئی، اس شعر پر ختم کرتا ہوں :۔

ہے بحر نیلگوں میں بھی آب اس کی برقرار
خودداری اس قدر تو ہو جتنی گوہر میں ہے

تبصرہ "نئی زندگی" کا سان فرانسسکو نمبر

"نئی زندگی" کا سان فرانسسکو نمبر ہمارے سامنے ہے۔ ادارہ نے تمام سلسلے اس نمبر کو بڑی کوشش و کاہش سے مرتب کیا ہے اور سان فرانسسکو "امن کانفرنس" پر ہر زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ بین الاقوامی تنظیم کی تاریخ ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے، بین الاقوامی مجلس امن سان فرانسسکو کانفرنس کے فیصلے، نیا نظام اور ہندوستان ایسے مسائل ہیں کہ جن پر انتہائی غور و فکر اور بالغ نظری سے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ملک کے دوسرے رسائل کے مقابلہ میں "نئی زندگی" الٰہ آباد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالصتاً سیاسی، اقتصادی اور معاشی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

شری دھنو شری بھگوان



ہیضہ کے واسطے

سُدھا سندھو

تیر بہدف ہے

جس کے چند قطرے ہمراہ پانی استعمال کرنے سے

ہیضہ۔ قے۔ دست۔ کف

کھانسی۔ دمہ۔ جی متلانا۔ جی گھبرانا۔

اور پیٹ کی بیماریوں کو فوراً ہی رفع کرتا ہے!

سُکھ سنچارک کمپنی لمیٹڈ

سکھ سنچارک بلڈنگ سکھ سنچارک پوسٹ آفس متھرا

سول ایجنٹ

میکر و ٹریڈرز ۹ ریلوے روڈ لاہور

ہر دوا فروش کے یہاں ہر جگہ ملے گا

قائم شدہ سنہ ۱۸۹۰ء